اقبالیات (اردو)

جنوری تا مارچ، ۱۹۸۴ء

مدیر:

پروفیسر محمد منور

اقبال اکادمی پاکستان

عنوان	:	اقبالیات (جنوری تا مارچ، ۱۹۸۴ء)
مدیر	:	محمد منور
پبلشرز	:	اقبال اکادمی پاکستان
شہر	:	لاہور
سال	:	۱۹۸۴ء
درجہ بندی (ڈی۔ڈی۔سی)	:	۱۰۵
درجہ بندی (اقبال اکادمی پاکستان)	:	8U1.66V11
صفحات	:	۲۷۲
سائز	:	۵ء۲۴×۵ء۱۴ س م
آئی۔ایس۔ایس۔این	:	۰۰۲۱-۰۷۷۳
موضوعات	:	اقبالیات
	:	فلسفہ
	:	تحقیق

IQBAL CYBER LIBRARY

(www.iqbalcyberlibrary.net)

Iqbal Academy Pakistan

(www.iap.gov.pk)

6th Floor Aiwan-e-Iqbal Complex, Egerton Road, Lahore.

مندرجات

جلد: ۲۴ | اقبالیات: جنوری تا مارچ، ۱۹۸۴ء | شمارہ: ۴

جلد ۲۴   جنوری ۱۹۸۴   بمطابق ربیع الثانی ۱۴۰۴   نمبر ۴

مندرجات

ہمارے قلمی معاونین

جناب سید نور محمد قادری — گجرات

جناب سمیع اللہ قریشی — گورنمنٹ ڈگری کالج ، جھنگ

ڈاکٹر محمد یعقوب مغل — چیئرمین شعبۂ تاریخ مسلم ، سندھ یونیورسٹی ، جام شورو

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن — صدر شعبۂ اردو ، گورنمنٹ کالج ، لاہور

جناب نادر قمرانی — بلوچستان یونیورسٹی ، کوئٹہ

پروفیسر محمد اسلم — شعبۂ تاریخ ، پنجاب یونیورسٹی (نیو کیمپس) لاہور

جناب سعد اللہ کلیم — علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، اسلام آباد

پروفیسر محمد منور — ناظم ، اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور

ڈاکٹر حسن اختر — شعبۂ اردو ، گورنمنٹ کالج ، لاہور

جناب راجہ سلطان مقصود — نذر اسلام روڈ ، گلبرگ ، لاہور

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی — شعبۂ اردو ، اورینٹل کالج ، لاہور

جناب صدیق جاوید — شعبۂ اردو ، گورنمنٹ کالج ، لاہور

جناب افضل حق قرشی — شعبۂ لائبریری سائنس ، پنجاب یونیورسٹی (نیو کیمپس) لاہور

جناب مختار جاوید — ۱۰ - سی خالد بن ولید روڈ ، سمن آباد ، لاہور

ڈاکٹر حسن اختر — گورنمنٹ کالج ، لاہور

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی — یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور

علامہ اقبالؒ کی عقیدت صوفیائے عظام سے

سید نور محمد قادری

علامہ اقبالؒ اباًعن جدٍ صوفیائے کرام کے معتقد تھے اور روایات تصوف سے گہری دل چسپی رکھتے تھے ۔ علامہ اقبالؒ کے ایک جد امجد کا ذکر سید نذیر نیازی مرحوم نے ان کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے ۔

''ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا پیر تھے ۔ اُن کا نام تھا شیخ اکبر انہیں پیری اس طرح ملی کہ ''سن کھترا'' (سیالکوٹ) میں سادات کا ایک خاندان تھا جسے لوگ سید نہیں مانتے تھے ۔ اس خاندان کے سربراہ کو ایک روز جو غصہ آیا تو ایک سبز کپڑا اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے ۔ جس کے متعلق روایت تھی کہ حضرت امام حسینؓ کی یادگار ہے ۔ اُس کی برکت سے آگ نے اُن پر کوئی اثر نہ کیا ۔ مخالفوں نے یہ دیکھا تو انہیں یقین ہوگیا کہ فی الواقعہ سید ہیں ۔ اُن کا انتقال ہوا تو شیخ اکبر نے اُن کے مریدوں کو سنبھالا اور خاندان کی خدمت کرنے لگے ۔ ایک مرتبہ اُسی خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ دھسوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے ۔ اُس زمانہ میں معمولی دھسوں کی قیمت دو روپیہ فی دھسہ سے زیادہ نہ تھی ۔ والد ماجد نے کوئی دو چار سو دھسے تیار کیے تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب اچھے داموں فروخت ہو گئے تو کافی روپیہ جمع ہو گیا ۔ بس یہ ابتدا تھی ہمارے دن پھرنے کی''[۱] ۔

۱۔ اقبال کے حضور تالیف سید نذیر نیازی کراچی ۱۹۷۱ء ص ۱۶۹ ، ۱۷۰ ۔

حضرت علامہ کے والد صوفی نور محمدؒ اور وہ خود سلطان العارفین حضرت سلطان محمودؒ دربار آوان شریف (گجرات) سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت[1] تھے۔ صوفی نور محمد صاحب کرامت بزرگ تھے اور جو کوئی بھی اُن سے ملتا اُن کے صوفیانہ مزاج اور اولیاء دوستی سے بہت متاثر ہوتا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں۔

"راقم الحروف کو اُن کے والد ماجد شیخ نور محمد صاحب سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جس زمانہ میں علامہ اقبالؒ انارکلی میں رہتے تھے۔ وہ در حقیقت اسم باسمیٰ تھے۔ نور محمدی اُن کے چہرے پر متجلی تھا . . . . . وہ خدا رسیدہ صوفی تھے! پاکیزہ اسلامی تصوف کا ذوق اقبال کو باپ سے ورثہ میں ملا . . . . . پہلی ہی ملاقات میں شیخ نور محمد صاحب نے اقبال کی پیدائش کا ایک دلچسپ قصہ مجھ سے بیان فرمانے لگے:

"کہ اقبال ابھی ماں کے پیٹ میں تھا کہ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت خوشنما پرندہ سطح زمین سے تھوڑی

۱- (الف) آئینہ اقبال تالیف عبداللہ قریشی لاہور ص، ۲۵۴۔

(ب) مطالعۂ اقبال مرتب گوہر نوشاہی لاہور ص، ۳۶ - ۳۷

(ج) زندہ رود جلد اول تالیف جسٹس جاوید اقبال لاہور، ص ۶۰

(د) دانائے راز تالیف سید نذیر نیازی لاہور، ص ۲۵

(ہ) ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، اپریل ۱۹۷۵ء مضمون سید نور محمد قادری ص، ۴۳ - ۴۶

(و) ماہنامہ آئینہ لاہور، اپریل ۱۹۶۵ء مضمون سردار علی احمد خاں ص، ۴۳ - ۴۴

(ز) "محترمی و مکرمی سید نور محمد قادری صاحب

سلام مسنون۔ یہ بات ہمارے خاندان میں بیشتر کو معلوم ہے کہ حضرت علامہ کے والد حضرت قاضی سلطان محمودؒ کو آوان شریف اُن کی بیعت کے لیے لے گئے تھے

جاوید اقبال ۱۰ مارچ ۱۹۸۰"

بلندی پر اُڑ رہا ہے اور بہت سے لوگ ہاتھ اٹھا کر اور اوچھل کر اُس کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ لیکن وہ کسی کی گرفت میں نہ آیا ۔ میں بھی اُن تماشائیوں میں کھڑا تھا اور خواہش مند تھا کہ غیر معمولی جمال کا یہ پرندہ میرے ہی ہاتھ آ جائے ۔ وہ پرندہ یک بیک میری آغوش میں آ گرا ۔ میں بہت خوش ہوا اور دوسرے منہ تکتے رہ گئے ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے اس خواب کی تعبیر یقا ہوئی کہ پرندہ عالم روحانی میں پیدا ہونے والا بچہ ہے جو صاحب اقبال ہوگا''[1] ۔

خلیفہ عبدالحکیم ایک اور واقعہ حضرت علامہ کی زبانی بیان کرتے ہیں :

''میں نے والدہ کی زبانی سنا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ والد کی موجودگی میں بے چراغ کمرے کے اندر تاریک رات میں عجیب و غریب قسم کا نور ظاہر ہوا ۔ اور تاریک کمرے میں ایسا معلوم ہوا کہ سورج نکل آیا ہے''[2] ۔

حضرت علامہ کے والد اگرچہ معمولی پڑھے لکھے تھے ۔ تصوف سے دل چسپی کی بنا پر اُن کے ہاں ایسے اصحاب کا اکثر اجتماع ہوتا جو صوفیائے کرام سے سچی عقیدت و محبت رکھتے تھے اور مجلس میں صوفیاء کرام کی تصنیفات مثلاً نصوص الحکم اور فتوحات مکیہ وغیرہ پڑھی جاتیں اور اُن پر بحث ہوتی ۔ وہ اہل علم و فضل جو اس مجلس میں شریک ہوتے اُن میں ایک مولوی سید چراغ شاہؒ (راقم الحروف کے حقیقی دادا) بھی تھے جو گجرات سے آ کر کشمیری محلہ سیالکوٹ میں آباد ہو گئے تھے بڑے عالم ، فاضل اور سلسلۂ نقشبندیہ کے صاحب دل بزرگ تھے سید نذیر نیازی شاہ صاحب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

''پھر اقبال نے اگرچہ صرف اتنا کہا ہے کہ اس حلقے میں کتب تصوف کا مطالعہ ہوتا لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ حلقہ کن بزرگوں پر مشتمل

۱۔ فکر اقبال تصنیف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لاہور ، بار اول ۔ ص ، ۱۳ - ۱۵

۲۔ ''آثار اقبال'' مرتب غلام دستگیر حیدر آباد دکن ، طبع دوم ۱۹۴۶ء ، ص ۱۸

تھا ۔ اتنا معلوم ہے کہ ان میں ایک سید چراغ بھی تھے جو گجرات سے ترک وطن کرکے انہیں کے قریب محلہ کشمیریاں میں آباد ہوئے ۔ مولوی غلام مرتضیٰؒ جن کی میر حسنؒ نے بہت تعریف کی ہے کے شاگرد تھے''[1]۔

خوش قسمتی سے نوجوان اقبال کو استاد اور مربی بھی ایسا ملا جو اولیائے کرام کی محبت و عقیدت سے سرشار تھا ۔ عرس ، کرامت اور اولیاء کرام سے نذر و نیاز کا قائل تھا ۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین اپنی گراں مایہ تالیف ''شمس العلماء مولوی سید میر حسن'' میں فرماتے ہیں :

''آپ کے آباؤ اجداد مذہب پرست تھے ۔ سنت نبوی کے زندہ نمونہ تھے ۔ اس لیے آپ بھی اُسی نمونے کے انسان تھے ۔ اللہ والوں کی صحبت میں شریک ہو کر اُن کی اچھی باتوں سے مستفید اور مستفیض ہوا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ بزرگوں کے مزاروں پر جا کر فاتحہ پڑھ کر اُن کے لیے خدا کی بخشش کے طلب گار ہوا کرتے ، وزیر آباد سے چار فرلانگ کے فاصلہ پر ایک سید بزرگ کا مزار تھا ، وہ بزرگ سید مٹھا شاہ کے نام سے مشہور تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ لاہور کے حضرت داتا گنج بخشؒ کے مریدوں میں سے تھے ۔ اُن کے مزار پر بیساکھ میں عرس ہوا کرتا تھا ۔ میر صاحب اس عرس میں شریک ہوتے تھے ۔ وزیر آباد سے تبدیل ہو کر جب سیالکوٹ آئے تو یہاں آ کر بھی اس مزار کو نہیں بھولے اور اپنے دوستوں مولوی امام الدین گجراتی ، مولوی انشاء اللہ اور مولوی مراد علی ساکن بیگوال سے مل کر مشترکہ خرچ سے عرس کے موقع پر پلاؤ کی دیگ پکایا کرتے تھے''[2] ۔

مولانا سید میر حسن کے اپنے عہد کے مشاہیر صوفیائے کرام سے بھی تعلقات تھے ۔ ان بزرگوں میں سید کیسر شاہ[3] ساکن وائیں ضلع گوجرانوالہ بھی تھے۔ سید کیسر شاہ کا ایک دل چسپ واقعہ حضرت علامہ اقبالؒ نے بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عام مولوی اور صوفی

۱۔ دانائے راز تصنیف نذیر نیازی لاہور ۱۹۷۹ء ، ص ۶۰

۲۔ شمس العلما مولوی میر حسن تالیف ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین لاہور ۱۹۸۱ء ، ص ۳۶

۳۔ ایضاً ، ص ، ۱۷۷

کے اندر تبلیغ میں کیا فرق ہے اور صوفی کی بات کیوں زیادہ مؤثر ہوتی ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ حضرت علامہ نے سید میر حسن ہی سے سنا ہو ملاحظہ ہو :

''ہمارے سیالکوٹ کے قریب تحصیل وزیر آباد میں ایک بزرگ کیسر شاہ نام کے رہا کرتے تھے ۔ رندانہ طریق کے ایک صاحب کرامت درویش تھے اور مراقبہ و وحدت الوجود سے انہیں خصوصیت تھی ۔ قرب و جوار کے تمام معززین ان کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے ایک روز کا ذکر ہے کہ دیوان صاحب جو اُن کے معتقد تھے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی سے فارغ ہو کر حضرت کی زیارت کو آئے اور آتے ہی اپنے نام و نمود کا نقشہ اتارنا شروع کیا ۔ وہ بزرگ ان کے اخراجات کی طویل فہرست خموشی سے سن رہے تھے ۔ ایک درویش نے سائیں صاحب کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ حضرت کھانا تیار ہے ، سائیں صاحب نے پوچھا بھائی خشک روٹی ہے کہ ساتھ کوئی سالن بھی ہے ۔ درویش نے عرض کیا حضرت اس وقت سالن موجود نہیں ۔ حضرت نے دیوان صاحب سے فرمایا کہ ذرا بازار سے جا کر ایک مولی تو لے آؤ ۔ اتفاقاً دیوان صاحب کی جیب میں اس وقت کوئی پیسہ موجود نہیں تھا ، ذرا کھسیانے ہوئے اور سائیں صاحب کے سامنے جو چند کوڑیاں رکھی تھیں انہیں دیکھ کر بولے حضرت یہ کوڑیاں دلائیے ۔ میرے پاس اس وقت کچھ نہیں ۔

آپ نے فرمایا : بیٹے کی شادی پر جو تم نے نام و نمود حاصل کیا ہے وہ دے کر ایک مولی لے آؤ ۔ دیوان صاحب مسکرائے اور کہنے لگے :

بھلا حضرت نام و نمود کے عوض بھی کوئی کھانے پینے کی چیز ہاتھ آ سکتی ہے ! سائیں صاحب نے اپنے معمولی ظریفانہ طریق میں کہا کہ بھائی جس نام و نمود کی قیمت ایک مولی بھی نہیں پڑی اُس کے حصول سے کیا فائدہ ۔ دیوان صاحب نہایت خفیف ہوئے اور آئندہ کے لیے اپنی حرکات سے توبہ کی''[1] ۔

مولانا سید میر حسن سے حضرت علامہ کو تمام عمر گہری عقیدت رہی ہے یہاں تک کہ ۱۹۰۵ء میں یورپ جاتے ہوئے جب علامہ

۱۔ مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی لاہور ، ص ، ۵۹

خواجہ نظام الدین اولیاء کے دربار پر انوار پر حصول برکات کے لیے حاضر ہوئے اور منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا تو وہاں بھی آپ کو نہیں بھولے اور بڑی عقیدت سے اُن کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو :

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اُس کی زیارت سے شادماں مجھ کو[1]

مولانا سید میر حسن میں بے شمار خوبیوں کے علاوہ جو سب سے بڑی خوبی تھی وہ اُن کی "استقامت" تھی جس بات کا ارادہ کر لیتے یا وعدہ کر لیتے اُسے ہر حالت میں نبھانے کی کوشش کرتے۔ اُن کی استقامت کا ایک واقعہ مولانا عبدالمجید سالک اس طرح بیان کرتے ہیں :

"ابھی شاہ صاحب کا عالم شباب ہی تھا کہ اُن کی ہمشیرہ سخت بیمار ہوگئیں یہاں تک کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ ایک دن شاہ صاحب اُن کے پاس بیٹھے تھے، آبدیدہ ہوئیں اور کہنے لگیں کہ بس اب میں مر جاؤں گی اور کوئی میری قبر پر بھی نہ آئے گا۔ شاہ صاحب بھی آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا : اللہ تمہیں شفا دے لیکن اگر کوئی حرج مرج ہوگیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک جیوں گا تمہاری قبر پر آیا کروں گا۔ ہمشیرہ کا انتقال ۱۸۷۸ء میں ہوا اور شاہ صاحب کی بینائی ۱۹۲۸ء میں یعنی انتقال سے دو سال پہلے زائل ہوگئی۔ اس پچاس سال کی مدت میں اُن کا مستقل یہ معمول رہا کہ روزانہ صبح کے وقت ہمشیرہ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے۔ سوائے اُن دنوں کے کہ شاہ صاحب کو سیالکوٹ ہی سے باہر جانا پڑا ہو اس معمول میں ایک دن بھی ناغہ نہ ہوا"[2]۔

اس قسم کی استقامت کی ایک اور مثال میرے عم مرحوم سید ظہوراللہ شاہ سیالکوٹی کی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ والدہ کی وفات کے وقت وہ

۱۔ "کلیات اقبال حصہ اردو" بانگ درا، ص ۹۷

۲۔ ذکر اقبال تالیف عبدالمجید سالک لاہور ص، ۲۷۵ - ۲۷۶

اکیلے ہی اُن کے پاس موجود تھے ۔ مرنے سے تھوڑی دیر پہلے والدہ نے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ ہر روز گیارہ مرتبہ سورۂ یٰسین پڑھ کر اُن کی روح کو ایصال ثواب کیا کریں گے ۔ اس وعدہ کو انہوں نے بڑے استقلال سے نبھایا ۔ وہ ۱۹۴۶ء میں فوت ہوئے اور سید نا شاہ سرمست سہروردیؒ (پیر و مرشد حضرت شاہ دولہ ولیؒ) کی درگاہ واقع سیالکوٹ میں دفن ہوئے ۔

(۲)

حضرت علامہ بزرگان دین کی وفات کے بعد بھی اُن سے استعانت اور اُن کے مزاراتِ متبرکہ سے فیوض و برکات حاصل کرنے کے قائل تھے ۔ ۱۹۰۳ء میں جب اُن کے بڑے بھائی شیخ عطاء اللہ پر ایک افتاد پڑی تو انہوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے حضور منظوم استغاثہ پیش کیا ۔ جسے خوش خط لکھوا کر درگاہ کے دروازہ پر لٹکایا اور اس استغاثہ کی برکت شیخ عطاء اللہ باعزت طور پر بری ہوئے ۔ اس استغاثہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

”کیوں نہ ہوں ارماں میرے دل میں کلیم اللہ کے
طور در آغوش ہیں ذرے تیری درگاہ کے
ہے زیارت کی تمنا ۔ المدد اے سوز عشق
پھول لا دے مجھ کو گلزار خلیل اللہ کے
کس قدر سرسبز ہے صحرا محبت کا تری
اشک کی نہریں ہیں اور سائے ہیں نخلِ آہ کے
تر جو تیرے آستانے کی تمنا میں ہوئی
اشک موتی بن گئے چشم تماشاہ خواہ کے
میرے جیسے ، بے نواؤں کا بھلا مذکور کیا ؟
قیصر و فغفور درباں ہیں تیری درگاہ کے
ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے
سخت ہے میری مصیبت ، سخت گھبرایا ہوں میں
بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہوں میں

کیمیا سے بھی فزوں تر تیری خاک در مجھے
ہاں عطا کر دے میرے مقصود کا گوہر مجھے
تو ہے محبوب الٰہی کر دعا میرے لیے
یہ مصیبت ہے مثالِ فتنۂ محشر مجھے
آہ اس غم میں اگر تو نے خبر میری نہ لی
غرق کر ڈالے گی آخر کو یہ چشم تر مجھے
ہو اگر یوسف مرا زحمت کشِ چاہ الم
چین آئے مصرِ آزادی میں پھر کیوں کر مجھے
کیا کہوں میں قصۂ ہمدردی اہل وطن ؟
تیر کوئی بھیجتا ہے اور کوئی نشتر مجھے
محوِ اظہار تمنائے دلِ ناکام ہوں !
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال[1] کا ہم نام ہوں''[2]

۱۹۰۵ء میں حضرت علامہ اعلیٰ تعلیم کے لیے عازم یورپ ہوئے تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر حاضر ہوئے اور اپنا ہدیۂ عقیدت ایک نظم بعنوان ''التجائے مسافر'' میں پیش کیا یہ نظم پہلی دفعہ ماہنامہ ''مخزن'' کے اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی اور اس کے شروع میں جناب سید غلام بھیک نیرنگ نے ایک تمہید لکھی جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے ۔

''۲ ستمبر ۱۹۰۵ء ہمارے خاص احباب کی تاریخ محبت کا ایک یادگار دن ہے ۔ صبح کا سہانا سماں ہے ، بمبئی میل دہلی سے ریلوے سٹیشن پر پہنچی ہے ۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی اور منشی نذر محمد بی ۔ اے اسٹیشن پر استقبال کو آئے ۔ استقبال کس کا ہے ، جدید شاعری کے روح رواں اقبال اور اُس کے ہمراہیوں کا ۔ وہ کیسے ؟ اقبال بغرض تعلیم علوم و فنون انگلستان کو روانہ ہوئے ہیں ۔ نیرنگ اور اکرام اپنے پیارے دوست کو رخصت کرنے کے لیے دہلی تک ساتھ گئے ہیں ، ریل سے اتر کر

۱۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خادم کا نام

۲۔ رخت سفر مرتبہ انور حارث بار دوم کراچی ۱۹۷۷ء ص ۱۶۱ تا ۱۶۶

منشی نذر محمد کے مکان پر تھوڑی دیر آرام کیا بعد میں سب دوست مل کر حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی درگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ درگاہ میں پہنچ کر مزار مبارک پر حاضر ہوئے۔ اول اقبال نے عالم تنہائی میں مزار مبارک کے سرہانے بیٹھ کر ذیل کی نظم پڑھی اور اُن کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں ٹھہرے رہے۔ بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے اس نظم کو درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر مزار مبارک کی طرف منہ کر کے ایک نہایت درد انگیز اور دل نشیں لہجے میں پڑھا۔ سب احباب اور دیگر سامعین نہایت متاثر ہوئے اور بے تحاشہ زبان سے موقع بہ موقع کلمات تحسین و آفرین نکلتے تھے، ایک محویت کا عالم تھا جس کی تصویر حاضرین کے تصور ہی کھینچ سکتے ہیں"[۱]۔ اب "التجائے مسافر" کے چند اشعار ملاحظہ کریں :

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

۱۔ رسالہ برگ گل کراچی اقبال نمبر ۱۹۷۷ء مضمون عابدہ سلطانہ مرز، ص ۲۰۴

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے[1]

یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد علامہ جب وطن واپس لوٹے تو پھر دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے دربار پر انوار میں[2] سلام کے لیے حاضر ہوئے۔

۱۹۱۱ء میں دہلی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے حضرت علامہؒ نے فرمایا:

"میں جب کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں"[3]۔

ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی کو نیاز کی رقم بھیجی اور لکھا:

"یہ نیاز جو آپ کو پہنچی ہے۔ والدہ محترمہ کی نیاز تھی، قبول فرمائیے - بھائی صاحب کا ارادہ خود حاضر ہونے کا تھا مگر شاید انہیں فرصت نہ تھی"[4]۔

ایک دفعہ حضرت علامہؒ نے نیاز کے بارہ روپے ارسال کیے اور خواجہ صاحب کو لکھا۔

"مکرمی بارہ روپے جس طرح آپ کے خیال میں آئے خرچ کر دیجیئے حلوہ پکا دیجیئے یا خانقاہ کے متعلقین میں تقسیم کر دیجیئے"[5]۔

(۳)

حضرت علامہؒ تحصیل علم کے لیے لاہور آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے اور آخر داتا کی نگری ہی میں اُن کی آرام گاہ بنی - چالیس (۴۰)

۱- کلیات اقبال حصہ اردو، بانگ درا، ص ۹۶ تا ۹۷
۲- ایضاً - ص، ۳۰۷
۳- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی لاہور ۱۹۶۳ء - ص، ۱۴۴
۴- اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ دوم ص، ۳۶۰
۵- ایضاً ص، ۳۶۴ - ۳۶۵

سالہ قیام کے دوران وہ سینکڑوں دفعہ اولیائے کرام کے مزارات عالیہ پر حاضر ہوئے ہوں گے ۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس معلومات بہت کم ہیں ۔ ہاں یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت داتا گنج بخشؒ ، حضرت میاں میرؒ اور حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزارات مقدسہ پر تمام عمر باقاعدگی سے حاضر ہوتے رہے حضرت علامہؒ علی ہجویریؒ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

سید ہجویر مخدوم امم	مرقد او پیر سنجر را حرم
بندہائے کوہسار آساں گسیخت	در زمین ہند تخم سجدہ ریخت
عہد فاروقؓ از جمالش تازہ شد	حق ز حرف او بلند آوازہ شد
پاسبان عزت ام الکتاب	از نگاہش خانۂ باطل خراب
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت	صبح ما از مہر او تابندہ گشت[1]

جناب میاں ایم ۔ اسلم نے ”راوی“ کے اقبال نمبر اور فقیر سید وحید الدین مرحوم نے روزگار فقیر جلد اول میں دو ایسے واقعات درج کیے ہیں جو حضرت داتا گنج بخشؒ کے ساتھ حضرت علامہؒ کی عقیدت پر ہی مبنی نہیں بلکہ حضرت علی ہجویریؒ کی کرامات میں بھی شامل ہو سکتے ہیں ۔

میاں ایم ۔ اسلم حضرت علامہؒ کی زبانی بیان کرتے ہیں :

”آپ نے فرمایا کہ حضرت گرامی آئے ہوئے تھے اور حسب دستور میرے پاس مقیم تھے ۔ ایک روز ہم دونوں صبح صبح گھر سے نکل کر حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کو چلے ، بھاٹی دروازہ کے باہر ایک سفید ریش آدمی ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا ۔ میری جیب میں ایک چونی تھی ، میں نے وہ چونی اُس کے ہاتھ پر رکھ دی ، لیکن اُس نے چونی زمین پر پھینک دی اور ایک روپیہ مانگا ، مانگنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرا قدم آگے کو نہ بڑھا ۔ میں نے گرامی صاحب نے کہا کہ آپ دربار کو چلیے میں آپ کے پیچھے پیچھے پہنچتا ہوں ۔ گرامی صاحب نے کہا کہ وہ اسی جگہ میرا انتظار کریں گے ۔ گھر دروازے کے قریب ہی تھا ۔ میں نے گھر سے ایک روپیہ لیا اور واپس آ کر اُس

۱۔ کلیات اقبال حصہ فارسی ، اسرار و رموز ، ص ۵۲

فقیر کو دے دیا ، اُس نے دعا دی پھر میں اور گرامی حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر جا پہنچے - یہاں ہم کچھ دیر ٹھہرے اور فاتحہ پڑھ کر گھر واپس لوٹ آئے - اُسی روز میرے منشی طاہر نے مجھے پانچ سو روپے کا نوٹ دیا اور کہا کہ ایک مقدمے والا آیا تھا اور وہ یہ پانچ سو روپے آپ کی فیس دے گیا ہے - حضرت گرامی جو میرے پاس بیٹھے تھے بولے ڈاکٹر صاحب لیجیے آپ کو ایک کے پانچ سو مل گئے"[1]

فقیر سید وحیدالدین اپنے والد مکرم کی زبانی ایک واقعہ اس طرح بیان فرماتے ہیں :

"کل صبح میں اقبال کے ہاں گیا تو گویا میرے منتظر تھے - دیکھتے ہی کھل گئے اور کہا اچھا ہوا فقیر تم آ گئے ، سنا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کی درگاہ میں آج کل کوئی بہت روشن ضمیر بزرگ قیام رکھتے ہیں - اُن سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں - سوال یہ ہے کہ جب مسلمانوں سے یہ وعدۂ ایزدی ہے کہ وہ اقوام عالم میں سرفراز اور سر بلند ہوں گے تو آج کل یہ قوم اتنی ذلیل و خوار کیوں ہے - اچھا ہے تم بھی ساتھ چلو ، اکیلے زحمت کون کرے - میں نے حامی بھری اور چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں - . . . . . داتا گنج بخش کے سفر کا فیصلہ ہوتے ہی انہوں نے علی بخش کو آواز دی اور کہا دیکھو ہم باہر جا رہے ہیں - ذرا جلدی سے فقیر کے لیے حقہ بھرو اور بھاگ کر کچھ سوڈا لیمن وغیرہ لے آؤ - اس اہتمام میں حسب معمول جانے کتنا وقت نکل گیا - جب صبح سے دوپہر ہوگئی تو میں نے کہا بھئی اقبال تمھارا کہیں جانے کا ارادہ تو ہے نہیں یوں ہی وقت ضائع کر رہے ہو ، میں تو اب گھر چلا ! اقبال اس پر کچھ چونک سے پڑے اور کہا بھئی اب تو واقعی دھوپ تیز ہوگئی ہے ، تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن یہ وعدہ کرو شام کو ضرور آؤ گے کچھ بھی ہو ہمیں اُن بزرگ کے پاس ضرور جانا ہے - میں وعدہ کر کے چلا آیا ، سہ پہر کو پھر پہنچا لیکن پھر اسی طرح حقہ اور سوڈا لیمن میں دن ڈھل گیا - میں نے اقبال سے اس تساہل کا ذکر کیا تو اقبال بہت ہی انکسار سے کہنے لگے ، بھئی اس دفعہ معاف کر دو صبح ضرور چلیں گے -

---

۱- راوی اقبال نمبر اپریل ۱۹۳۸ء مضمون میاں ایم - اسلم ، ص ۹

اگلی صبح میں عمداً دیر سے پہنچا ، گیارہ بجے کا وقت ہوگا اقبال کو دیکھا تو ان کی عجیب کیفیت تھی ، رنگ زرد ، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ، تفکر اور اضطراب کا یہ عالم کہ جیسے کوئی شدید سانحہ گذر گیا ہو - میں نے پوچھا خیر تو ہے - کہنے لگے فقیر میرے قریب آ کر بیٹھو تو کہوں - آج صبح میں یہیں بیٹھا تھا کہ علی بخش نے آ کر اطلاع دی کہ کوئی درویش صورت آدمی ملنا چاہتا ہے - تو میں نے کہا بلا لو اور ایک درویش صورت اجنبی میرے سامنے خاموش آ کھڑا ہوا ، کچھ وقفہ کے بعد میں نے کہا فرمائیے - آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے - اجنبی بولا : ہاں تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے - میں تمھارے سوال کا جواب دینے آیا ہوں اور اُس نے مثنوی کا یہ مشہور شعر پڑھا :

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
تو ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

کچھ پوچھو نہیں مجھ پر کیا گزر گئی - چند لمحوں کے لیے مجھے قطعی اپنے گرد و پیش کا احساس جاتا رہا - ذرا حواس ٹھکانے ہوئے تو بزرگ سے مخاطب ہونے کے لیے دوبارہ نظر اٹھائی ، لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا - علی بخش کو ہر طرف دوڑایا لیکن کہیں سراغ نہ ملا''[۱] -

آخری عمر میں تو حضرت علامہ فنا فی الگنج بخش ہو کر رہ گئے تھے - ان دنوں میں ایک تو وہ ''کشف المحجوب'' کا بہ کثرت مطالعہ کرتے اور دوسرے ۱۹۳۶ء سے لے کر اُس وقت تک جب کہ چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو گئے ہر روز صبح کی نماز اپنے عزیز دوست ڈاکٹر نیاز احمد کی ہمراہی میں حضرت داتا گنج بخشؒ کی درگاہ میں ادا کرتے رہے اور معمول میں کبھی ناغہ نہ ہوا - ہاں اگر وہ لاہور سے باہر گئے ہوں تو علاوہ بات ہے - ڈاکٹر نیاز احمد سابق ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی پنجاب یونیورسٹی کی نواسی محترمہ شہنیلہ امین ایک مضمون میں بیان کرتی ہیں -

''نانا مرحوم ایک بات کا جس کا وہ خاص طور پر ذکر کرتے تھے وہ علامہ اقبالؒ کی حضرت داتا گنج بخشؒ کے لیے عقیدت تھی - ایک بار

۱- ''روزگار فقیر'' جلد اول تالیف فقیر سید وحیدالدین طبع ششم لاہور ۱۹۶۶ء ، ص ۳۲ - ۳۳

جب علامہؒ صاحب سے ملاقات کے لیے جاوید منزل گئے تو علامہ اقبال ''کشف المحجوب'' کا مطالعہ کر رہے تھے ۔ نانا کو دیکھتے ہی پرنم آنکھوں سے بولے ! دیکھو ڈاکٹر نیاز یہ کتاب نہیں یہ توگنجینۂ معنی ہے۔ کیا خوبصورت پیغام کتنے سادہ لفظوں میں دیا گیا ہے مگر سمجھ نہیں آتی مسلمان اس قدر بے حس کیوں ہو گیا ہے ۔ واللہ اگر ہم آج بھی داتا صاحب کے تصوف کی گہرائی اور گیرائی سمجھ لیں تو اسلام کو سمجھنے میں دقت ہی کچھ نہیں رہ جاتی !

نانا مرحوم کہتے ہیں ۲۲ فروری ۱۹۳۶ء سے لے کر نومبر ۱۹۳۷ء تک یہ دستور رہا کہ میں صبح تین بجے کا الارم لگا کر سوتا ۔ ۳ بجے گاڑی لے کر سیدھا جاوید منزل پہنچتا ۔ پہلے ہی ہارن پر حضرت علامہؒ تشریف لے آتے ۔ ہم دونوں نماز فجر داتا صاحبؒ میں ادا کرتے ۔ علامہ قرآن کا نصف سیپارہ تلاوت کرتے اور اُجالا ہونے پر میں انہیں اُن کی اقامت گاہ پر چھوڑ کر واپس آتا ۔ اس معمول میں اندھیرے سویرے ، گرمی ، سردی ، برسات میں کبھی فرق نہیں پڑا ۔ نومبر ۱۹۳۷ء کے آغاز میں جوڑوں کے درد کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے جس سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا''[۱] ۔

یہاں حضرت داتا صاحبؒ کی کرامت کا ایک اور واقعہ بھی درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔ یہ واقعہ مجھے پنجابی زبان کے عظیم غزل گو پیر فضل حسین فضل نے مجھے سنایا تھا ۔ واقعہ یوں ہے ۔

''پیر صاحب نے بیان کیا کہ ایک دفعہ میں لاہور میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ داتا صاحب جا رہا تھا ۔ جب لوہاری دروازہ کے چوک میں پہنچا تو میرے دوست نے ایک معمر شخص کی طرف جو سرمہ بیچ رہا تھا اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ شخص حضرت داتا صاحبؒ کی زندہ کرامت ہے ۔ میں نے پوچھا وہ کیسے ؟ میرے دوست نے کہا چلو اس شخص سے پوچھتے ہیں ۔ چنانچہ ہم دونوں اُس کے پاس پہنچے اور اس سے حضرت داتا کی کرامت کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے عرض کیا تو اس نے کہا کہ میں آج سے ۲۵ ، ۳۰ سال پہلے بالکل اپاہج تھا لیکن

۱- روز نامہ ''نوائے وقت'' لاہور اقبال نمبر ۲۱ اپریل ۱۹۸۲ء

جمعۃ المبارک ہمیشہ داتا صاحب ہی میں ادا کرتا ۔ میرے بچے مجھے نماز سے پہلے پہنچا آتے اور نماز ختم ہونے کے بعد واپس گھر لے آتے ۔ ایک دفعہ جب اقامت کہی جا رہی تھی تو میرے ساتھ کھڑے ہوئے ایک نورانی صورت بزرگ نے کہا تم کھڑے کیوں نہیں ہوتے ۔ میں نے عرض کیا کہ میں اپاہج ہوں ۔ یہ سن کر بزرگ نے زور سے میرا بازو پکڑا اور کہا اٹھو تم بالکل ٹھیک ہو ۔ اُس کے بازو پکڑنے کی دیر تھی کہ میں تندرست و توانا آدمی کی طرح کھڑا ہو گیا ۔ جب فرائض کی ادائیگی کے بعد سلام پھیرا تو باوجود تلاش کے وہ آدمی نظر نہ آیا ۔ اُس وقت سے آج تک بالکل تندرست ہوں ۔ سرمہ بیچ کر عزت کی روٹی کھاتا ہوں ہاں اُس محسن کو ابھی تک آنکھیں تلاش کر رہی ہیں'' ۔

(نوٹ : پیر صاحب نے یہ واقعہ مجھے ۱۹۶۳ء میں سنایا تھا)

(۴)

حضرت علامہؒ دست غیب ، بخشش ، درگاہوں پر منت ماننے وغیرہ کے بھی قائل تھے ۔ علامہ کے ایک عزیز دوست ڈاکٹر سعید اللہ تحریر فرماتے ہیں ۔

''دست غیب سے متعلق ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مولانا وحید الدین سلیم نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوگیا ۔ تو ان کے پیر حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ نے مولانا وحید الدین سلیم کو بلایا اور کہا کہ تمہارا باپ ہمارا دوست تھا ہم تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتے ہیں ۔ جب روپیہ کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفہ کو پڑھنا ۔ پانچ روپے تمہیں مل جایا کریں گے ۔ پیر صاحب سے رخصت ہو کر گھر آئے تو والدہ کو سارا قصہ سنایا ۔ انہوں نے کہا کہ گھر میں کچھ نہیں نہ آٹا نہ دال ۔ وظیفہ پڑھا گیا ۔ تکیہ کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے مولانا کا بیان ہے کہ انہوں نے اسی طرح وظیفہ پڑھ کر تعلیم حاصل کی ، جب روپیہ خود کمانے لگے تو وظیفہ بند کر دیا ۔ سرسید سے جب مولانا کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے کہا کہ آپ نیچری ہیں مگر ہمارے وظیفہ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں ۔

کرامت کی بھی ایک مثال ڈاکٹر صاحب نے سنائی ، فرمایا : سرسید کی

طرح اُن کے باپ کے گلے میں بھی رسولی تھی ۔ وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے اس کا کیا کچھ علاج کیا جائے ۔ پیر صاحب نے اُن کی داڑھی کے نیچے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا بھئی ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی ۔

بخشش کی بھی مثال سنائی ، فرمایا : ایک انسپکٹر پولیس ہے وہ سانپ کے کاٹے کا دم کرتا ہے اور شفا ہو جاتی ہے ۔ کئی سو میل سے بھی دم کا اثر ہوتا ہے''[1] ۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ سر سید احمد خاں کے پوتے اور حضرت علامہ کے قریبی دوست سر راس مسعود مرحوم بھی اولیاء کرام سے سچی عقیدت رکھتے تھے اور اولیاء کرام کی کرامات کے صدق دل سے قائل تھے ۔ انہوں نے ایک دفعہ ایک صاحب مزار کی کرامت کا ایک واقعہ مولانا عبدالرزاق کانپوری مصنف ''یاد ایام'' کو سنایا جو مولانا نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

''ایک دفعہ بیان کیا کہ میں اورنگ آباد میں بحیثیت ناظم تعلیمات دورے پر تھا ۔ شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک ولی کامل کا مزار تھا ۔ میں وہاں فاتحہ پڑھنے گیا ۔ مقبرے کے اندر سے جب واپس ہوا تو آواز آئی مسعود ! مقبرے کے سامنے جو درخت ہے اُس کی تین پتیاں کھاؤ ۔ میں یہ سمجھا کہ کسی دوست نے مذاقاً یہ کہا ہے ۔ لیکن جب غور سے دیکھا تو دور تک کوئی نظر نہ آیا ، کچھ فاصلے پر کار موجود تھی ڈرائیور سے پوچھا تو اُس نے کہا میرے سوا یہاں کوئی نہیں ہے ، چنانچہ اس غیبی آواز پر میں نے عمل کیا اور تین پتیاں اُس درخت کی توڑ کر کھا لیں ۔ وہ زمانہ تھا کہ حیدر آباد کے بعض مقتدر اصحاب میرے مخالف ہو گئے تھے اور میں حقیقت میں تین مشکلوں میں مبتلا بھی تھا ، چنانچہ وہ سب مشکلیں حل ہو گئیں ۔ اس واقعہ کے اظہار کے بعد حاضرین سے خطاب کیا کہ آپ لوگوں کو یہ واقعہ عجیب و غریب معلوم ہو گا اور میری بات غلط سمجھیں گے ۔ لیکن یاد رکھئے میں نے کبھی جھوٹ

۱۔ ملفوظات اقبال مرتب محمود نظامی بار دوم ، لاہور ۱۹۴۹ء ص ۱۶۳ - ۱۶۴ ۔

نہیں بولا اور میں صوفیائے عظام کی کرامات کا معتقد ہوں"[۱]

حضرت علامہ کرامات اور نذر و نیاز کے علاوہ عام خوش عقیدہ مسلمانوں کی طرح دم درود، تعویذ اور اولیاء کرام کی درگاہوں کی منت ماننے کے بھی قائل تھے۔ جب وہ مدت تک اولاد کی نعمت سے محروم رہے تو حضرت مجدد کی درگاہ پر حاضر ہوئے اور دعا کی مولائے کریم مجھے بیٹا عطا فرما۔ میں اُسے سلام کے لیے حضرت مجدد کی درگاہ پر لاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علامہ کی درد بھری التجا سن لی اور جاوید عطا فرمایا۔ اور جب جاوید کچھ بڑا ہوا تو اُسے سلام کے لیے سرہند تشریف لے گئے۔ جاوید اقبال اپنے ایک مضمون "ابا جان" میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"مجھے اپنے خاندان سے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ میری پیدائش سے کئی سال پیشتر ابا جان حضرت مجدد کی بارگاہ میں حاضر میں ہوئے اور دعا کی کہ اللہ انہیں ایک بیٹا عطا کرے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ساتھ لے کر دوبارہ سرہند پہنچے۔ اُس سفر کے دھندلے سے تصورات میری نگاہوں کے سامنے ابھرتے ہیں۔ میں اُن کے ہمراہ اُن کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہو رہا ہوں۔ گنبد کے تیرہ و تار مگر پُر وقار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت طاری کر دی، ابا نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا، پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے۔۔۔ میں نے دیکھا اُن کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ دو ایک روز وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے"[۲]

سرہند شریف کے اس سفر میں مولانا غلام بھیک نیرنگ بھی علامہ کے ہمراہ تھے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"اسرار خودی" کے شائع ہونے پر اُن کو تصوف اور سلسلہ ہائے تصوف کا مخالف سمجھا گیا۔ مگر اُن کے کلام کے وسیع مطالعہ سے یہ بات

۱۔ یاد ایام تالیف عبدالرزاق کانپوری حیدر آباد دکن ۱۹۴۶ء ص ۳۷۷—۳۷۸۔

۲۔ ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی بار دوم لاہور ۱۹۴۹ء ص ۳۲۲ - ۳۲۳۔

واضح ہو جاتی ہے کہ اُن کا اعتراض ریا کار، دکاندار اور دنیا طلب صوفیوں پر ہے، اُن کے والد ماجد ایک صوفی منش بزرگ تھے، خود اقبال سلسلۂ قادریہ میں بیعت کئے ہوئے تھے - - - - بزرگوں کے مزارات پر بالقصد بغرض زیارت و طلب برکت حاضر ہوا کرتے تھے۔ بانگ درا میں اُن کی نظم ''التجائے مسافر'' کو دیکھیے اس سے حضرت محبوب الٰہیؒ سے انتہائی عقیدت ظاہر ہوتی ہے، یہ اقبال کی جوانی کا واقعہ ہے۔ لیکن بالفرض اگر یہ جوانی کی خام کاری تھی تو بعد کی پختہ کاری قابل غور ہے۔ اس پختہ کاری ہی کے زمانے میں غالباً ۱۹۳۴ء میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے مزار پاک کی زیارت کے لیے اقبال لاہور سے چل کر سرہند آئے، مجھ کو لکھا کہ میں بھی پہنچوں۔ چنانچہ انبالے سے گیا اور وہ لاہور سے آئے، ہم دونوں سرہند جنکشن پر مل گئے اور پھر روضہ شریف پہنچے۔ مزار پر اقبال کی حاضری میرے ہمراہ ہوئی اور فاتحہ خوانی کے بعد دیر تک وہ مراقبہ میں رہے۔ ان کا لاہور سے اتنی دور چل کر آنا ہی ثابت کرتا ہے کہ اُن کو حضرت مجدد سے کس قدر عقیدت تھی''[۱]

حضرت علامہ مریضوں کو تعویز اور گنڈا بھی دیتے۔ جاوید اقبال فرماتے ہیں۔

''بعض اوقات خود اقبال بھی بخار کے مریضوں کو پیپل کے پتوں پر قرآنی آیات قلم سے لکھ کر دیتے تھے۔ جس کے چاٹنے سے مریض کا بخار اُتر جاتا تھا۔ اپنے بچپن میں راقم نے انہیں پیپل کے پتوں پر ایسا تحریر کرتے دیکھا ہے۔ اس قسم کے روحانی علاج کرنے کی اجازت ممکن ہے انہوں نے اپنے والد سے حاصل کی ہو''[۲]

حضرت علامہ آیات قرآنی کی تاثیر کے سختی سے قائل تھے۔ ایک دفعہ علامہ راغب احسن کا خاندان مصائب و آلام کا شکار ہوگیا تو انہیں لکھا:

۱۔ سہ ماہی ''اقبال'' لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء مضمون غلام بھیک نیرنگ، ص ۲۰ - ۲۱ -

۲۔ زندہ رود تالیف جاوید اقبال لاہور ۱۹۷۹ء جلد اول ص - ۶۴

’’میں آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوں - سورۂ الرحمٰن کا ورد ہر روز کرنا چاہیے - گھر کے سب لوگ پڑھا کریں تو اور بھی بہتر‘‘[۱]

درود شریف کو تو علامہ اقبالؒ اکسیر اعظم سمجھتے تھے اور ہر وقت اُن کے لب اس ذکر پاک سے تر رہتے اور جس کسی کو بڑی کسی مشکل یا الجھن میں مبتلا دیکھتے اُسے درود شریف بکثرت پڑھنے کی تاکید کرتے -

(۵)

حضرت علامہ خود بھی مستجاب الدعوات اور صاحب کرامت بزرگ تھے - ایک دفعہ اُن کے ایک عقیدت مند ڈاکٹر عبدالحمید ملک اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری شادی کو بہت عرصہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں دعا فرمائیں ! چنانچہ آپ کی دعا سے ڈاکٹر عبدالحمید اولاد کی نعمت سے سرفراز ہوئے - اس واقعہ بلکہ کرامت کو ملک صاحب کی زبانی سنیے -

’’میری شادی کو تقریباً بارہ برس گذر گئے لیکن ہمارے ہاں کوئی اولاد نہ تھی جس کی وجہ سے میں اکثر مغموم رہتا - اُن دنوں شاعر مشرق کے ہاں میرا اکثر آنا جانا رہتا تھا اور آپ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے - ایک روز میرے دوست میاں محمد شفیع (م - ش) نے علامہ مرحوم سے کہا کہ حمید صاحب کے لیے دعا کیجیے کہ ان کو بھی اللہ تعالیٰ اولاد کی نعمت سے سرفراز فرما دے اور اُن کی اداسی ختم ہو جائے فرمایا :- اچھا بھائی کریں گے ! دوسرے روز میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے دعا کر دی ہے اور زندگی میں اتنی شدت سے ایک دفعہ پہلے دعا کی تھی یا اب تمہارے لیے کی ہے - انشاء اللہ خدا اپنا فضل کرے گا - اپنی بیوی سے کہنا کہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ سورۂ مریم کی تلاوت کیا کرے - چنانچہ میری بیوی حسب ہدایت سورۂ مریم کی تلاوت کرتی رہیں اور اللہ تعالیٰ نے نو دس ماہ بعد ہمیں ایک فرزند عطا فرمایا -

---

۱- روز نامہ ’’جنگ‘‘ لاہور اقبال نمبر ۲۱ اپریل ۸۳ مکتوب بنام علامہ راغب احسن -

حضرت علامہ کے مندرجہ ذیل مصرعوں کا بھی مطالعہ کیا جائے:

ع مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم (علی ہجویری کی تعریف میں)

ع در فضائے مرقدِ او سوختم (حکیم سنائی کی یاد میں)

ع تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
(حضرت نظام الدین اولیاء کی یاد میں)

تو ایک عجیب نقطہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت علامہ نہ صرف اولیاء کرام کی ذات اور اُن کی ارواحِ مقدسہ کو محیطِ انوار سمجھتے ہیں بلکہ اُس خاک کو بھی مرکزِ تجلیات سمجھتے ہیں جہاں یہ پاک نفوس آرام فرما رہے ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ''مرقد او پیر سنجر را حرم'' نہ کہتے بلکہ مرقد کی بجائے ذات یا روح کا لفظ استعمال کرتے۔

اس مثنوی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں حضرت علامہؒ نے اپنی فکری اور روحانی دنیا کے ہونے والے رہنما و رہبر کا بڑے دل نشیں انداز میں کیا ہے۔ یہ رہنما ہیں۔ مرشدِ رومی جو ''اسرارِ خودی'' سے لے کر ''جاوید نامہ'' اور ''ارمغانِ حجاز'' تک ہر جگہ چھائے ہوئے ہیں۔ اس مثنوی میں حضرت علامہؒ نے وہ مشہور واقعہ نظم کیا ہے جس نے حلب کے ایک ظاہر بیں اور مغرور مولوی کو ''مولائے روم'' بنا دیا اور اس طرح ''خبر'' کو ''نظر'' اور ''عشق'' کو ''عقل'' پر برتری اور فوقیت عطا کر دی۔ اس دل نشیں واقعہ کو حضرت علامہ کی زبانِ فیض ترجمان سے سنیے:

آگہی از قصہ آخوندِ روم
آن کہ داد اندر حلب درس علوم
پائے در زنجیرِ توجہاتِ عقل
کشتیش طوفانی ظلماتِ عقل

از تشکک گفت و از اشراق گفت
و ز حکم صد گوہرِ تابندہ سفت

گرد و پیشش بود انبارِ کتب
بر لبِ او شرحِ اسرارِ کتب

ٹھیک ہو چکا تھا ''[1]

حضرت علامہ ''دعا'' کے سختی سے قائل تھے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے ایک خطبہ کا نام ہی ''ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا'' رکھا اُن کا ایمان تھا کہ دعا میں اگر خلوص اور ایقان شامل ہو تو وہ کبھی خطا نہیں جاتی ۔ ایک دفعہ آن کے چند احباب نے اُن سے ''دعا'' کی حقیقت کی وضاحت کے لیے عرض کیا تو انہوں نے فرمایا ۔

''دعا جزو ایمان ہے ، ہم اللہ کو مانتے ہیں تو دعا بھی کریں گے وہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے وہ ہم سے اور ہماری دنیا سے بے تعلق نہیں ، ہم جو کچھ کہتے ہیں اُسی سے کہتے ہیں ۔ وہ کہتا ہے مجھ ہی سے دعا کرو ۔ میں تمہاری دعا سنتا اور اس کا جواب دیتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کی ساری زندگی دعا ہے ۔ دعا جو اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق ، رب اور خالق اور سمیع و علیم مان کر صمیم قلب سے نکلتی ہے ، دعا جو عبادت ہے ، ذکر ہے ، صلوات ہے ! دعا جو طلب بھی ہے ، تڑپ ، امید اور آرزو بھی ، جو محض تسکین قلب کا ذریعہ نہیں ہے ، نہ فریب نفس بلکہ ایک حقیقت ۔ اس نکتے کو دو شخص خوب سمجھے ۔ ابن خلدون اور ابن عربی''[2]

اب جب کہ ابن عربی کا نام آ گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بارے میں حضرت علامہ کے خیالات و جذبات کی وضاحت کر دی جائے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانہ میں وہ حکیم سنائی، منصور حلاج اور ابن عربی رحمتہ اللہ علیہم کے سخت مخالف تھے ۔ لیکن بعد میں جب انہوں نے ابن عربی کی ایمان افروز تصانیف اور تعلیمات کا عمیق نظروں سے مطالعہ کیا تو انہیں ایک عظیم حکیم اور صوفی سمجھنے لگے اور اُن کے دل میں ابن عربی کی محبت و عقیدت کے جذبات پیدا ہو گئے - جس کا اظہار حضرت علامہ کی آخری تحریروں سے ہوتا ہے ۔ لفظ 'دہر' پر

۱- اقبال درون خانہ تالیف خالد نظیر صوفی لاہور ۱۹۷۱ء ص ۱۷۷ تا ۱۸۱ -

۲- اقبال کے حضور تالیف سید نذیر نیازی کراچی ۱۹۷۱ء ص ۲۶۰ تا ۳۶۲ -

بحث کرتے ہوئے حضرت علامہ لکھتے ہیں ۔

''حکمائے اسلام اور حضرات صوفیہ کو زمانے کے مسئلے سے بڑی دل چسپی تھی ۔ کچھ تو اس لیے کہ قرآن پاک نے اختلاف لیل و نہار کا شمار اہم ترین آیات الہیہ میں کیا ہے اور کچھ اس لیے کہ حضور رسالتماب ؐ نے ''دہر'' کو ذات الہیہ کا مترادف ٹھہرایا ۔ آپؐ کا یہ ارشاد جس مشہور حدیث میں نقل ہوا ۔ اُس کی طرف ہم پہلے سے اشارہ کر آئے ہیں ۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ بعض اکابر صوفیہ نے لفظ دہر سے طرح طرح کے صوفیانہ نکات پیدا کئے ۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ دہر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور ایسے ہی رازی نے بھی تفسیر قرآن میں لکھا ہے کہ بعض صوفی بزرگوں نے انہیں لفظ دہر ، دیہود یا دیہار کی تلقین کی تھی''[1]

ایک اور جگہ پر ''مابعدالطبیعات'' پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں اسلامی اندلس کے مشہور صوفی ، فلسفی ابن عربی کا یہ قول کیا خوب ہے کہ وجود مدرک تو خدا ہے کائنات معنی''[2]

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی کے حکیمانہ اور صوفیانہ خیالات سے حضرت علامہ نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور ان سے استدلال بھی کیا ہے ۔ حضرت علامہ ابن عربی کے نظریہٗ حقیقت زماں سے بہت متاثر تھے اور اس مسئلہ پر وہ یورپ میں ایک مقالہ بھی پڑھنا چاہتے تھے چنانچہ وہ اپنے دور کے ابن عربی کے سب سے بڑے ماہر حضرت پیر مہر علی شاہ دربار گولڑہ شریف (راولپنڈی) کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں ۔

''میں نے گذشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پر تقریر کی تھی جو وہاں کے ادا شناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی ، اب پھر اُدھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے نظر بہ ایں حال چند امور دریافت طلب ہیں ۔

۱۔ خطبات اقبال ترجمہ سید نذیر نیازی لاہور ۱۹۵۸ء ص - ۱۱۱

۲۔ ایضاً ص ۲۸۱ -

۱ - حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زماں کے متعلق کیا کہا ہے -
۲ - یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے -
۳ - حضرات صوفیہ میں سے اگر کسی اور بزرگ نے حقیقت زماں پر بحث کی ہو تو اُن بزرگ کے ارشادات بھی مطلوب ہیں''[1]

حضرت علامہ کا یہ خط ۱۸ - اگست ۱۹۳۳ء کا ہے اسی مسئلہ کے متعلق انہوں نے سید سلیمان ندوی کو بھی ۱۷ ، ستمبر ۱۹۳۳ء ، اور ۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کو خطوط لکھے - سید نذیر نیازی مرحوم فرماتے ہیں کہ کسی نے حضرت علامہ کے حضور یہ موضوع چھیڑا کہ فطرت انسانی نے ستاروں سے بڑا اثر قبول کیا ہے تو آپ نے فرمایا -

''ستارے ذی روح کرّے ہیں - ستاروں کی حرکات نقص سے خالی ہیں - روحیں ستاروں میں قیام کرتی ہیں - یہ اور کتنی باتیں ہیں جن سے فلاسفہ اور ارباب مذہب کی تحریریں بھری پڑی ہیں - لیکن ان سب میں پر اثر اور معنی خیز بات یہ ہے کہ ستاروں نے بعض افراد کو اپنی طرف کھینچا ، انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی یا یوں کہیے کہ بعض انسانوں کا خیال اس طرف گیا کہ آسمان کا سفر کریں ، ستاروں میں پہنچیں اور ان میں گھوم پھر کر واپس آ جائیں - ابن عربی ہی کو دیکھیے - اُن کی شخصیت کیسی عظیم ہے - وہ ستاروں میں اپنی سیاحتوں کا حال بیان کرتے نہیں تھکتے - ایک کے بعد دوسرے ستاروں کا رخ کرتے ہیں ، سیاروں میں جاتے ہیں اور وہاں انہیں جو مشاہدات ہوتے ہیں اُن کے بیان میں کیا کچھ نہیں کہتے - ابن عربی عجیب و غریب انسان تھے ، لیکن اس سے بھی عجیب تر انسان کا یہ جذبہ ہے کہ روح انسانی زمین سے رستگاری حاصل کرے ، عالم بالا کی سیر کرتی پھرے ، زمین سے آزاد ہو جائے اور انسان کو زمین سے آزاد ہونا چاہیے''[2]

۱- انتخاب روح مکاتیب اقبال مرتب عبداللہ قریشی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۴۶۸ -

۲- اقبال کے حضور مرتب سید نذیر نیازی کراچی ۱۹۷۱ء ص ۳۰۲ - ۳۰۳ -

حضرت ابن عربی کے معراج نامہ ''فتوحات مکیہ'' سے علامہ اقبال بہت زیادہ متاثر ہیں اور اسی کے تتبع میں انہوں نے جاوید نامہ تحریر کیا ہے جس میں اُن کے رہبر و رہنما مرشد رومیؒ ہیں جو ابن عربی کے معنوی شاگرد ہیں اور فلسفہ وحدت الوجود کے فکری انداز عطا کرنے میں نمایاں مقام کے مالک ہیں ۔ جناب صبیح احمد کمالی نے اپنے مفصّل مقالہ ''جاوید نامہ اور اُس کے پیشرو'' میں جاوید نامہ اور اس سے پہلے اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں ''الغفران'' تالیف ابوالعلا معری ، ''فتوحات مکیہ'' تالیف شیخ محی الدین ابن عربی اور ڈیوائن کامیڈی'' تالیف ڈانٹے کا جامع انداز میں متعارف کروایا ہے اور جاوید نامہ اور ان کتابوں میں جو قدر مشترک ہے اُس کی نشاندہی بھی کی ہے ''جاوید نامہ اور فتوحات مکیہ'' کی سرخی کے تحت لکھتے ہیں ۔

''اقبال وحدت الوجود کے عقیدہ کا حامی نہ سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی طبیعت تصوف کی جانب ایک خاص رجحان اور مناسبت رکھتی تھی ، وہ عقلیت کا پرستار نہیں بلکہ اس سے غیر مطمئن ہے ۔ اس کے یہاں ہمیں وہ سب چیزیں ملتی ہیں جو افلاطونیت جدید سے اثر قبول کرنے والے تصوف کا طرۂ امتیاز ہیں ، عقل و دل کی کشمکش میں دل کی افضلّیت عالم خاکی میں اجنبیت کا احساس ، اعتبارات حواس سے گزر کر فیضان عشق کے ذریعے سے حقیقت کے مشاہدے کی جستجو ، خواص طبعی کی مزاحمت سے نجات کی آرزو ، اور صور مجازی سے ہٹ کر حقائق اشیاء کے علم کی طلب ، یہ وہ چیزیں ہیں جن کی تصوف نے اشاعت کی اور اقبال کی شاعری میں ہمیں جا بجا ملتی ہیں ۔ اقبال کی اور شیخ اکبر کی تصنیفات کو اس پس منظر میں دیکھنے سے اندازہ ہو گا کہ اگر ان دونوں میں ایک قسم کا روحانی رشتہ نظر آتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی چیز نہیں ۔ فتوحات مکیہ اور جاوید نامہ کے مشابہت کے دو نکتے ہمارے سامنے وضاحت کے ساتھ آتے ہیں ۔ اولاً : اقبال نے ابن عربی کی طرح اپنی سیاحت میں دوزخ کو علاحدہ شکل میں شامل نہیں کیا ہے ۔ وہ سیر افلاک کے دوران ہی میں ان لوگوں سے ملتا ہے جو جہنم کے مستحق تھے ۔ پھر آں سوئے افلاک میں پہنچ کر کاخ فردوس سے ہوتا ہوا مرحلہ ''حضور'' میں پہنچتا ہے ، ثانیاً مرحلۂ ذات اور حضور میں اُسے تقدیر کائنات کا محرم بنایا جاتا ہے جس

طرح فتوحات کا ''عالم'' صفات ذاتی و تکوینی کا مشاہدہ کرتا ہے''[1]

چوہدری محمد حسین مرحوم نے بھی اپنے مضمون میں جو جاوید نامہ سے متعلق ہے فتوحات مکیہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ اُس کا ایک اقتباس بھی خالی از دل چسپی نہ ہو گا ۔

''معراج کا مذہبی اور علمی پہلو تو وہی ہے جسے مشاہدۂ تجلی ذات کہنا چاہئے جو پیغمبر خداؐ کو نصیب ہوا ۔ دوسرا پہلو وہ ہے جسے تصوف کا پہلو کہنا چاہیے ۔ صوفیا کا معراج بھی در اصل ایک قسم کا علمی اور مذہبی پہلو رکھتا ہے ۔ مختلف صوفیا نے مختلف رنگوں میں تجلی ذات کے مشاہدے کا ذکر کیا ہے ۔ تصوف اُن طریقوں کا نام ہے جن سے براہ راست معرفت ذات باری کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے اور جو لوگ ان طریقوں کے اختیار میں تجلی ذات کے پرتو سے بہرہ یاب ہوئے انہوں نے بعض اوقات اس حصول مقصد کو معراج سے تعبیر کیا ۔ اعاظم صوفیا میں با یزید بسطامی اور محی الدین ابن عربی کا معراج مشہور ہے ۔ حضرت با یزید بسطامی کے معراج کی کیفیات تو شاید قلم بند ہی نہ ہوئیں لیکن محی الدین ابن عربی نے ، فتوحات مکیہ ، میں اپنے معراج پر دفتر کے دفتر لکھے ہیں اور سیاحت علوی میں دو افراد کو اپنا رہنما اور ساتھی بنا کر جن میں ایک فلسفی ہے اور دوسرا عالم دین ، اُن کی زبان سے تمام دنیا جہان کے علوم و فنون اور مسائل و مباحث کے متعلق اس انداز سے اظہار خیالات فرمایا ہے کہ گویا یہ سب خیالات وہ الہامات ہیں جو اُن کے قلب پر معراج میں وارد ہوئے ، خالص عرفانی ہونے کی بجائے محی الدین ابن عربی کا معراج زیادہ تر مذہبی ہے ، سیاحت آسمان اور مشاہدۂ ذات کے حقائق بے حد تفصیلات سے دیئے ہیں ۔ منازل ، مناظر ، واقعات ، کیفیات ، مشاہدات کم و بیش ایسی ترتیب میں ہیں جس میں معراج پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ! تفصیلات و تشریحات نے تصویر کو اس کامل صورت میں پیش کیا ہے کہ ڈانٹے کے نقاد کو ''ڈیوائن کامیڈی'' کا تمام نقشہ ''فتوحات مکیہ'' کے انہیں ابواب کا چربہ نظر آتا ہے جن

۱- علی گڑھ میگزین ۱۹۳۶ء ص ۳۸ - ۳۹ -

میں معراج کا ذکر ہے ''۱

(۶)

یورپ سے واپسی کے فوراً بعد ہی حضرت علامہ نے ''مثنوی اسرار خودی'' لکھنی شروع کر دی ۔ جولائی ۱۹۱۱ء میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں :

''قبلہ والد نے فرمائش کی ہے کہ حضرت بو علی قلندر کی مثنوی کی طرز پر ایک مثنوی لکھوں ۔ اس راہ کی مشکلات کے باوجود میں نے کام شروع کر دیا ہے ۔''۲

مثنوی مکمل ہوئی تو اس کے کئی نام حضرت علامہ کے ذہن میں تھے مثلاً ''اسرار حیات'' ، ''پیام نو'' اور ''آئین نو'' وغیرہم ۔ لیکن آخر قرعہ فال ''اسرار خودی'' پر پڑا ۔ مثنوی کے دیباچہ میں وحدت‌الوجود اور متن میں خواجہ حافظ شیرازی کی لا زوال اور مسحور کن شاعری کے اُن مہلک اثرات کا ذکر کیا گیا جو ہر دور کے سطحی مطالعہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اس مثنوی کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے حضرت علامہ پر دشمن تصوف اور دشمن حافظ کے الزامات عائد ہونا شروع ہو گئے اور حضرت علامہ کے موافقین اور مخالفین میں قلمی جنگ شروع ہو گئی اور لطف یہ ہے کہ حضرت علامہ سے مخالفین میں زیادہ تعداد اُن دوستوں کی تھی مثلاً خواجہ حسن نظامی ، مولانا غلام بھیک نیرنگ اور یہاں تک کہ خود اُن کے والد محترم بھی اس صف میں شامل تھے ۔

اس مخالفت کے دور میں اُن لوگوں کی بن آئی جو واقعتاً تصوف کے مخالف تھے اور انہوں نے نفس تصوف کے خلاف مقالات و مضامین شائع کرنا شروع کر دیے ۔ حالاں کہ حضرت علامہؒ تصوف کے مخالف نہیں تھے ۔ بلکہ وہ تو خود بھی سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے حضرت علامہؒ

۱- شرح جاوید نامہ مرتبہ صبغت اللہ بخاری لاہور مضمون چوہدری محمد حسین ، ص ۷۴ - ۷۵ -

۲- ''اقبال نامہ'' ، حصہ دوم ، مرتب شیخ عطاء اللہ ، لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۱۴۸ - ۱۴۹

کے خلاف لکھے گئے مضامین اور تحریروں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے ایک دانا منصف و حکیم کی طرح جو بات انھیں صحیح نظر آئی اُسے انہوں نے صدقِ دل سے قبول کر لیا ۔

''اسرارِ خودی'' کی دوسری اشاعت کے وقت جب انہوں نے خواجہ حافظ کے خلاف لکھے گئے اشعار کو حذف کر دیا تو ان کے دوست مولانا اسلم جیراج پوری نے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا :

"عرفی کے اشارے سے محض اس کے بعض اشعار کی تلمیح مقصود تھی ۔ مثلاً

گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن صدقہ نہ شرطِ انصاف است

لیکن اس مقابلے سے میں خود مطمئن نہ تھا اور یہ ایک مزید وجہ ان اشعار کو حذف کر دینے کی تھی ۔''[1]

مندرجہ بالا مختصر سا اقتباس معلوم ہوتا ہے کہ ''اسرارِ خودی'' کے دوسرے ایڈیشن میں خواجہ حافظ کے بارے میں لکھے گئے اشعار کے اخراج کی وجہ محض ''غوغائے عوام'' نہ تھی بلکہ خود بھی حضرت علامہ سمجھتے تھے کہ حافظ کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ۔ باقی رہی وحدت الوجود اور شیخ اکبر کی مخالفت تو انہوں نے شیخ کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے خیر آباد سکول کے ایک ہونہار طالب علم ، مولانا عبداللہ عمادی[2] کی طرف رجوع کیا اور اس طرح حضرت شیخ کے بارے میں اُن کے خیالات میں جو تبدیلی ہوئی اُس کا ذکر ہم تفصیل سے کر چکے ہیں ۔

''اسرارِ خودی'' اخلاق و تصوف اور اسلامی تعلیمات کا ایک بہترین مرقع ہے ۔ کتاب میں جابجا اولیاء کرام اور ان کی تعلیمات و ارشادات کا ذکر ہے ۔ حضرت داتا صاحب ، حضرت میاں میر اور حضرت بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیھم کا ذکر بڑی عقیدت و محبت سے کیا گیا ہے ۔ داتا صاحبؒ

۱- رختِ سفر مرتبہ انور حارث ، کراچی ، بار دوم ، ۱۹۷۷ء ص ۱۷۹ ۔

۲- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : نقوش شخصیات نمبر ، حصہ دوم ، مضمون ابو الخیر مودودی ، ص ۸۲۰ ۔

سے حضرت علامہ کی عقیدت کا ذکر تو ہم پہلے کر چکے ہیں ۔ حضرت بوعلی قلندرؒ کے ایک قلندرانہ واقعہ کا ذکر حضرت علامہ نے بڑے والہانہ انداز میں قلم بند کیا ہے ۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحبِ جلال درویش کتنی روحانی طاقت کا مالک ہوتا ہے وہ فردِ کامل بھی ہوتا ہے اور بحر و بر کا مالک بھی اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

با تو می گویم حدیثِ بوعلی	در سوادِ ہند نامِ او جلی
آں نوا پیرائے گلزارِ کہن	گفت با ما از گلِ رعنا سخن
خطہ ایں جنت آتش نژاد	از ہوائے دامنش مینو سواد
کوچک ابدالش سوئے بازار رفت	از شرابِ بو علی سرشار رفت
عامل آں شہر می آمد سوار	ہم رکابِ او غلام و چوبدار
پیش رو زد بانگ اے ناہوش‌مند	بر جلو دارانِ عامل رہ مبند
رفت آں درویش سرافگندہ پیش	غوطہ زن اندریمِ افکارِ خویش
چوبدار از جامِ اشک بار مست	برسرِ درویش چوبِ خود شکست
از رہِ عامل فقیر آزردہ رفت	دل گران و ناخوش و افسردہ رفت
در حضورِ بوعلی فریاد کرد	اشک از زندانِ چشم آزاد کرد
صورت برقے کہ برکہسار ریخت	شیخؒ سیل آتش گفتار ریخت
از رگِ جاں آتشِ دیگر کشود	با دبیرِ خویش ارشادے نمود
خامہ را برگیر و فرمانے نویس	از فقیرِ سوئے سلطانے نویس
بندہ ام را عاملت برسرزدہ است	بر متاعِ جانِ خود اخگر زدہ‌است
باز گیر ایں عامل بد گوہرے	ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے
نامۂ آں بندۂ حق دست گاہ	لرزہ ہا انداخت در اندام شاہ
پیکرش سرمایۂ آلام گشت	زرد مثلِ آفتابِ شامِ گشت
بہر عامل حلقۂ زنجیر جست	از قلندر عفوِ ایں تقصیر جست[1]

حضرت علامہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں خواجہ الطاف حسین حالی کی صد سالہ برسی کے موقع پر پانی پت تشریف لے گئے تو حضرت بوعلی قلندر کی درگاہِ عالیہ پر بھی حاضر ہوئے ۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں :

۱۔ کلیات اقبال حصہ فارسی ، اسرار و رموز ، ۲۵ تا ۲۷ ۔

''پانی پت میں حضرت علامہ کا قیام دو روز رہا ، انہوں نے تقریب میں شرکت فرمائی ۔ حضرت شاہ بوعلی قلندر کے مزار پر عقیدت مندانہ حاضری دی ۔'' مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی ، کراچی ، ۱۹۵۷ء ، ص ۳۰۱ ۔

اس مثنوی کا خاص موضوع فلسفۂ خودی ہے اور فلسفہ بھی بنیادی طور پر اولیاء کرام کی تعلیمات ہی سے ماخوذ ہے اور حضرت علامہؒ تو خاص طور پر حضرت بوعلی قلندر کے درج ذیل اشعار سے متاثر ہیں :

خود شناسی در جہان عرفاں بود
عارفِ خود عارفِ سبحاں بود
کشف دانی چیست ؟ عالی ہمتی
مرد رہ لبود بہ جز زورِ خودی
صوفیاں چوں عارفِ خویش ؟ آمدند[1]
در خودیٔ خویشتن ؟ پیش آمدند

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ قادریہ کے ایک عظیم بزرگ تھے ، شاہ جہانگیر ، شاہ جہان ، اورنگ زیب عالمگیر اور دارا شکوہ وغیرہم آپ کے دربار پر انوار میں کسبِ فیض کے لیے حاضر ہوتے رہے ۔ آپ کا مزار مبارک کئی سو سال سے لاہور میں مرجع خاص و عام ہے ۔ حضرت علامہ آپ کے مزار پر انوار پر اکثر حاضر ہوتے ۔ مثنوی ''اسرار خودی'' میں آپ کا ذکر حضرت علامہ نے بڑی محبت ، عقیدت اور خلوص سے کیا ہے ۔ چند اشعار یہ ہیں :

حضرت شیخ میاں میر ولیؒ ہر خفی از نور جان اوجلی
بر طریقِ مصطفٰی محکم پے نغمۂ عشق و محبت رائے
تربتش ایمان خاکِ شہرِ ما مشعلِ نورِ ہدایت بہرِ ما[2]

مندرجہ بالا مصرع : تربتش ایمان خاکِ شہرِ ما کے ساتھ ساتھ

۱۔ اقبال درونِ خانہ تالیف خالد نظیر صوفی ، لاہور ۱۹۷۱ء ، ص ۸۸ - ۸۹ ۔

۲۔ کلیات اقبال حصہ فارسی اسرار و رموز ص ۶۳ ۔

میں ان دنوں میوہسپتال میں ہاؤس سرجن تھا اور میرا یہ بچہ میوہسپتال کے ملحقہ کوارٹر میں پیدا ہوا ۔ بچے کی پیدائش صبح دو اور تین بجے کے درمیان ہوئی ۔ چنانچہ جب بچہ پیدا ہو گیا تو میں اُس لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ جس نے ڈیلوری کرائی تھی ، سائیکل اٹھا کر گھر سے باہر نکل آیا اور سیدھا میو روڈ پر واقع شاعر مشرق کی قیام گاہ جاوید منزل پہنچا ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی میں نے ڈرائننگ روم اور آپ کے کمرۂ خاص کے درمیانی دروازے میں قدم رکھا ہی تھا اور ابھی میں سلام بھی نہیں کہنے پایا تھا کہ حضرت علامہ جو بستر پر نیم دراز حقے سے شغل فرما رہے تھے بولے "مبارک ہو بچے کا نام مسیح الاسلام رکھنا ، اُسے ڈاکٹری کی تعلیم دلوانا اور سرکاری نوکری ہرگز نہ کروانا اور اُسے قرآن شریف ضرور حفظ کروانا" وہ تو اپنی دھن میں مجھے ہدایات دیتے رہے ، مگر میں وہیں کا وہیں حیران سا کھڑا اُن کا منہ دیکھتا رہا اور اُن کی عظیم شخصیت کا رعب مجھ پر اس قدر طاری ہوا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی نادیدہ طاقت میرا گلہ دبا رہی ہے ۔ علامہ مرحوم میری یہ حالت دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا : آؤ بھائی بیٹھو ڈرو نہیں ! ۔ ۔ ۔ ۔ چھ سات سال کی عمر میں میرا پہلا بچہ شدید بیمار ہو گیا ۔ اُن دنوں میں وزیر آباد کے ہسپتال میں متعین تھا جب دعا اور دوا دونوں بے اثر ثابت ہو گئیں اور بچے کی زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو میری بیوی کہنے لگی کہ یہ بچہ ہمیں حضرت علامہ کی دعا سے ملا تھا ۔ اس لیے اب بھی اُن ہی کے وسیلے سے اس کی جان بچ سکتی ہے ۔ چنانچہ میں اپنی بیوی کے مجبور کرنے پر اپنے بیمار بچے کو لے کر شاعر مشرق کی آخری آرامگاہ پر حاضر ہوا ۔ میری بیوی حضرت علامہ کے مرقد پر رو رو کر اس طرح التجائیں کرتی رہی جیسے اپنے سامنے موجود کسی شخص سے محو گفتگو ہو ، تھوڑی دیر بعد وہ بولی کہ حضرت علامہ نے کہا ہے کہ ہمارا بیٹا انشا اللہ تندرست ہو جائے گا ۔ اس کے بعد میری بیوی نے حکیم الامت کی قبر سے تھوڑی سی مٹی لی اور پانی میں گھول کر بچے کو پلا دی ، ہم نے تھوڑی سی مٹی ساتھ لی اور واپس وزیر آباد روانہ ہوگئے ، راستے میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے میری بیوی پانی میں گھول گھول کر بچے کو خاک مرقد دیتی رہی اور خدا کے فضل سے وزیر آباد پہنچنے تک ہمارا بچہ کافی حد تک

پیرِ تبریزی ز ارشادِ کمال
جستِ راہِ مکتبِ ملا جلال
گفت ایں غوغا و قیل و قال چیست
ایں قیاس و وہم و استدلال چیست
مولوی فرمود نادان لب بند
بر مقالاتِ خرد مندان مخند

پائے خویش از مکتبم بیروں گزار
قیل و قال است ایں ترا با وے چہ کار

قالِ ما از فہم تو بالا تر است
شیشۂ ادراک را روشن گر است

سوزِ شمس از گفتۂ ملا فزود
آتشے از جانِ تبریزی کشود
بر زمیں برقِ نگاہِ او افتاد
خاک از سوزِ دمِ او شعلہ زاد
آتشِ دل خرمنِ ادراک سوخت
دفترِ آں فلسفی را پاک سوخت
مولوی بیگانہ از اعجازِ عشق
نا شناسِ نغمہ ہائے سازِ عشق
گفت ایں آتش چساں افروختی
دفترِ اربابِ حکمت سوختی
گفت شیخ اے مسلمِ زنار دار
ذوق و حال است ایں، ترا با وے چہ کار
حالِ ما از فکرِ تو بالا تر است
شعلۂ ما کیمیائے احمر است
ساختی از برفِ حکمت ساز و برگ
از سحابِ فکرِ تو بارد تگرگ

آتشے افروز از خاشاکِ خویش
شعلہ تعمیر کن از خاکِ خویش
علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است
معنئ اسلام ترکِ آفل است
چون زبندِ آفل ابراہیمؑ رست
درمیانِ شعلہ ہا نیکو نشست[1]

اس دل پذیر حکایت کو حضرت علامہؒ کے پیر بھائی (خواجہ تاش) چوہدری غلام غوث صمدانیؒ (۱۹۷۲:۰۰۰م) نے بھی اپنی تصنیف ''مثنوی صمدانی'' میں بڑے دل آویز طریقے سے قلم بند کیا ہے جس میں مولانا رومؒ کے سوالات اور حضرت شمس تبریزیؒ کے جوابات کو پورے سنتالیس صفحات پر پھیلا دیا ہے اور ان سوالات و جوابات میں شریعت اور طریقت کے جملہ اسرار و معارف کو پوری وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہتے ہیں وہ ''مثنوی صمدانی'' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۳ء کے صفحات ۱۸۹ تا ۲۳۶ کا مطالعہ کریں۔ سردست اس دل نشین حکایت کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں :

رومی :

گفت حیران ماندہ ام از ہستیت تو کدامی؟ وز کجا این مستیت
اے دل من می ربائی! کیتی؟ بندۂ! شانِ خدائی چیستی؟
اے کہ تو خوش پیکری مشکل کشا
از کرم سوئے خود را بے نما

تبریزی :

گفت از تبریزم و شمش است نام
دینِ فطرت دینم و قرآن کلام
ہست در کشکولِ من جنسِ ثمیں
فلیؤد گفت قرآن مبین
جستجوئے ہم نوا دارم بسے
تا سپارم سوزِ دل با کسے

۱- کلیات اقبال حصہ فارسی اسرار و رموز ص ۶۷ - ۶۸

رومی :

اے بہ ہوشِ من نگاہت برق بار
رفتہ از دستم عنانِ اختیار
شد قدوم تو ، معما بہرِ من
تو کجا ، آخر کجا این شہرِ من
این جمال تو برد از رہ مرا
کن ز علمِ خویشتن آگہ مرا

تبریزی :

علمِ محسوسات رو بد از دماغ
علم مرئیات را باید چراغ
شورِ قیل و قال اندر مدرسہ
منطق و بحث و جدال و فلسفہ
علم حسی خود نگر خود پرور است
خود نما ، خود سر ، حجابِ اکبر است
بس کہ باشد پردۂ دل این حجاب
می برد از راہ چون موجِ سراب
خانقاہ و مکتب از جنسِ غرور
طالبانِ حق ز ہر باطل نفور
صد کتاب و صد ورق در نار کن
جان و دل را جانب دلدار کن
شب خراما ! نورِ روز از من بہ گیر
ساز داری ، لطفِ سوز از من بہ گیر
فاش تر گویم منم مامورِ عشق
تا بیاموزم ترا دستورِ عشق

رومی :

پارہ پارہ خواندہ ام ، ام الکتاب
من ندیدم لفظِ عشق اندر قصاب

تبریزی :

اے پرستارِ بتِ پندارِ علم
زیب بخشِ جبہ و دستارِ علم
عشق لفظے نیست بل حال است این
ہاں بہ حواں قرآن بہ چشمِ ژوف بین
تو فقط الفاظِ قرآن خواندہ
بر کنارِ بحرِ معنی ماندہ
عشق را خواہی اگر شرح و بیان
تو بہ چشم عاشقان قرآن بہ خوان
عشق را بے عشق فہمیدن محال
ہر مؤذن نیست ہم رازِ بلال[۱]

(۷)

حضرت علامہ اقبالؒ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ جس زمانے سے اُن کا تعلق ہے ۔ اُس زمانے میں برصغیر پاک و ہند میں جگہ جگہ علم و فضل اور شریعت و طریقت کے آفتاب و ماہتاب روشن تھے اور اپنی اپنی ضیاء پاشیوں سے طالبانِ حق کو منور اور مستفید کر رہے تھے۔ اپنے دور کی علمی و روحانی فضا کے بارے میں حضرت علامہؒ ایک جگہ خود فرماتے ہیں :

''گزشتہ رات میرے ہاں بہت سے احباب کا مجمع تھا ، مسلمانانِ ہندوستان کی عام روحانیت کا ذکر تھا اور بہت سے احباب مسلمانوں کے موجودہ انحطاط سے متاثر ہو کر ان سے مایوسی کا اظہار کر رہے تھے ۔ اس سلسلے میں مَیں نے ریمارک کیا کہ جس قوم سے خواجہ سلیمان تونسویؒ شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادیؒ اور خواجہ فرید چاچڑاں شریف والے اب اس زمانے میں پیدا ہو سکتے ہیں ۔ اس کی روحانیت کا خزانہ ابھی ختم نہیں ہوا ۔''[۲]

۱- ''مثنوی صمدانی'' تالیف چوہدری غلام غوث ، لاہور ۱۹۵۳ء، ص ۱۹۴ - ۲۰۳ -

۲- ''اقبال نامہ'' ، حصہ دوم ، مرتب شیخ عطاءاللہ لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۲۷۷ -

اس باب میں ہم حضرت علامہؒ کے معاصر مشائخ عظام اور اُن کے ساتھ حضرت علامہ کے مراسم و تعلقات کا ذکر کریں گے ۔ علامہؒ کے معاصر مشائخ میں سے وہ حضرات لیے گئے ہیں جو ۱۹۰۰ء میں یا اس کے بعد فوت ہوئے جب کہ حضرت علامہ کی عمر ۲۶ ، ۲۷ سال کی ہو چکی تھی یا وہ حضرات جو اُن کی وفات تک کافی مشہور ہو چکے تھے ۔ سب سے پہلے ہم عصر مشائخ عظام کے اسماء گرامی ملاحظہ ہوں ۔ اس کے بعد اُن سے حضرت علامہ کے تعلقات پر روشنی ڈالی جائے گی ۔ ملاحظہ ہو :

۱۔ حضرت خواجہ اللہ بخش ، تونسہ شریف (م ۱۹۰۱ء)

۲۔ حضرت خواجہ غلام فرید ، چاچڑاں شریف (م ۱۹۰۱ء)

۳۔ حضرت مولانا غلام مرتضیٰ ، بیربل شریف (م ۱۹۰۳ء)

۴۔ حضرت شاہ محمد حسین الہ آبادی ، الہ آباد (م ۱۹۰۴ء)

۵۔ حضرت حاجی وارث علی شاہ ، دیوہ شریف (م ۱۹۰۵ء)

۶۔ حضرت میاں محمد ، کھڑی شریف ، (م ۱۹۰۶ء)

۷۔ حضرت میاں شیر محمد ، پلی بھیت بھارت (م ۱۹۰۶ء)

۸۔ حضرت پیر حیدر شاہ ، جلال پور شریف (م ۱۹۰۸ء)

۹۔ حضرت مولانا عبدالمقتدر ، بدایوں شریف (م ۱۹۱۴ء)

۱۰۔ حضرت شاہ عبدالصمد فخری ، دہلی (م ۱۹۱۴ء)

۱۱۔ حضرت میاں محمد شاہ ، بسی شریف (م ۱۹۱۴ء)

۱۲۔ حضرت شاہ عبدالعلیم آسی ، جونپور (م ۱۹۱۷ء)

۱۳۔ حضرت شاہ سراج الحق ، دہلی (م ۱۹۱۸ء)

۱۴۔ حضرت قاضی سلطان محمود ، آوان شریف (م ۱۹۱۹ء)

۱۵۔ حضرت مولانا احمد رضا خان ، بریلی شریف (م ۱۹۲۱ء)

۱۶۔ حضرت شاہ ابوالخیر ، دہلی (م ۱۹۲۳ء)

۱۷۔ حضرت خواجہ عبدالرحمان ، چھوہر شریف (م ۱۹۲۳ء)

۱۸۔ حضرت سید غلام محی الدین نیازی ، بریلی شریف (م ۱۹۲۴ء)

۱۹- حضرت شاہ گل حسن قادری ، پانی پت (م لامعلوم)

۲۰- حضرت شاہ بدرالدین ، پھلواری شریف بھارت (م۱۹۲۴ء)

۲۱- حضرت مولانا عبدالباری ، فرنگی محل لکھنؤ (م ۱۹۲۴ء)

۲۲- حضرت میاں شیر محمد ، شرق پور (م ۱۹۲۸ء)

۲۳- حضرت خواجہ ضیاء الدین ، سیال شریف (م ۱۹۲۹ء)

۲۴- حضرت شاہ سلیمان ، پھلواری شریف (م ۱۹۳۵ء)

۲۵- حضرت شاہ علی حسین ، کچھوچھہ شریف ، بھارت (م ۱۹۳۶ء)

۲۶- حضرت پیر مہر علی شاہ ، گولڑہ شریف (م ۱۹۳۷ء)

۲۷- حضرت پیر جماعت علی شاہ ثانی ، علی پور شریف (م ۱۹۳۹ء)

۲۸- حضرت مولانا قطب الدین عبدالوالی ، فرنگی محل ، لکھنؤ (۱۹۵۴ء)

۲۹- حضرت خواجہ حسن نظامی ، دہلی (م ۱۹۵۵ء)

۳۰- حافظ جماعت علی شاہ ، علی پور شریف (م ۱۹۵۱ء)

۳۱- حضرت پیر غلام مجدد سرہندی ، حیدرآباد سندھ (م ۱۹۵۷ء)

۳۲- حضرت مولانا الیاس برنی ، حیدرآباد دکن (م ۱۹۵۹ء)

۳۳- حضرت مولانا عبدالقدیر ، بدایوں شریف (م ۱۹۶۰ء)

۳۴- حضرت خواجہ نظام الدین ، تونسہ شریف (م ۱۹۶۵ء)

۳۵- حضرت پیر فضل شاہ ، جلال پور شریف (۱۹۶۶ء)

۳۶- حضرت میاں علی محمد ، بسی شریف بھارت (۱۹۷۵ء)

۳۷- حضرت صاحب زادہ محبوب عالم ، آوان شریف (م ۱۹۸۲ء)

۳۸- مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ ، جمال دین والی (زندہ)

۳۹- حضرت مولانا تاج الدین ، ناگ پور (م ۱۹۲۵ء)

اب مشائخ عظام کے ساتھ حضرت علامہ کے تعلقات اور مشائخ کے بارے میں اُن کے تاثرات ملاحظہ ہوں :

"حضرت شاہ گل حسن قادری "تذکرۂ غوثیہ" کے مصنف ہونے کی حیثیت سے بقائے دوام اور شہرت عام کے دربار میں ممتاز ترین مسند پر فائز ہیں وہ اوائل عمر میں سوات بنیر کے مشہور صوفی حضرت اخوند عبدالغفور (م ۱۸۷۷ء) کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔[1] اس کے بعد حضرت شاہ غوث علی قلندر پانی پتی سے تجدید بیعت کی اور مدت دراز تک اُن کے شرف صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ مرشد کی وفات کے بعد اُن حالات و ملفوظات کو "تذکرۂ غوثیہ" کے نام سے مرتب کیا۔ تذکرہ کا شمار اردو کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ شاہ صاحب صرف صاحب طرز ادیب ہی نہیں تھے بلکہ ایک مرشد کامل بھی تھے اور لاکھوں افراد نے اُن کی روحانیت اور روشن ضمیری سے فیض اُٹھایا۔ حضرت علامہ بھی اس درویش باصفا کی زیارت اور ملاقات کے بڑے متمنی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنے دوست مرزا جلال الدین سے سنا کہ شاہ صاحب امرتسر تشریف لائے ہوئے ہیں تو وہ مرزا جلال الدین اور نواب ذوالفقار علی خان اکٹھے امرتسر گئے اور شاہ صاحب کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضرت علامہ کی اس حاضری کا ذکر مرزا جلال الدین نے بڑی تفصیل سے اپنے ایک مضمون "میرا اقبال" میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

"حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انہیں (اقبال) کو جو وابستگی تھی۔ اسی کی وجہ سے انہیں اولیائے کرام سے بھی خاص عقیدت تھی اور وہ اُن کے مزارات پر اکثر حاضر ہوا کرتے۔ لاہور میں حضرت علی ہجویری اور شاہ محمد غوث کے مزارات پر اکثر جاتے اور اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار فرماتے۔ ایک مرتبہ پانی پت کے چند اشخاص نے مجھے اپنے مقدمہ میں وکیل کیا۔ یہ اصحاب حضرت خواجہ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے سجادہ نشین سید گل حسن شاہ مصنف "تذکرۂ غوثیہ" کے مرید تھے۔ اُس زمانے میں شاہ صاحب کی روحانیت کا بہت شہرہ تھا، میرے مؤکل جب لوٹنے لگے تو میں نے شاہ صاحب کو سلام بھیجا اور کہا کہ کبھی پانی پت کی طرف آنے کا موقع ملا تو ضرور حاضر خدمت ہوں گا۔

۱۔ "تذکرۂ غوثیہ" تالیف شاہ گل حسن قادری پانی پت ۱۹۵۳ء، ص ۳۶۰۔

دو تین ماہ بعد اچانک ایک دن انہی اصحاب میں سے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے لو شاہ صاحب خود ہی تشریف لے آئے ہیں اور ان دنوں وہ امرتسر میں مقیم ہیں ، اگر تم اُن سے ملنا چاہو تو میرے ساتھ چلو میں نے شاہ صاحب کے جائے قیام کا پتہ دریافت کر کے انہیں تو رخصت کیا اور خود ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچا ۔ وہ بھی چلنے کو تیار ہو گئے ۔ اتنے میں سر ذوالفقار علی خان تشریف لے آئے اور ہم تینوں ٹرین پر سوار ہو کر امرتسر پہنچے ۔ راستے میں یہ طے پایا کہ شاہ صاحب پر سر اقبال اور سر ذوالفقار کی شخصیت کا اظہار نہ کیا جائے ۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ دیکھنا مطلوب تھا کہ آیا شاہ صاحب بھی اپنے کشف سے اُن کی شخصیت کو تاڑ لیتے ہیں یا نہیں ۔ ہم شاہ صاحب کے پاس پہنچے تو میرے مؤکلوں میں سے ایک نے میرا تعارف کرایا اور میں نے اپنے رفقاء کو شیخ صاحب اور خان صاحب کے مختصر ناموں کے ساتھ پیش کیا ۔ دوران گفتگو میں شاہ صاحب نے دریافت کیا کہ آپ میں سے کوئی صاحب شعر بھی کہتے ہیں ۔ یہ سوال اپنی تمام تر سادگی کے باوجود ہمارے لیے حد درجہ اہم تھا ۔ اس لیے نواب صاحب اور میں کنکھیوں سے اقبال کی طرف دیکھنے لگے ۔ نواب صاحب نے ٹال دینے کی نیت سے جواب دیا کہ ہم بھی اہل پنجاب کی ادبی روایات کے تھوڑے بہت حامل ضرور ہیں مگر شاہ صاحب اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے ۔ کہنے لگے جس طرح پھول کی خوشبو خود بخود انسان کے دماغ تک پہنچ جاتی ہے ۔ مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا ہے ۔ گویا آپ میں سے کوئی صاحب شاعر ضرور ہیں ۔

اتنے میں اندر سے کسی کی آواز آئی ''ارے یہ کہیں ذوالفقار تو نہیں بول رہے نواب صاحب حیران ہو گئے کہ اُن کا راز کیسے کھل گیا ۔ معلوم ہوا راجہ ــــ تعلقہ دار یو ۔ پی جو شاہ صاحب کے مرید تھے اور نواب صاحب کے دوست تھے ، اپنے علاج کے سلسلے میں اپنے پیر صاحب کے ہمراہ امرتسر آئے ہوئے تھے ، اندر لیٹے ہیں ، انہوں نے نواب صاحب کی آواز فوراً پہچان لی اور نواب صاحب کا راز طشت از بام کر دیا ، اب میرے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں نے پشیمانی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا نام شاہ صاحب کو بتایا ۔ ڈاکٹر صاحب کا نام سن کر مسکرانے لگے ۔ پھر بولے میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ میں سے یہی حضرت شاعر ہیں ۔ اس کے بعد دیر تک ڈاکٹر صاحب کی نظموں کے متعلق

شاہ صاحب اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے ۔ ہم چلنے کی نیت سے اٹھنے لگے تو اقبال نے شاہ صاحب سے کہا کہ وہ عرصہ سے سنگِ گردہ کے مریض ہیں ۔ اُن کے لیے دعا کریں کہ انہیں اس شکایت سے نجات ملے ۔ شاہ صاحب کہنے لگے ۔ بہت اچھا ایجیے میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں آپ بھی ہاتھ اٹھائیں ۔ دعا کے بعد ہم نے اجازت لی اور لاہور کی ٹرین میں سوار ہو گئے ۔ راستے میں ڈاکٹر صاحب پیشاب کی نیت سے غسل خانے میں تشریف لے گئے ، واپس آئے تو اُن کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے آثار نظر آ رہے تھے ۔ کہنے لگے : عجب اتفاق ہوا ہے ۔ پیشاب کے دوران مجھے یوں محسوس ہوا گویا ایک چھوٹا سا سنگریزہ پیشاب کے ساتھ خارج ہو گیا ہے ۔ مجھے اس کے گرنے تک کی آواز سنائی دی اور اس کے خارج ہوتے ہی طبیعت کی ساری گرانی جاتی رہی ۔"[1]

حضرت میاں محمد مصنف "سیف الملوک" ، حضرت خواجہ غلام فرید اور حضرت حاجی وارث علی شاہؒ اور حضرت علامہ کے درمیان قدرِ مشترک "مسلکِ عشق" تھا یہ سب حضرات نہ صرف اس مسلک کے ترجمان اور مبلغ تھے بلکہ اسے روحِ ایمان اور جانِ ایمان بھی سمجھتے تھے ۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں :

ز رسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق
جز ایں کہ منکرِ عشق است کافر و زندیق[2]

میاں محمد اس سے بھی دو چار قدم آگے جاتے ہیں :

جنہاں عشق خرید نہ کیتا اینویں آ بگتے
عشقے باہجھ محمد بخشا کیا آدم کیا کتے

(سیف الملوک)

حضرت خواجہ غلام فرید کا دیوان تو بلا ریب "عشق کی انجیل" ہے ۔ ہر طرف عشق ہی عشق کار فرما ہے ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

۱۔ ملفوظاتِ اقبال مرتب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، لاہور ۱۹۷۷ ، ص ۹۸ - ۱۰۰ ۔

۲۔ زبورِ عجم ص ۱۶۰ ۔

وں عشق مچائی اگ سائیں ڈکھ سوز رچیا رگ رگ سائیں
(دیوانِ فرید)

ایک اور جگہ ارشادہوتا ہے :

عشق ہے ہادی برم نگر دا عشق ہے رہبر فقر دا
عشقوں حاصل ہے عرفان (دیوانِ فرید)

حضرت خواجہ فرید اور اُن کی لافانی شاعری کے بارے میں حضرت علامہ فرماتے ہیں :

''جس قوم میں فرید اور اُس کی شاعری موجود ہے اُس قوم میں عشق و محبت کا موجود نہ ہونا تعجب انگیز ہے ۔''[1]

حضرت حاجی وارث علی شاہ اپنے متوسلین اور متعلقین کو ہمیشہ یہی ہدایت فرماتے :

(الف) ''ہمارا مشرب عشق ہے ۔

(ب) عاشق وہ ہے جس کی کوئی سانس یادِ مطلوب سے خالی نہ ہو جائے ۔

(ج) عاشق کے عشقِ صادق کی علامت یہ ہے کہ ذکرِ یار کی کثرت ہو ۔

(د) جس کا عشق کامل ہوتا ہے اُس کا شوق فراق و وصال میں یکساں رہتا ہے ۔

(ہ) عاشق کا ایمان رضائے یار ہے ۔''[2]

قطب العارفین حضرت قاضی سلطان محمودؒ دربار آوان شریف ضلع گجرات سے تو حضرت علامہ سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے (جس کا تفصیلی ذکر ہم مقالہ کی ابتدا میں کر چکے ہیں) اور اپنی زندگی وہ کئی مرتبہ

۱۔ دیوانِ فرید مرتب مولوی عزیز الرحمان بہاول پور ۱۹۴۴ء، مقدمہ از طالوت ، ص ۴۷ ۔

۲۔ ''سعی الحارث فی ایمان الوارث'' ، تالیف ابراہیم شیدا ، دہلی ۱۹۳۹ء ، ص ۲۰۲ ، ۲۰۳ ۔

ضرور حصولِ فیض و برکات کے لیے مرشد کے حضور تشریف لے گئے ہوں گے لیکن اس سلسلہ میں ہمارے پاس سرِ دست معلومات نہیں ہیں ۔

ہاں حضرت قاضی کی وفات کے بعد انہیں تجدیدِ بیعت کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے لیے انہوں نے ناگپور بھارت کے ایک مجذوب بزرگ بابا تاج الدین اولیاء کی ذاتِ اقدس کا انتخاب بھی کر لیا ۔ بابا صاحب کا حلقۂ ارادت بہت وسیع تھا ۔ مولانا عبدالکریم المعروف بابا یوسف شاہ تاجی اور ایم ۔ ایم احمد ، سابق صدر شعبۂ فلسفہ کراچی یونیورسٹی جیسے فاضل حضرات اُن کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے ۔ اپنے دوست راجہ کشن پرشاد کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں :

''نوازش نامہ مع سفر نامہ ناگپور ملا ۔ میں نے اس چھوٹی سی کتاب کو بڑی مسرت سے پڑھا اور سرکار کی عقیدت سے دل کو ایک قسم کی روحانی بالیدگی حاصل ہوئی ۔ میرا قصد بھی اُن (مولانا تاج الدین ناگپوری) کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے ۔ بعض وجوہ سے تجدیدِ بیعت کی ضرورت پیش آئی ، سنتا ہوں کہ وہ مجذوب ہیں مگر آج کل زمانہ بھی مجاذیب کا ہے آج خواجہ حسن نظامی کو بھی خط لکھا ہے ۔ اگر وہ بھی ہم سفر ہو گئے تو مزید لطف رہے ۔''[1]

یہ بھی عجیب بات ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد حضرت علامہ کو مجذوبوں سے خاصی عقیدت ہو گئی تھی ۔ ۱۹۱۷ء میں لاہور کی ایک مجذوبہ کا بہت چرچا تھا ۔ مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں :

''آج کل لاہور میں سلطان کی سرائے میں ایک مجذوبہ نے بہت لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے ۔ کسی روز اُن کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے ۔ شاد کا پیغام بھی پہنچا دوں گا ۔''[2]

حضرت پیر حیدر شاہ جلال پوری عہدِ حاضر کے ممتاز ترین مشائخ میں سے تھے ۔ وہ سلسلہ چشتیہ میں حضرت خواجہ شمس الدین سے بیعت

۱۔ روحِ مکاتیبِ اقبال، مرتب محمد عبداللہ قریشی لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۷۰ ۔

۲۔ اقبال نامہ ، حصہ دوم مرتب شیخ عطاء اللہ ، لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۱۸۲ ۔

تھے ۔ ۱۹۲۳ء میں اُن کے سلسلہ کے ایک نامور ادیب ملک محمد الدین مرحوم سابق ایڈیٹر 'صوفی' پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات نے اُن کی مفصل سوانح عمری شائع کی ۔ اس سوانح عمری کے صفحہ ۱۱۰ کے سامنے علامہ اقبالؒ کے اُس قطعہ کا عکس درج ہے جس میں حضرت علامہ نے شاہ صاحب کے سنِ وفات کو نظم کیا ہے ۔ قطعہ اس طرح ہے :

ہر کہ بر خاکِ مزارِ پیر حیدر شاہ رفت
تربتِ او را امین جلوہ ہائے طور گفت
ہاتف از گردوں رسید و خاکِ او را بوسہ داد
گفتمش سالِ وفات او بگو "مغفور" گفت[1]

چونکہ شاہ صاحب جلال پوری سے حضرت علامہ کے کسی قسم کے عقیدت مندانہ تعلقات کا پتہ نہیں چلتا ۔ اس لیے ڈاکٹر عبدالغنی فرماتے ہیں :

"ہمیں معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ انہوں (علامہ اقبال) نے یہ منفرد قسم کا قطعہ تاریخ کیسے لکھا اور کب لکھا ۔"[2]

بات صرف اتنی ہے کہ ملک محمد الدین نے جب شاہ صاحب کے "سوانح" کا ڈول ڈالا تو انھوں نے اپنے تعلقات کی بنا پر مشاہیر شعراء سے شاہ صاحب کی وفات کے بارے میں سینکڑوں قطعات لکھوائے اور اُن میں سے چیدہ چیدہ کو حضرت کی سوانح عمری "ذکرِ حبیب" میں درج کیا ۔ مثال کے طور پر منشی محمد دین فوق مرحوم کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ جو ذکرِ حبیب کے صفحہ ۱۱۷ پر درج ہے ، وہ فوق صاحب کے مجموعہ کلام "کلامِ فوق" کے صفحہ ۱۷۵ پر چھپا ہوا ہے ۔ شروع میں فوق صاحب نے اس قطعہ کی شانِ نزول اس طرح بیان کی ہے :

"۱۳۲۶ھ میں حضرت پیر سید حیدر شاہ جلال پوری کا وصال ہوا ۔ فروری ۱۹۱۶ء میں ملک محمد الدین ایڈیٹر 'صوفی' پنڈی بہاؤ الدین نے جو حضرت مغفور کے مریدوں میں سے ہیں ، لکھا کہ میں حضرت مرحوم کے سوانح حیات لکھ رہا ہوں ۔ اُن کی وفات کا قطعہ تاریخ لکھ دو ۔ اُن کی

۱- ذکرِ حبیب مرتبہ ملک محمد الدین ۱۹۲۳ء ، ص ۱۱۱ ۔
۲- مجمع البحرین مرتب ڈاکٹر عبدالغنی ، ص ۳۰ ۔

فرمائش سے میں نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ لکھا جو اپریل ۱۹۱۶ء کے 'صوفی' میں چھپ چکا ہے :

اے پیر سید حیدر اے ذوالفقار حیدر
مجموعۂ کرامت تھی تیری زندگی بھی
تو تھا فروغِ دل ہا تو تھا قرارِ جان ہا
تو چل بسا تو رخصت اپنی ہوئی خوشی بھی
فیضِ کرم سے جس کے تھے تلخ کام شیریں
مغفور آج ہے وہ شیریں سخن ولی بھی[1]

۱۳۲۶ھ ۱۳۲۶ھ

''ذکرِ حبیب'' کے دیباچہ میں ملک محمد الدین خود بھی تحریر کرتے ہیں :

''میں ملک کے نامور شعراء کا بھی رہینِ منت ہوں جنھوں نے اپنے کلامِ بلاغت نظام سے مجھ کو ممتاز فرمایا ۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی اور خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی سے لے کر عام نغز گویان تک کے نتائج افکار کتاب کے اوراق میں درج ہیں ۔''[2]

اوپر کے ہر دو اقتباسات سے صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ شاہ صاحب کی سوانح عمری ''ذکرِ حبیب'' میں شامل بیشتر قطعات تاریخ ملک محمد الدین کا حق دوستی ادا کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں نہ کہ حضرت جلال پوری کی عقیدت کی بنا پر ۔ ہاں حضرت علامہ کے قطعہ کے حرف حرف سے وہ عقیدت و احترام جھلک رہا ہے جو انہیں اولیائے کرام سے تھا ۔

حضرت شاہ سلیمان پھلواروی عہد اقبال کے بلند پایہ عالمِ دین اور صوفی تھے ۔ ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت کے بعد ۱۹۱۶ء میں جب ناخوشگوار بحث چھڑ گئی تو حضرت علامہ نے شاہ سلیمان سے بھی رجوع کیا اور انہیں لکھا :

۱۔ ''کلامِ فوق'' تصنیف محمد دین فوق لاہور ۱۹۳۳ء، ص ۱۷۵۔
۲۔ ''ذکرِ حبیب'' مرتبہ ملک محمد الدین دیباچہ ، ص ح ۔

''شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کوئی بد ظنی نہیں بلکہ مجھے اُن سے محبت ہے ۔ میرے والد کو فتوحات اور فصوص سے کمال توغل رہا ہے اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان کا نام اور اُن کی تعلیم پڑنی شروع ہوئیں ۔ برسوں تک ان دونوں کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا ، گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی تاہم محفلِ درس میں ہر روز شریک ہوتا ، بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا ، میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی ۔ اس وقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت شیخ کی تعلیمات قرآن کے مطابق نہیں ہیں اور نہ کسی تاویل و تشریح سے اس کے مطابق ہو سکتی ہیں ۔ لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ میں نے شیخ کا مفہوم غلط سمجھا ہو ، کئی سالوں تک میرا یہی خیال رہا ہے کہ میں غلطی پر ہوں ، گو اب میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک قطعی نتیجے تک پہنچ گیا ہوں ۔ لیکن اس وقت بھی مجھے اپنے خیال کے لیے کوئی ضد نہیں ۔ اس واسطے بذریعہ عریضہ ہذا آپ کی خدمت میں ملتمس ہوں کہ از راہِ عنایت و مکرمت چند اشارات تطہیر فرما دیں ۔ میں ان اشارات کی روشنی میں فصوص اور فتوحات کو پھر دیکھوں گا اور اپنے علم و رائے میں مناسب ترمیم کر لوں گا ۔''[1]

حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی نہ صرف بلند مرتبت صوفی تھے بلکہ جید عالمِ دین بھی تھے ۔ منطق و فلسفہ پر مکمل عبور رکھتے تھے ، خصوصاً حضرت ابن عربی کے بارے میں تو وہ عالمِ اسلام میں سند کی حیثیت رکھتے تھے ۔

۱۹۳۳ء میں حضرت علامہ نے ارادہ کیا کہ یورپ میں جا کر وہ ابن عربی پر ایک لیکچر دیں ، ابنِ عربی کی تعلیمات اور فلسفہ کو سمجھنے کے لیے انہوں نے پیر صاحب سے رابطہ قائم کیا اور ایک مفصل خط اُن کی خدمت میں ارسال کیا جو حسب ذیل ہے :

۱۔ ''اقبال کے محبوب صوفیہ'' تالیف اعجاز الحق قدوسی ، لاہور ، ۱۹۸۲ء (بار دوم) ، ص ۵۱۷ ، ۵۱۸ ۔

"مخدوم و مکرم حضرت قبلہ - السلام علیکم !

اگرچہ زیارت اور استفادہ کا شوق مدت سے ہے ، تاہم اس سے پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا ، اب اس محرومی کی تلافی اس عریضہ کے کرتا ہوں ، گو مجھے اندیشہ ہے کہ اس خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے میں جناب کو زحمت ہوگی - بہرحال جناب کی وسعتِ اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیشِ نظر مقصد کے لیے ٹھکرایا جائے -

میں نے گزشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تقریر کی تھی جو وہاں کے ادا شناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی - اب پھر اُدھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے - نظر بایں حال چند امور دریافت طلب ہیں - جناب کے اخلاقِ کریمانہ سے بعید نہ ہوگا اگر ان سوالات کا جواب شافی مرحمت فرمایا جائے :

(۱) اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقتِ زماں کے متعلق کیا کہا ہے اور آئمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے -

(۲) یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں ، اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں -

(۳) حضراتِ صوفیہ میں سے اگر کسی بزرگ نے بھی حقیقت زماں پر بحث کی ہو تو اُن بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں - مولوی سید انور شاہ مرحوم و مغفور نے عراق کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا اُس کا نام تھا "فی درایۃ الزمان" جناب کو ضرور اس کا علم ہوگا - میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے مگر چوں کہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اس واسطے مزید روشنی کی ضرورت ہے -

میں نے سنا ہے کہ جناب نے درس و تدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا ہے - اس واسطے مجھے یہ عریضہ لکھنے میں تامل تھا ، لیکن چوں کہ مقصود خدمت اسلام ہے مجھے یقین ہے کہ اس تصدیق کے لیے جناب مجھے

معاف فرمائیں گے اور جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے ۔"[1]

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی کی ذات محتاج تعارف نہیں ۔ ۱۹۰۳ء میں اُن کے تعلقات حضرت علامہ سے قائم ہوئے جو اُن کی وفات تک قائم رہے ۔ اپنے تعلقات کی ابتدا خواجہ صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں :

"ڈاکٹر سر محمد اقبال سے میرا ملنا جلنا ۱۹۰۳ء سے تھا ۔ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام میں انہوں نے اپنی نظم خاص لحن سے پڑھی اور مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں نے اپنا عمامہ سر سے اتار کر اُن کو دے دیا اور کہا

تمہارے جام مے کی نذر میری پارسائی ہو

اراکین انجمن نے عمامہ نیلام کیا اور حکیم محمد اشرف آئی ڈاکٹر نے اُس کو خرید لیا ۔"[2]

۱۹۰۸ء میں مشائخ عظام کو منظم اور متحد کرنے کے لیے خواجہ صاحب نے ایک تنظیم بنام "حلقہ نظام المشائخ" قائم کی اور خواجہ صاحب نے اس تنظیم میں شامل ہونے کے لیے مشائخ عظام کے علاوہ برصغیر کے علماء ، فضلاء اور دردمند مسلمانوں سے بھی درخواست کی ۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی اپیل پر لبیک کہتے ہوئے تصوف سے دلچسپی رکھنے والے علم دوست حضرات کی کثیر تعداد نے اس تنظیم میں شرکت کی اور اس کے رکن بنے ۔ چند اہم نام ملاحظہ ہوں :

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد ، کلکتہ

(۲) نواب محمد مزمل خان ، علی گڑھ

(۳) محمد اقبال بیرسٹر ، لاہور

(۴) سید حسین شہید سہروردی ، کلکتہ

۱۔ "اقبال نامہ" (حصہ اول) مرتب شیخ عطاء اللہ ، لاہور ، ص ۲۴۴ تا ۴۴۴ ۔

۲۔ دیباچہ "پاکستان کے موجد اول ڈاکٹر محمد اقبال کے خطوط" مرتب حسن نظامی بحوالہ "معاصرین اقبال کی نظر میں" مرتب عبداللہ قریشی ، ص ۴۰۴ ۔

(۵) مولانا محمد علی بی۔ اے آکسن کوچہ لنگر خانہ، رام پور

(۶) عبداللہ المامون سہروردی، کلکتہ

(۷) حبیب الرحمان خان سہروردی، علی گڑھ

(۸) نواب سید امیر حسن، کلکتہ

(۹) خجستہ اختر بانو سہروردیہ، کلکتہ[۱] (والدہ حسین شہید سہروردی سابق وزیر اعظم پاکستان)

حلقۂ نظام المشائخ کی تشکیل اور اس کے اغراض و مقاصد کو خواجہ صاحب نے اپنی ایک تحریر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"۱۹۰۸ء کا ذکر ہے میں نے ملا واحدی، قاضی لطیف الدین پیر زادے درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور سید عطاءالدین پیر زادے درگاہ چراغ دہلی وغیرہ نے مل کر مشائخ صوفیہ کی خدمات کے لیے ایک جماعت قائم کی تھی۔ اس کا نام حلقہ نظام المشائخ رکھا گیا تھا اور دہلی کے بازار چتلی قبر میں نواب غلام نصیرالدین عرف نواب بدھن کے عالی شان مکان میں اس کی منزل گاہ قائم ہوئی۔ جہاں روزانہ دہلی کے نوجوان جمع ہو کر حلقے کے چار مقاصد پر تقریریں کرتے تھے، وہ چار مقاصد یہ تھے:

(۱) علمِ تصوف کی حفاظت اور اشاعت۔

(۲) مشائخِ صوفیہ کا اتحاد۔

(۳) عرسوں اور خانقاہوں کے اُن مراسم کی اصلاح جو شریعت اور طریقت کے خلاف ہوں۔

(۴) مشائخ کے سیاسی حقوق کا تحفظ بذریعہ مسلم لیگ۔

اسی سال میں نے حلقے کے مقاصد کی اشاعت کے لیے بنگال کا سفر کیا اور ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ مرحوم نے اس کام میں بہت مدد کی، سہروردی خاندان کے اکثر افراد اس کے رکن بنے، جون ۱۹۱۱ء میں میں نے حلقے کے مقاصد کی تبلیغ کے لیے حضرت مولانا سید امام الدین دیوان درگاہ اجمیر شریف کی تحریک سے ممالک اسلامیہ کا سفر

۱- ہفت روزہ منادی، دہلی ۱۶ جون ۱۹۴۶ء، ص ۶۔

گیا اور مصر، فلسطین، شام اور مدینہ منورہ کے مشائخ شاذلیہ، رفاعیہ وغیرہ میں حلقے کی تبلیغ کی، حضرت اکبر الہ آبادی اور حضرت مولانا محمد شاہ سلیمان پھلواروی کو اس حلقہ سے بہت دل چسپی اور ہمدردی تھی۔۱''

''حلقہ نظام المشائخ'' کی تنظیم میں شامل ہونے کی خواجہ صاحب نے حضرت علامہ کو دعوت دی تو جواباً فرمایا:

''حلقہ نظام المشائخ کے متعلق آج مسٹر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لاء سے سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ خدا کرے آپ کے کام میں ترقی ہو، مجھے بھی اپنے حلقۂ مشائخ کے ادنیٰ ملازمین میں تصور کیجیے۔ مجھے ذرا کاروبار کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو پھر عملی طور پر اس میں دلچسپی لینے کو حاضر ہوں، میری طرف سے مزار شریف پر بھی حاضر ہو کر عرض کیجیے۔۲''

سب سے دل چسپ اور عجیب بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی قائم کردہ یہ تنظیم چند سالوں کی ناگزیر وجوہات کی بنا پر ختم ہو گئی لیکن حضرت علامہ کے دردمند دل میں ہمیشہ کے لیے یہ خیال مستقل طور پر جاں گزیں ہو گیا کہ مشائخ عظام کی ایک نمائندہ تنظیم قائم ہونی چاہیے ۱۹۳۰ء-۱۹۳۱ء میں جب انھیں پیر زادگان دربار تونسہ شریف میں ایک جوہر قابل حضرت خواجہ نظام الدین کی شکل میں نظر آیا تو ان کی دیرینہ خواہش جاگ اٹھی اور انھوں نے خواجہ صاحب سے ان کے ایک عقیدت مند مولوی محمد صالح کی معرفت رابطہ قائم کیا اور انھیں مشائخ کی تنظیم کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ مولوی صالح کو ۱۸ اپریل ۱۹۳۱ء میں تحریر کرتے ہیں:

''فی الحال یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قدیم سجادوں کے نوجوان مالک ایک جگہ جمع ہو کر مشورہ کریں کہ کس طرح اُس درخت کی حفاظت کی جا سکتی ہے جو اُن کے بزرگوں کی کوشش سے پھلا پھولا تھا۔

۱۔ ''ماہنامہ نظام المشائخ'' کراچی، مئی ۱۹۵۲ء، ص ۱-۲۔
۲۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ دوم) مرتب شیخ عطاء اللہ ۱۹۵۱ء لاہور ص ۴۶۲۔

اب جو کچھ ہوگا نوجوان علماء و صوفیاء ہی سے ہوگا ۔ جن کے دلوں میں خدا نے احساسِ حفاظت ملی پیدا کر دیا ہے ۔ خواجہ صاحب (خواجہ نظام الدین) کی خدمت میں عرض کیجیے کہ وہ ایسے نوجوان سجادہ نشینوں کو ایک جگہ جمع کر لیں ۔ میں بھی وہاں حاضر ہو کر اُن کی مشورت میں مدد دوں گا ۔ یہ جلسہ فی الحال پرائیویٹ ہوگا ۔ میرے خیال میں ایسے نوجوانوں کی کافی تعداد ہے ۔ اُن کے نام دعوت جاری ہو اور اس پر اگر میرے دستخط کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں ۔''[۱]

۱۴ مئی ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں مزید تحریر فرماتے ہیں :

''آپ مہربانی کرکے بواپسی ڈاک دو باتوں کا جواب دیں ۔

(۱) خواجہ صاحب اور دیگر نوجوان سجادہ نشین کون سی تاریخ کو وہاں (پاکپٹن شریف) موجود ہوں گے ۔

(۲) اگر میں پاک پٹن حاضر نہ ہو سکا تو کیا اور کوئی موقع ہو سکتا ہے کہ میں ان سب سے ایک مقام پر مل سکوں اور اپنی معروضات ان کی خدمت میں پیش کر سکوں ۔ ان باتوں کا جواب فوراً ارسال فرمائیے ۔''[۲]

خواجہ صاحب کی کوشش سے نوجوان صوفیائے کرام کا اجتماع پاک پٹن میں ہوا ۔ لیکن حضرت علامہ بیماری کی وجہ سے اس اجتماع میں جو اُن ہی کی خواہش اور تحریک سے ہوا تھا ، شرکت نہ کر سکے جس کا انہیں ازحد افسوس ہوا ۔ مولوی محمد صالح کے نام ۷ جون ۱۹۳۱ء کے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں :

''معلوم ہوتا ہے آپ اور حضرت خواجہ میرے تار اور خط کو فراموش کر گئے یا ممکن ہے تار کا مطلب صحیح نہ سمجھا گیا ہو اور خط نہ ملا ہو ۔ میں نے تار اور خط دونوں میں لکھ دیا تھا کہ میں دردِ دندان میں مبتلا ہو گیا ہوں اور چار روز کی سخت تکلیف کے بعد دونوں دانت جو دکھتے تھے اُن کو اکھڑوا دیا گیا ۔ اگر یہ خط اور تار پہنچنے کے بعد بھی خواجہ صاحب نے بقول آپ کے میرے نہ آ سکنے کو برا محسوس کیا

۱۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ دوم) لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۳۸۴ ، ۳۸۵ ۔

۲۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ دوم) لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۳۸۹ ۔

تو مجھے تعجب بھی ہے اور افسوس بھی . . . باقی رہا مقصود جس کے لیے سفر کرنا تھا سو مجھے یہ لکھنے میں تامل نہیں کہ اس کا ایک پہلو سیاسی بھی ہے اور یہ اس وجہ سے کہ اسلام بحیثیت مذہب کے دین و سیاست کا جامع ہے ۔ میں نے جو حضرات مشائخ کو اس طرف متوجہ کرنے کا قصد کیا تھا وہ محض اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر تھا نہ اپنے نام و نمود کی خاطر ، خیال تھا کہ شاید اسی طریق سے نوجوان صوفیہ میں کہ اُن کے اقتدار کا دار و مدار بھی اسلام کی زندگی پر ہے ۔ کچھ حرارت پیدا ہو جائے اور وہ کلی نہیں تو جزاً اس کام میں شریک ہو جائیں ۔ خواجہ صاحب اگر اس تحریک میں شامل ہوں تو میرے عقیدے کی رو سے اُن کی سعادت ہے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ اس ساری تحریک کا سہرا اُن ہی کے سر رہے ۔''[1]

اُسی دور میں حضرت علامہ کے جلال دین والی ذی علم سادات گھرانے کے ایک نوجوان مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ دام ظلہ سے تعلقات قائم ہوئے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت گہرے اور مستحکم ہوتے گئے ۔ مخدوم الملک جب لاہور آتے تو حضرت علامہ کے پاس ٹھہرتے ۔ ۱۹۳۲ء میں حضرت علامہ کے محب گرامی سر عبدالقادر لندن سے لاہور تشریف لائے تو حضرت علامہ نے انہیں کھانے کی دعوت دی ۔ اس دعوت میں مخدوم الملک بھی مدعو تھے ۔ اس دعوت کا ذکر سر عبدالقادر نے بڑے دل چسپ انداز میں کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

''دو اور دوست بھی موجود تھے جو کھانے میں شرکت کے لیے مدعو تھے ۔ ایک تو چوہدری محمد حسین ایم ۔ اے جو اُس زمانے میں اُن کے معتمد رفیق تھے اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے صاحب زادے اور صاحب زادی کی نگرانی کے فرائض ادا کرتے رہے ، دوسرے صاحب ریاست بہاول پور کے ایک مشہور سادات خاندان کے رکن اور بڑے زمیندار اور بڑے رئیس تھے جن کا نام مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ ہے ۔ اُن سے میری ملاقات پہلے معمولی تھی ، مگر اُس دن یہ دیکھ کر کہ اقبال انہیں بہت پسند کرتے تھے اور وہ اقبال کے دلی مداح تھے ، میری اُن سے ملاقات

۱۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ دوم) لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۳۹۲ تا ۳۹۴ ۔

بڑھ گئی ، تھوڑی دیر میں کھانا آیا جس میں اقبال خود بھی شریک ہوئے اور کم از کم اُس وقت ایسی اچھی حالت میں تھے کہ کھانا بھی انہوں نے رغبت سے کھایا اور گفتگو بھی دوران طعام بہت دلچسپ ہوتی رہی ، طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں ، مخدوم الملک چوں کہ پیر زادے تھے اور اقبال مرحوم سے بہت عقیدت رکھتے تھے ۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ شیخ صاحب آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ اس زمانے کا قطب پنجاب میں کون ہے ۔ آپ ہی بتائیں ، انہوں نے کہا : میں تو سمجھتا ہوں کہ اقبال ہی قطب پنجاب ہیں ۔''[۱]

اپریل ۱۹۳۷ء میں مخدوم صاحب کی ملاقات حضرت علامہ سے ہوئی اور دسمبر ۱۹۳۷ء میں انہوں نے حج کی تیاریاں شروع کر دیں تو حضرت علامہ نے انہیں تحریر کیا :

''آپ کا خط آج صبح مل گیا ، الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں اور حج کی تیاریوں میں مصروف ۔ خدا تعالٰی آپ کو یہ سفر مبارک کرے اور اس کے فرشتوں کی رحمتیں آپ کے شریک حال ہوں ، کاش کہ میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا اور آپ کی صحبت کی برکت سے مستفیض ہوتا لیکن افسوس کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں ۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ و سلم کے روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جا سکوں ۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ و سلم کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے ۔ ''الطالح لی'' یعنی گنہگار میرے لیے ہے ، امید ہے کہ آپ اُس دربار میں پہنچ کر مجھے فراموش نہ فرمائیں گے ، باقی خدا تعالٰی کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔''[۲]

مخدم صاحب حج بیت اللہ سے واپس آئے تو حضرت علامہ نے انہیں مبارک باد کا خط لکھا :

''آپ کا تار گزشتہ رات کراچی سے ملا جس کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی ۔ میں آپ کی بہ خیریت واپسی پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور

۱۔ ماہنامہ ''مخزن'' لاہور ، اپریل ۱۹۵۰ء ، ۵۸ ، ۵۹ ۔

۲۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ اول) مرتب شیخ عطاء اللہ لاہور ۱۹۴۹ء ، ص ۲۲۸ ، ۲۲۹ ۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کا حج قبول فرمائے اور آپ کو اپنے دین کی محبت اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ و سلم کے عشق سے مالا مال فرمائے ۔ امید ہے کہ اس خط کے پہنچنے تک جلال دین والی میں پہنچ گئے ہوں گے ۔''[1]

بات یہ ہے کہ حضرت علامہ اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے اخلاف کی بے عملی اور بے حسی سے سخت نالاں تھے ۔ اور جب وہ ان گھرانوں سے متعلق کسی نوجوان میں علم و عمل کی صلاحیت پاتے تو بہت خوش ہوتے اور کوشش کرتے کہ وہ نوجوان اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر دین اسلام کی خدمت کرے اور قوم کی راہنمائی کرے ۔ ایسے نوجوانوں میں حضرت خواجہ نظام الدین دربار تونسہ شریف اور سید غلام میراں شاہ دربار جلال الدین والی (بہاول پور) نمایاں حیثیت کے مالک تھے ۔ چنانچہ علامہ نے ان نوجوانوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اپنے اسلاف کے زریں کارناموں کو دلیل راہ بنانے کا مشورہ دیا ۔ ایک خط میں حضرت علامہ مخدوم صاحب کو تحریر کرتے ہیں :

''آپ کے احباب اور مخلصین آپ سے اُس روحانیت کی بنا پر جو آپ نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پائی ہے ۔ بہت بڑی بڑی امیدیں رکھتے ہیں ۔ ان امیدوں میں ؔمیں بھی شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کو اس امر کی توفیق دے کہ آپ اپنی قوت ، ہمت ، رسوخ اور دولت و عظمت کو حقائق اسلام کی نشر و اشاعت میں صرف کریں ۔ اس تاریک زمانے میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ و سلم کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے ۔ افسوس کہ شمال مغربی ہندوستان میں جن بزرگوں نے علم اسلام بلند کیا اُن کی اولادیں دنیوی جاہ و منصب کے پیچھے پڑ کر تباہ ہوگئیں اور آج اُن سے زیادہ جاہل کوئی مسلمان مشکل سے ملے گا ، خدا تعالیٰ انہیں بزرگوں کی اولاد سے کسی کی روحانیت بیدار کر دے اور کلمۂ اسلام کے اعلاء پر مامور کرے ۔''[2]

یہ ہے حضرت علامہ کی صوفیائے عظّام سے عقیدت کی مختصر داستان ۔

۱۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ اول) مرتب شیخ عطاء اللہ ، ص ۲۳۲ ۔

۲۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ اول) ، ص ۲۳۱ ، ۲۳۲ ۔

اقبال اور استعمار

سمیع اللہ قریشی

اقبال نے بر صغیر کی غلامی کے ایام میں جب انگریز کی تہذیبی استعماری یلغار عروج پر تھی ، آنکھ کھولی ، اس وقت پورا بر صغیر استعمار کا براہ راست ہدف تھا ۔ مشرق پر اس کی حریص نظریں گڑی ہوئی تھیں اور یہ سب نتیجہ تھا مسلمان اقوام کے داخلی انتشار ، بے حسی اور سہل پسندی کا ۔ مسلمان اقوام خود اپنے ملی شعور کو مجروح کرنے پر تلی بیٹھی تھیں تعصب اور لسانی اور نسلی منافرت ان میں عام ہو چکی تھی ۔ وطنیت کا تصور اور تعصب فراواں تھا اور مذہب میں فقط ظاہر داری کے رویے کو فروغ حاصل تھا ۔ گویا پوری ملت اسلامیہ عالم پیری سے گزر رہی تھی ۔[1] اقبال نے یہ سب کچھ اپنی رگِ جاں میں محسوس کیا ۔ تہذیب مغرب کے اثرات اقبال کے سامنے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے ان کا گہرا مطالعہ کیا پھر ایک لائحہ عمل کے تحت جہاں تہذیبِ فرنگ پر بھر پور علمی انتقاد کیا وہاں مغرب زدہ مسلمان اقوام کو اس استعمار سے نپٹنے کی تعلیم بھی دی ۔ مشرق میں الحاد اور لادینیت کے اثرات نے مشرق کا وقار دگرگوں کرکے رکھ دیا تھا ۔ اقبال نے پہلے مرض کی تشخیص کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ قرونِ وسطیٰ کا تصوف ، قومیت اور ملحدانہ سوشلزم یاس زدہ انسانیت

۱- نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دیگری
تیرے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری

(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ارمغان حجاز ، ص ۶۸۰/۳۸)

کے دکھوں کا مداوا کسی طور نہیں کر سکتے ۔۱ اپنے آس پاس کی الٹ پلٹ اور تہذیبی اور سیاسی تغیر پذیری کو دیکھ کر عقیدے کی معنویت اور وقعت ان پر اور کھل گئی ۔۲

اقبال ان مسلم مفکرین میں سے ہیں جنہیں اس صدی کے آغاز ہی میں مغربی تہذیبی اور سیاسی خلفشار اور استعماری رویے کا تنقیدی اور غائر جائزہ لینے کا نہ صرف موقع ملا بلکہ اس میں انہیں ایسے محرکات نظر آئے جو اگر ایک طرف اقوامِ مشرق کے لیے تباہ کن تھے تو دوسری جانب خود مغرب کی تباہی پر بھی شاہد تھے ۔۳ انہیں اس بات کا اندازہ اپنے پہلے سفر اور قیام یورپ کے دوران ہی ہو گیا تھا ۔ چنانچہ آخری سفرِ یورپ مابیچ کے زمانے اور وفات تک انہیں مغرب کے تاجرانہ رویے اور استعمارانہ ذہنیت کے ساتھ ہی ساتھ اقوام مغرب کے استحصال ، ہوسِ زر اور حبِ جاہ کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کا پورا پورا موقع ملا ۔۴ پہلی جنگ عظیم کا تہذیبی اور سیاسی صلہ ان کے پیشِ نظر تھا جس میں انہیں سراسر سامان

۱۔ تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۱۸۹ ۔

۲۔ ''فی الحقیقت جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ آدمی کا عقیدہ ہے اس کی تہذیب اور اس کی تاریخی روایات ہیں ۔ میری نگاہوں میں یہ چیزیں اس قابل ہیں کہ جن کی خاطر آدمی کا جینا اور مرنا ہو نہ کہ زمین کا ٹکڑا جس کے ساتھ عارضی طور پر روح انسانی کا رابطہ ہو گیا ہو :
انگریزی تقاریر و خطبات (ترجمہ) ، ص ۵۶

۳۔ دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا!
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، ناپائیدار ہوگا
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، بانگ درا ، ص ۱۴۱/۱۴۱)

۴۔ عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، بال جبریل ، ص ۳۹۲/۱۰۰)

عبرت نظر آیا ۔۱ اپنے عہد کے تہذیبی اور سیاسی انقلابات اور بعض مغربی تحریکوں کے دور رس نتائج کو اقبال اچھی طرح بھانپ گئے تھے ۔ اس ساری اُلٹ پلٹ میں انہیں کرۂ ارض کے مشرق و مغرب دونوں خطوں کے خرابے پیش از وقت نظر آ رہے تھے انہیں دکھائی دے رہا تھا کہ مغرب کی طرف سے اٹھنے والے تہذیبی اور سیاسی استعمار کی آندھی مشرق کی معرفت اور مغرب کے رویے کی صداقت اور محنت ہر چیز کو ملیا میٹ کر کے رکھ دے گی ۔

عہد اقبال ہی مغربی تہذیبی اور سیاسی استعمار کے حوالے سے اقبال کے ملفوظات اور اس کی فکر پوری طرح کھل کر سامنے آ سکی یا نہیں ۔۲ اس میں اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ عصرِ اقبال ابھی جاری ہے اس لیے کہ افکارِ اقبال میں کئی بیتی ہوئی صدیوں اور آنے والے زمانوں کی روح دھڑکتی ہے ۔ چنانچہ اگر وہ کل مغرب کے تہذیبی اور سیاسی استعمار کے محاذ پر کھڑے مصروف جد و جہد نظر آتے تھے تو آج بھی اور آنے والی کل بھی وہ اس جد و جہد میں مصروف نظر آ رہے ہیں اور آتے رہیں گے ۔ اس بات میں ہرگز کوئی کلام نہیں کہ انسانیت کی معاشری ، معاشی ، تہذیبی اور سیاسی رہنمائی رفتہ رفتہ ایشیا کی طرف لوٹ رہی ہے اور ایشیا کا تشخص اب ملت بیضاء کے وجود کے ساتھ ہی مشروط ہے یعنی اسلام اور فقط اسلام کے ساتھ ۔ اقبال نے مغرب کی تہذیبی اور سیاسی استعمار کے خلاف اپنی فکری جد و جہد کا آغاز کرنے سے قبل مغرب کی تاریخ کا بھر پور مطالعہ کیا ہے اور پھر رہبانیت ، وطنیت ، کلیسائی نظام ، نسلیت اور قومیت کے ان تمام حربوں کے استعمال کی ایک مربوط ترجیح پیش کی ہے جنہیں مغرب نے اپنے ہاں آزمانے کے بعد ان کا

۱۔ گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگا رنگ
من بہ جز عبرت نگیرم از فرنگ
(کلیات اقبال ، حصہ فارسی ، جاوید نامہ ، ص ۷۲/۶۶۰)

۲۔ ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، بانگ درا ، ص ۲۶۵/۲۹۵)

ہدف مشرق کو اپنے مطالب کی بر آوری کے لیے بنایا ہے ۔[1]

اقبال نے یورپی تہذیب و تمدن کی اٹھان اور اس کے اُبال کو عین جوانی کے عالم میں دیکھا اور اس بات سے کسی طور انکار ممکن نہیں کہ حسن کا ایک وسیع تر احساس اقبال کو اپنے قیامِ یورپ ہی کے دوران میں نصیب ہوا لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ اس احساس کی تہہ میں وہ مغربی رویہ بھی انہیں نظر آ جاتا ہے جس میں انسان کی غمگساری کے

۱۔ ''سرزمینِ مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا ہے ۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسائی ایک وسیع حکومت ہوگی ۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اس کلیسا کی حکومت کے خلاف تھا ، اس کو کسی دلیوی نظامِ سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی کیونکہ اس قسم کا کوئی نظامِ سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا ۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی ۔ اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے تحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ مسیح کے عالمگیر نظامِ اخلاق کی بجائے مغرب میں ہر طرف بے شمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے اور لہٰذا ان کا حلقہ اثر بالکل محدود رہ جائے گا ۔ یہی وجہ ہے جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی ذلت سے ہوا اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہلِ مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمع نظر سے ہٹ کر جو تمام نوعِ انسان سے متعلق تھا ، اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں ۔ اس لئے تخیلِ حیات کے لیے انہیں کہیں زیادہ واقعی اور مرئی اساس مثلاً تصورِ وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامات کی شکل میں پیدا ہوا جنہوں نے جذبہ قومیت کے ماتحت پرورش پائی ۔ یعنی جن کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدۂ وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہے ۔''

خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ ، ۱۹۳۰ء

لیے کوئی جگہ نہیں۔[۱] واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے ہاں مغربی استعمار کے خلاف کوئی جزوی ذہنی رویہ مرتب نہیں ہوتا اس باب میں اُن کے ہاں ایک مکمل ذہنی ارتقاء پایا جاتا ہے جسے کسی ایک مسلم خطے یا مسلم قوم کے ساتھ محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا رویہ پورے مشرق میں ہونے والے مغربی تہذیبی اور سیاسی انقلاب کو محیط ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے دوسرے مسلم مفکرین سے بہت آگے ہیں۔ ان کے پورے فکری دفاعی نظام میں کسی ایک خطے یا کسی ایک قوم کے سیاسی رویے کے ساتھ زمانی مطابقت اگر ارادی ہے تو اتفاقی بھی ہے ورنہ فی الاصل ان کی سوچ پورے مشرق کے لیے ہے اور ان کا یہی فکری آفاقی رویہ ان کی جد و جہد کو دوام اور اثبات کی سند عطا کرتا ہے۔ وہ بر صغیر کے باشندے تھے لیکن برِ صغیر میں بھی مسلمانوں کی محض سیاسی یا اقتصادی جد و جہد ان کے نزدیک بے کار تھی وہ اسے بھی حفاظتِ تہذیبِ اسلامی کے ساتھ مشروط سمجھتے تھے۔ اسلام سے الگ رہ کر کوئی بھی جد و جہد ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اپنے ایک پیغام میں انہوں نے واضح طور پر کہا کہ جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور فسطائیت وغیرہ سب ملوکیت کے شاخسانے ہیں جنہوں نے روحِ انسانی کو یوں کچلا ہے کہ تاریخِ انسانیت کے تاریک ادوار بھی اس کی مثال پیش نہیں کرتے۔ یہ سب تسلط کی بھوک کے مختلف اظہار ہیں اور یہ ساری مغربی جد و جہد ایک استعماری جبر ہے جس نے کمزور اقوام پر اپنی حکومت کا جوا ڈال کر انہیں ان کے مذہب، اخلاق، تہذیب و ثقافت روایات اور ادب سے محروم کر دیا ہے۔ یہ استعمار ملوکیت کی جونک ہے جو برابر

۱- ہے گرمِ خرامِ موجِ دریا دریا سوئے بحر جادہ پیما
بادل کو ہوا اڑا رہی ہے شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے

لذت گیرِ وجود ہر شے سرمستِ مے نمود ہر شے
کوئی نہیں غمگسارِ انساں! کیا تلخ ہے روزگارِ انساں!

(کلیات اقبال، حصہ اردو، بانگ درا، ص ۱۲۷ - ۱۲۶)

مشرق کا خون چوس رہی ہے۔[1]

قیام یورپ کا زمانہ اقبال کی چشمِ بصیرت پوری طرح وا ہونے کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے جب انہوں نے مشرق اور مغرب کا تہذیبی موازنہ کیا اور اسلام کا رخِ کردار ان کے سامنے ایک معین شکل اختیار کر گیا۔ یہ درست ہے کہ اقبال کا براہِ راست خطاب ملت اسلامیہ ہی سے رہا مگر انہوں نے معذرتی لہجہ کبھی اختیار نہیں کیا بلکہ اسلام کو عالمی تحریک اور انسانی حوالے سے پیش کرنے کی سعی کی اور گویا اسلام کو ایسے ڈھب سے پیش کرکے مغربی تہذیبی اور سیاسی استعمار کا مقابلہ کیا۔ جس میں یہ پوری انسانیت کی واحد فلاح کی ضمانت بن جاتا ہے۔[2] جس کے

۱- یہ زائرانِ حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں!
غضب ہے یہ ''مرشدانِ خود بیں'' خدا تری قوم کو بچائے!
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں
(کلیات اقبال، حصہ اردو، بانگ درا، ص ۱۶۲)

۲- ''اگر عالمِ انسانیت کا مقصد اقوامِ متحدہ کا امن سلامتی اور ان کی موجودہ ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلامی کے کوئی دوسرا نظام ذہن میں نہیں آ سکتا کیونکہ قرآن سے میری سمجھ میں جو کچھ آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نظر کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔''

خط بجواب حسین احمد مدنی، روز نامہ احسان، مارچ ۱۹۲۸ء

''مجھے اس جماعت سے دلی ہمدردی ہے جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کرکے مجھے وہ کچھ عطا کیا ہے جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اس کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سر نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرمِ کار ہے۔'' ایضاً

نتیجے میں تعصب اور تنگ دائروں سے ابھرنے والے تضادات حق اور احترام کے نصب العین کے تابع ہو کر زائل ہو جاتے ہیں اور عالمگیر وفاداری سے مملو معاشرے کی تشکیل ممکن ہو جاتی ہے ۔ یہ نتیجہ اقبال کے فکری نظام میں ایک عقیدہ بلکہ ایک مسلمہ حقیقت کا درجہ رکھتا ہے ۔[۱] بر صغیر، بلکہ پورے مشرق کی زوال آمادگی جو اقبال کے سامنے مغربی تہذیبی اور سیاسی استعمار کو اقوام مشرق کے لیے مصائب کا سرچشمہ قرار دیا جس نے روح مشرق کو کچل کر رکھ دیا تھا ۔ یہی نہیں بلکہ اسے اظہار نفس کی اس مسرت سے بھی محروم کر دیا تھا جس کی بدولت کبھی اس میں ایک شاندار تہذیب پیدا ہوئی تھی ۔[۲] قیام یورپ نے مغرب کے جدید تمدن کا طلسم ان کی نظروں میں تار عنکبوت بنا کر رکھ دیا تھا ۔ وہ اس تنگ نظری اور تعصب سے اور خود غرضانہ رویے سے واقف ہوئے جسے مغربی استعمار نے تہذیب اور سیاست کے عنوان سے اپنے دامن میں چھپا رکھا تھا ۔ پہلی جنگ عظیم کے مابعد کی بربادی پورے مغرب کے لیے طعنہ بن جاتی ہے جس میں تہذیب اور سیاست کے نام پر وطنیت ، نسلیت اور نام نہاد مساوات اور بے روح صداقت کے پرخچے اڑ گئے ۔ اس جنگ کی مابعدیات اپنے ساتھ سرمایہ داری اور استبداد لے کر آئیں اور یہ سارا کچھ پوری انسانیت کے لیے مغرب کے ہولناک تحائف تھے ۔

مغربی تہذیبی استعمار کی یلغار میں اقوام مشرق نے جو رعنائی دیکھی اقبال نے اس رعنائی کے باطن میں منافقت ، خود فروشی ، استبداد اور قیصریت کو دریافت کیا اور نفسانیت اور انانیت محض کو محسوس کیا مگر ان کی فکر میں یہ بات محض احساس کی حد تک ہی نہ رہی بلکہ اپنے فکری استحکام کے بل پر اقبال نے اس استعمار کے خلاف ایک باقاعدہ جہاد کا آغاز

۱۔ خطبۂ صدارت ، مسلم لیگ الہ آباد ۱۹۳۰ء ۔

۲۔ "ایک سبق جو میں نے اونچے اسلام سے سیکھا ہے ۔ یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ۔ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی ۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو مجتمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا ۔"

گیا ۔[1] یورپ میں اقبال وطنیت کے جذبے سے سرشار گئے تھے یہ وطنیت اس شجرِ استعمار کی ایک شاخ تھی جسے فرنگی مقامروں نے مشرق کی سر زمین میں کاشت کیا تھا لیکن جب اقبال کو یورپ مغرب میں مادہ پرستی، دہریت اور زر پرستی نظر آئی تو استعماری وطنیت کا مفہوم ان پر کھل گیا اور وہ خوب سمجھ گئے کہ مغرب میں وطنیت سے مراد بین الملّی تنازعات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔ پھر تہذیب نوی کے تراشیدہ اس بت سے انہیں نفرت ہو گئی ۔ انہوں نے مسلمان کی تعریف صرف مصطفوی ہونا اور اس کا دیس فقط اسلام کو قرار دیا اور مسلمانوں کے لیے یہ تجویز کیا کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے اس بت کو خاک میں ملا دیں اگر یہ قائم رہتا ہے

۱۔ ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر!
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر!
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر!
(کلیات اقبال، حصہ اردو ۔ بانگ درا، ص ۲۶۵)

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!
(کلیات اقبال، حصہ اردو، بانگ درا، ص ۲۴۸)

تو قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے ۔[۱] وطنیت جہاں جہاں بھی مشرق میں مغربی استعماراتہ حکمتِ عملی کے تحت آئی اس نے اقوام مشرق کو شدید نقصان پہنچایا جو آگے چل کر اقتصادی انحطاط کا باعث بھی بنا ۔ خود مغرب میں بھی اس کے نتائج کچھ مختلف نہ تھے ۔ وطنیت کے مکروہ رویے نے ہی اقبال کو مغربی استعمار کے ایک اور حربے، سرمایہ داری سے بھی متنفر کر دیا جو اسلام کی روح کے بھی خلاف تھا اگرچہ سرمایہ داری کے خلاف یہ رجحان خود مغرب کے ایک حصے میں پیدا ہوا لیکن وہ اس قدر شدید تھا کہ حدِ اعتدال سے آگے نکل گیا اور اشتراکیت میں ڈھل گیا ۔ اقبال کے ہاں اشتراکیت کے اس پہلو کے لیے بہر حال ایک نرم گوشہ موجود ہے ۔[۲] جس کا تعلق انسان دوستی یا فلاحِ انسانیت سے ہے اگرچہ اس کی مذہب بیزاری اور دہریت سے انہوں نے کبھی کوئی واسطہ نہ رکھا اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کے ہر عہد میں اقبال کی متاعِ عزیز رہا ہے چنانچہ اشتراکیت کے لیے بھی جو ہر چند اپنی بعض صورتوں میں مغربی استعمار ہی کی ایک شکل ہے اقبال نے صرف اس حد تک استحسانی رویہ روا رکھا جس کا تعلق فلاح انسانی سے تھا ۔ سود جس پر سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہے اس کی نفی کرتے ہوئے اقبال نے اسلام اور

۱- اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، بانگ درا ، ص ۱۶۲-۱۶۱)

۲- قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمئی گفتار!
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ص ۱۳۶/۵۹۸)

اشتراکیت کے تعلق کو واضح کر دیا ہے ۔[۱] مزدور کا جو حشر زر دار کے ہاتھوں ہو رہا تھا وہ مغربی استعماری ذہنیت کا ایک مکروہ اظہار تھا جس کے خلاف اپنے عہد کے مشرقی شعراء میں سے صرف اقبال کو حرفِ حق کہنا نصیب ہوا ۔ اقبال کی نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' ، اس کی بہترین مثال ہے ۔ یہ نظم مغربی مدنیت کے بھیانک چہرے سے پردہ اٹھانے کے مترادف ہے ۔ اقبال مغربی استعمار کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک حد تک اشتراکیت کے ساتھ چلتے ہیں مگر وہ اعمال کے جائزے کے بعد انسانوں میں صحت عمل کی بنیاد امتیاز کے قائل بھی ہیں اور محض مساوات شکم کو معاشری ہیئت کے لیے امن کی بنیاد ہرگز نہیں مانتے ۔ مارکس جو اشتراکیت کا فکری منبع ہے ۔ اس کے احترام کے باوجود اقبال کو اس سے اختلاف بھی ہے اور وہ اس کی مساواتِ شکم کے تصور کو رد کرتے ہیں ۔ آگے چل کر وہ اشتراکی آمرانہ رویے کی بھی نفی کرتے ہیں جس میں زمامِ کار بے شک مزدور کے ہاتھ میں چلی جائے لیکن اُن کے نزدیک یہ بھی ایک طرح سے پرویزی حیلہ ہے ۔[۲]

۱۔ چیست قرآن ؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دست گیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردک زر کش مجو
لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا

۲۔ از ربا آخر چہ می زاید فتن
کس نہ داند لذت قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندۂ بے دندان و چنگ !

(کلیات اقبال ، حصہ فارسی ، جاوید نامہ ، ص ۶۶۸/۸۰)

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا !
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی !
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، بال جبریل ، ص ۳۳۲/۴۰)

جہاں تک مغربی استعماریت کی ایک شاخ فسطائیت کا تعلق ہے "ضرب کلیم" میں اقبال نے مسولینی کی زبان سے یورپ کے سیاسی مدبرین کو جو کچھ کہلوایا ہے وہ اس بات کی شہادت ہے کہ اقبال نے فسطائی وطنیت کو ہرگز کلمۂ خیر سے یاد نہیں کیا بلکہ ایک طنز کے پیرائے میں اسے بھی مغربی استعمار ہی کی ایک مکروہ شکل تسلیم کیا ہے۔ مسولینی کی زبان سے اقبال مغربی استعمار کو پردۂ تہذیب میں غارت گری اور آدم کشی قرار دیتے ہیں۔[1] مغربی استعمار اپنے ساتھ اقوام مشرق کے لیے سیاسی حوالے سے ایک اہم سوغات جمہوریت کے نام سے بھی لے کر آیا اور یہ ایک ایسا سیاسی فلسفہ ہے جو بظاہر خوبصورت بھی ہے لیکن جمہوریت کے حوالے سے اپنی زر داری کے بل پر سریر آرائے حکومت علی العموم سرمایہ دار یا زمیندار ہی منتخب ہوتے ہیں۔ حکومت بظاہر اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے لیکن فی الحقیقت ایک مختصر گروہ اکثریت پر حکومت کرتا ہے۔ اقبال نے جس استعماری طرزِ جمہوری سے گریز کا سبق دیا وہ در حقیقت یہی جمہوری، استبداد یا مغزِ دو صد خر کی حکمرانی ہے۔[2] اس سیاسی نظام

۱۔ میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج!
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے، مگر باقی نہ راجہ ہے، نہ راج
آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں! تم نے لوٹے تخت و تاج!
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج!

(کلیات اقبال، حصہ اردو، ضرب کلیم، ص ۶۱۲/۱۵۰)

۲۔ گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکر انسانی نمی آید

میں بظاہر مجلس آئین ، اصلاح و رعایات و حقوق کی بات ہوتی ہے لیکن اقبال مغربی جمہوری نظام کو راگ قیصری شمار کرتے ہیں -۱ ان کا اپنا عقیدہ اس بات میں روسو کے قریب قریب ہے یعنی یہ کہ جمہوریت بے شک ایک اچھا سیاسی فلسفہ ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسے ایسی جگہ عمل میں لایا جائے جہاں عوام کا سیاسی شعور اپنے معراج پر ہو ۔ اقبال معاشرے میں انسان کی قدر و قیمت اسے گن کو نہیں بلکہ اس کے عملی پایہ کو دیکھ اور پرکھ کر متعین کرتے ہیں اور مغربی جمہوریت کے مقابلے میں انسان کی رائے کا یہی معیار پیش کرتے ہیں جس چیز کو اقبال سلطانیٔ جمہور کا نام دے کر اس کو مشرق میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں اس کا مغربی سیاسی جمہوری فلسفے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کی بنیاد سراسر تعلیمات اسلامی پر ہے ۔

اقبال کی زندگی میں ہی اقوام مغرب نے جمعیت اقوام کی داغ بیل ڈالی اور اسے اس طرح تشکیل دیا کہ اس میں بظاہر اقوام مشرق کو بھی جگہ دی گئی ۔ جہاں تک اس بین الاقوامی ادارے کے مقاصد کا تعلق تھا یہ ظاہری طور پر واقعی دلکش و دل پذیر تھے ۔ جنگ سے گریز ، امن عالم اور اتحاد کی ترقی ۔ عدل کا قیام اور انصاف کا احترام ، تنازعات کی مخلصانہ ثالثی ، یہی دل فریب باتیں جمعیت اقوام کے مقاصد عالیہ تھے لیکن اس کے سامنے مغربی اقوام نے ایشیائی و افریقی اور بعض یورپی غریب

۱- ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری !

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، بانگ درا ، ص ۲۶۱-۲۶۲)

قوموں کے ساتھ قاہریت کے مظاہرے کئے اور اس جمعیت کے مقاصد کو کھلم کھلا پامال کیا ، لیکن مغربی استعماری ذہنیت رکھنے والی اقوام جو اس مجلس پر چھائی ہوئی تھیں ، انہوں نے اس کے ضمیر کو بیدار نہیں ہونے دیا ۔ ان قوموں نے تخفیفِ اسلحہ کی قرار دادیں بھی منظور کیں اور ساتھ ہی ساتھ اسلحہ کے انبار بھی لگا دیئے ۔ اقبال نے دیکھ لیا تھا کہ یہ جمعیت ایمان کی دولت سے محروم ہے اور اس کی اساس سراسر مادیت اور خود غرضی پر رکھی گئی ہے ۔ اس لئے کامیابی اس کے نصیب میں ہرگز نہیں ۔ اقبال نے مشرق کو اس کے حربوں سے متنبہ کرتے ہوئے اسے فتنہ گروں کی جماعت اور داشتہ پیرک افرنگ ، قرار دیا اور کہا کہ مغربی عظیم طاقتوں کا یہ اتحاد صرف کمزور قوموں کی تباہی اور اُن کی بندر بانٹ چاہتا ہے اور نام نہاد دردمندانِ جہاں کے باطن کی قلعی کھول کر رکھ دی ۔[1] پھر ساتھ ہی اس کا حل بھی تجویز کر دیا اور مغرب کے استعماری رویوں کی کوتاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلم اقوامِ مشرق کی ایک الگ جمعیتِ اقوام کا ذکر کیا جس کے لیے وہ بطور مرکز طہران کا نام تجویز کرتے ہیں ۔ آج سے لگ بھگ پچاس سال قبل پیش کی گئی اقبال کی یہ تجویز کس قدر معنی خیز ثابت ہو رہی ہے ۔[2]

۱۔ برفتد تا روش رزم دریں بزمِ کہن
دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دز دے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند
(کلیات اقبال ، حصہ فارسی ، پیام مشرق ، ص ۱۹۳/۲۶۳)

۲۔ بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویز سے کچھ روز سنبھل جائے!
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ص ۱۵۶/۶۱۸)

واقعہ یہ ہے کہ مشرق اور اقوام مشرق پر مغربی استعماری سیاسی معاشی اور تہذیبی اثرات کا غلبہ ایک طرح کے استحصال کا واضح رنگ اپنے اندر رکھتا ہے ۔ تاریخ کے جس عہد میں مشرق کو اس مکروہ استحصال کا سامنا ہوا اقوام مشرق ذہن اور رویے کے ایک عجیب تضاد کا شکار ہو گئیں ۔ مغربی استعمار کی یلغار نے اقوام مشرق کے اندر معاشرتی سطح پر ایک تہذیبی تصادم کی صورت بھی پیدا کر دی ۔ اب یہ اپنے ماضی سے پوری طرح منقطع ہونے کی ہمت نہ رکھتی تھیں کیونکہ ان کا ماضی واقعی اس قدر شاندار اور قوی تھا کہ آسانی کے ساتھ اس کا گلا گھوٹنا ممکن ہی نہ تھا اور استعمار کے تہذیبی اور سیاسی حربے بھی اس قدر دل کش اور دل فریب تھے کہ ان سے بھی مفر ممکن نہ تھا ۔ ملتِ اسلامیہ کا یہ ایک عجیب و غریب اور خطرناک موڑ تھا ۔ حیرت یہ ہے کہ اس موڑ پر ملت کی رہنمائی کرنے والا کوئی بھی دانش ور عزم اور عقیدے کے ساتھ آگے بڑھتا دکھائی نہیں دیتا ۔ چند ایک نام گنے بھی جا سکتے ہیں لیکن ان کا تجزیہ یا تو سرے سے درست نہ تھا یا ادھورا تھا ۔ ان میں سے بعض تو توجیہ اور تاویل کے شکار تھے اور بعض معذرتی ہوکر رہ گئے چند ایک کو مصلحت اور ذہنی مرعوبیت کا مرض چاٹ گیا ۔ اس سارے پس منظر میں فقط اقبال ہی ایک ایسے مسلم دانش ور اور فلسفی شاعر نظر آتے ہیں جو مغربی استعماری حربوں کی تہ میں اُتر کر اُن کا مناسب تجزیہ بھی کرتے ہیں اور پھر اس سلسلے کی دانش ورانہ ذمہ داریاں بھی نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ انہیں تہذیبی اور سیاسی ہر محاذ پر بجا لاتے بھی دکھائی دیتے ہیں ۔ اقبال نے اپنا فرض صرف قیام یورپ کے دوران ہی نہیں نبھایا بلکہ عمر کے آخری ایام تک انہوں نے مغربی فکر و فلسفہ اور سیاسی رویے کا بنظر غائر

پانی بھی مسخر ہے ، ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے !
دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے !
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے !

(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ص ۶۰۹/۱۴۷)

مطالعہ بھی جاری رکھا ۔ یہ فیصلہ انہوں نے قیامِ یورپ کے دوران ہی کر لیا تھا کہ قصر ملت بیضاء کے دریچے دو طرفہ کھولے جائیں تا کہ افکارِ تازہ کی صحت مند ہوا سے اقوام مشرق کی فضا محروم نہ رہ جائے اور صدیوں کے علمی رویے کا بند پانی بو بھی نہ دینے لگے اور یہ کہ اگر ایسا نہ ہوا تو مغربی تہذیبی اور سیاسی استعمار کا مقابلہ اقوام مشرق کے بس کی بات نہ رہے گی ۔[1] اقبال اس صدی کے وہ واحد مسلمان مفکر ہیں جنہوں نے اسلام کو ایک مربوط فکر کے لباس میں اس دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ یہ خود زمانۂ حاضر کے خیالات ، میلانات اور رجحانات کے لیے معیار تنقید ہے ۔[2] ان کی صائب رائے یہ تھی کہ اگر مسلمان دانش ور اسلامی فکر میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں کر سکتے تو کھوکھلی تجدد پسندی پر صحت مند تنقید تو کی جائے تاکہ استعماری تجدد پسندی کے سیلاب کے آگے بند باندھا جا سکے ۔[3]

اقبال نے اصولی طور پر مغربی استعمار کی مخالفت کو اپنا عقیدہ یا لائحۂ عمل فقط اس لیے بنایا کہ وہ جان گئے تھے کہ مغرب مشرق کے لیے خدائی کرنے کا دعویدار بن چکا ہے جبکہ خود مغرب نے اپنے لیے اقتدار اور زر اندوزی کے بتوں کو بطور خدا کے تجویز کر لیا ہے ۔ ان حالات میں مغربی دین و دانش کے پس منظر میں ہوس کی حیلہ گری کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ ہر چند کہ اشتراکیت نے مغرب کی مکروہیت کو بے نقاب کیا تھا اور یہ مشرق کی سہل پسندی کا ایک توڑ بھی تھی اور اس سے زر پرستانہ مادیت کے تار و پود بکھرنے کے امکانات پیدا ہوئے تھے

۱۔ پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
این خیابان راز خارم پاک کن
(کلیات اقبال ، حصہ فارسی ، اسرار و رموز ، ص ۱۶۸/۱۶۸)

۲۔ ’’اقبال سوشلزم اور اسلام‘‘ ، پروفیسر کرار حسین ، نقوش شمارہ ۱۲۷ ، دسمبر ۱۹۷۷ء ، ص ۱۲۳ ۔

۳۔ ’’اور اگر ہم اسلامی فکر میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے تو کم از کم صحت مند تنقید سے عالمِ اسلام میں امنڈتے ہوئے تجدد پسندی کے سیلاب کو ضرور روک سکتے ہیں ۔‘‘
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۱۵۲

اقبال نے اسی وجہ سے مشرق و مغرب دونوں کے لیے اسے روز حساب کا درجہ دیا تھا ۔ یہ مغربی کلیسا کی مضبوط دیوار میں ایک زبردست دراڑ تھی اس سے قیصرانہ ملوکیت کی ہوس رانی کے دن مختصر ہوتے نظر آتے تھے اقبال کا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ضمیر کی تربیت کے بعد مغربی چیلنج ، غلبہ اور تسلط کے خلاف اقوام مشرق کے ضمیر کی تربیت کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا ۔ اسلام کا بیج ان کے شعور کی گہری سطح سے پھوٹتا ہے اور تناور درخت بنتا ہے چنانچہ یہ اقبال تھے جنہوں نے صدیوں کے فاصلے سے نئے ڈھب کے ساتھ مسلمان اقوام کے ساتھ تعلق اور ماحول کے خلاف رد عمل کو اُن کی تاریخ کی اساس اور روح قرار دیا ۔

اقبال مغربی استعمار کے اس لیے بھی خلاف ہیں کہ اس کی مدنیت کا ضمیر دین کی روح سے خالی ہے اور مغربی اخوت کا دارومدار فقط نام و نسب پر رہ گیا ہے جسے اب عیسائی اخلاقیات بھی ختم کرنے سے معذور ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ مغرب کا قبول اسلام بھی شاید اس کی مدنیت کے ضمیر کو پاک نہ کر سکے کیوں کہ مغرب اگر اسلام قبول بھی کر لے تو بھی وہ مشرق کے سیاہ روز مسلمان کو غلام ہی رکھے گا ۔ کیونکہ وہ نسلی غرور کا شکار ہے اور اس نسلیت کو اقوام مشرق میں بھی پھیلا رہا ہے ۔[1]

مغربی استعمار کے جملہ پہلوؤں کے حسن و قبحہ اقبال پر خوب خوب منکشف ہوئے ۔ انہوں نے تہذیب ، علم ، حکمت اور سیاست کے مغربی معجزات کے غرور کو بھی ملاحظہ کیا مگر اس کی تہہ میں انسان کی مردہ دلی اور بے ضمیری کو بھی دیکھا ۔ مشرق کی خودی اور مغرب کا ضمیر دونوں ان کے نزدیک مردہ ہو چکے تھے ۔ وہ مشرق اور مغرب

۱۔ ضمیر اس مدنیت کا دین سے ہے خالی
فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں
قبول دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دین مصطفٰی انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ص ۶۲/۵۲۴)

ہر دور کی روش اور مزاج سے غیر مطمئن تھے ۔ ان کے نزدیک مغرب کی استعماری چال بازیاں اور مشرق کے بے روح مراقبات اور توکل و قناعت انسان کی بربادی کے لیے یکساں حکم رکھتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے بڑے سلیقے سے بیک وقت ان کی مدافعت اور ان کی اہمیت کے اظہار کا رویہ اپنایا اور جہاں ان کے تاریک پہلوؤں کی بے معنویت کو واضح کیا ، وہاں اُن کی معنویت کے دوسرے رخ کو نکھارنے کی ذمہ داری بھی اٹھائی ۔ ایک دانش ور کے لیے حقیقتاً یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا تاہم اقبال اس سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ۔ تہذیب مغربی کی گہرائیوں میں اُترنے کے بعد جہاں وہ اس کے بے رحم ناقد تھے وہاں انہیں اس کے باطن میں اگر کچھ خوبیاں بھی نظر آئیں تو انہوں نے ان سے اعتناء نہیں برتا ۔ یہ بات بہر طور لائق استحسان ہے کہ مغربی فکر کے گہرے باطن میں علم کی سچی لگن ، تسخیر فطرت اور جہالت کے خلاف جد و جہد کی جو قوت بخش قدریں موجود ہیں ، وہ بہر حال موجود ہیں ۔[1] مغربی قوموں میں سے خاص طور پر انگلستان کی قوتِ عمل کو انہوں نے شاندار لفظوں میں اس طرح سراہا بھی ہے کہ سچائی ، ہمت ، بلند نظری اور قوت کی اقدار کو خراج بھی دیا جائے اور اس کی تائید اور توصیف میں بخل سے کام نہ لیا جائے ۔[2] در اصل اقبال فرسودگی اور گریز کے

۱- "The most remarkable phenomenon of modern history, however, is the enormous rapidity when the World of Islam is spiritually moving towards the West. There is nothing wrong in the movement, for European culture, on its intellectual side, is only a further development of some of the most important phase of the culture of Islam. Our only fear is that the dazzling exterior of European culture may assert our movement, and we may fail to reach the truf inwarone of that culture."

Reconstruction of Religious Thought in Islam, p. 7.

۲- "حق یہ ہے کہ انگریز قوم کی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں حسِ واقعات دیگر اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی فلسفیانہ نظام جو واقعاتِ متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو ۔ انگلستان کی

مخالف تھے اور فرد کی آزادی پر یقین رکھتے تھے اور معاشرے میں ہر سطح پر ندرت ، جدت اور انقلاب کے آرزو مند تھے ۔ سیاست کو اخلاق سے بے تعلق نہیں جانتے تھے ۔ جنگ عظیم کی حشر سامانیاں اُن کے سامنے تھیں جس انسان کی جغرافیائی پہچان کو اس کے لیے ایک آزاد بنا کر رکھ دیا تھا ۔ پیام مشرق کا دیباچہ ان کی اسی سوچ کی شہادت ہے ۔[1] اقبال کے ہاں دوسرے مسلمان مفکرین سے ایک الگ رنگ پایا جاتا ہے وہ اسلامی اتحاد ہی کو بجائے خود مغربی استعمار کے مقابلے میں ایک سیاسی وحدت خیال

سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا ۔ لہٰذا حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیاتِ عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل نہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کریں ۔'' مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی لاہور ۱۹۶۳ء ص ۱۵۸ ۔

۱۔ ''یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کرتی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے ۔ خالص ادبی اعتبار سے دیکھیں تو جنگِ عظم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشو و نما کے لیے نا مساعد ہے ۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ اقوام کے طبائع پر وہ فرسودہ ، سست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب نہ آ جائے جو جذباتِ قلب کو افکارِ دماغ سے متمیّز نہیں کر سکتی ۔ البتہ امریکی مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات و افکار کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے :

''اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افرادِ قوم کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرکے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو ، قابلِ احترام ہے ۔'' ''کلیاتِ اقبال فارسی ۔ پیامِ مشرق'' ، ص ۱۸۳ - ۱۸۲

کرتے تھے۔[۱] مشرق میں عالم اسلام کا انتشار اقبال کے نزدیک یورپ کی جن قباحتوں سے پیدا ہوا انہیں اقبال نے اپنے افکار میں نام گنوایا ہے مثلاً مغربی رویے کا دو رخا پن، یورپ کا جغرافیائی قومیت پر اصرار، اس کا سرمایہ دارانہ نظام معیشت جس نے انسانوں کی اکثریت کو محرومیوں کا شکار بنا دیا۔ بے محابا آزادیٔ نسواں جس سے یہ طبقہ رفتہ رفتہ جنس تجارت بن کر رہ گیا اور اس کے بد اثرات اقوام مشرق کے جسد میں ایک زہر بن کر سرائیت کر گئے۔ پھر تہذیب و ثقافت کا یکسر مادیتی رویہ۔ افکارِ مغربی کی انہی جہتوں کے فروغ سے اقبال پریشان تھے۔ چنانچہ انہوں نے تہذیب مغرب کا تنقیدی جائزہ لینے کا مشورہ دیا اور بُرے بھلے کی پہچان خود کرنا سکھایا۔ ایک طنز کے انداز میں انہوں نے مشرق کو بتایا کہ قوتِ مغرب کا راز چنگ و رباب، دختران بے حجاب، ساحران لالہ رو، عریانی ساق، قطع مو، فروغِ خط لاطینی یا لا دینیٔ افکار میں ہرگز نہیں بلکہ قوت افرنگ اس کے علم و فن میں ہے اور اگر ہو سکے تو مشرق اس علمی رویے کو اپنائے لیکن مشرق اس مغز کی بجائے ملبوس فرنگ پر ہی قناعت کر گیا ہے۔[۲] اس ذہنیت نے مسلمانوں میں اتحاد کی بجائے علیحدگی

۱۔ ''نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے۔ وہ محض بودے اور سُست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصولِ فقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرورِ ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکی۔''
''مکاتیبِ اقبال'' لاہور ۱۹۵۴ء، ص ۹

۲۔
شرق را از خود برد تقلیدِ غرب
باید ایں اقوام را تنقیدِ غرب
قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

محکمی اورانہ از لا دینی است
نے فروغش از خطِ لا طینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

پسندی کے رجحان کو فروغ دیا ہے۔[1] وطنیت اور قومیت جن پر مغربی استعمار کا مدار ہے ان کی نفی اقبال کے فکر کے اساسی محرکات میں سے ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا وطن فقط اسلام ہے۔ یہی ان کی تہذیبی اور سیاسی فکر کا بنیادی نکتہ ہے۔[2] اس باب میں انہیں برصغیر کے بعض دینی رہنماؤں کی مصلحت کیش روش سے گلہ بھی تھا۔[3] جو مغربی

علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوس فرنگ!
(کلیات اقبال، حصہ فارسی، جاوید نامہ، ص ۶۶۷/۱۷۸)

۱- حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
(کلیات اقبال، حصہ اردو، بانگ درا، ص ۲۶۴)

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
''خواجگی'' نے خوب چُن چُن کر بنائے مسکرات
(کلیات اقبال، حصہ اردو، بانگ درا، ص ۲۶۲)

۲- ''قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود و ملک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں استیلا کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کرکے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔'' ''اقبال نامہ'' حصہ اول، ص ۳۶۸

۳- ''میں نظریہ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں۔ جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریے کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے یہ بات پوری طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔'' ''حرفِ اقبال، ص ۲۲۶۔

استعمار کی ملوکانہ اغراض میں اس کے معاون بن رہے تھے۔

عالم اسلام میں خلافت کا اپنے انجام کو پہنچنا بے شک ایک تاریخی المیہ تھا۔ اقبال بھی اس سے متاثر ہوئے اس لیے کہ در پردہ مغربی استعمار بھی اس کے عقب میں تھا۔ تاہم اقبال کسی نمائشی خلیفہ کے وجود کو اتحاد اسلامی کی راہ میں رکاوٹ اور استعماری حربوں میں شریک جانتے تھے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ تجویز کیا کہ اسلامی جمہوریتوں کی ایک برادری تشکیل دی جائے، وہ مغربی استعمار کی یلغار کے سامنے ایک عرب وفاق کے قیام کی اہمیت کے بھی قائل تھے۔ دوسری طرف ایشیائی قوموں کو انہوں نے ایک جمعیت اقوام ترتیب دینے کا مشورہ بھی دیا۔ در اصل اقبال عالم اسلام کی دولت مشترکہ کو مغربی استعمار کے خلاف بطور دفاع کے قائم ہوتے دیکھنے کے آرزو مند تھے۔ انہیں دکھ تھا کہ ایرانی ہوں ترک یا عرب تمام اقوامِ مشرق محکومی کے باعث مغربی استعمار کی حیلہ گری کو محسوس کر لینے کی قوت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔[۱] اقبال نے ترکوں کے انقلاب کے بعد محسوس کیا کہ مغرب کی معاشری تقلیدِ محض سے کسی قوم کی عملیت کے قویٰ نئی زندگی حاصل کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور یہ رویہ بھی محض ماضی پرستی کے رویے سے اپنے نتائج کے اعتبار سے کچھ مختلف نہیں۔ مغربی استعمار کے خلاف اتا ترک اور رضا شاہ نے پہلے پہل جو کچھ کیا اقبال اس سے بے شک متاثر تھے لیکن انہیں بھی مغربی تہذیبی طوفان میں بہتے ہوئے پایا تو مایوس بھی ہوئے۔[۲] وہ عربوں کی غلط اندیشی سے بھی پریشان

۱۔ نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو خود ہے لبِ گور!

(کلیات اقبال، حصہ اردو، ضرب کلیم، ص ۵۳۲ - ۵۳۱/۷۰ - ۶۹)

۲۔ نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

(کلیات اقبال، حصہ اردو، ضرب کلیم، ص ۶۰۴/۱۴۲)

تھے ۔[1] مصر میں سیاسی بیداری کو دیکھا لیکن اس کے ہمراہ آنے والی عیش پسندی اور تقلید مغربی انہیں کھلتی تھی ۔

ایران میں ساسانی اقدار تہذیب کے احیاء کی تحریک جو نسل کی بنیاد پر چلائی گئی اقبال کی روح کا آزار تھی ۔ بر صغیر میں مسلمانوں کے تہذیبی زوال اور اقتصادی مسئلے پر وہ بار بار قائد اعظم کو خطوط لکھ کر ایک نئے وطن اور آزادی کی تحریک کو جاری رکھنے کی تاکید کر رہے تھے ۔ اور یہ ساری اقوام مغربی استعمار کی مئے مینا گداز میں مست تھیں اور اس کی یلغار کے آگے بے دست و پا تھیں ۔ مغربی عقل فسوں پیشہ ، نے مشرق میں مجرد وطنیت کو فروغ دیا ۔ اقبال نے اس پر بھی ماتم کیا اور اس کے پیراہن کو مذہب کا کفن قرار دیا ۔[2]

مغربی تہذیبی اور سیاسی استعمار کا ایک اور خطرناک رخ بھی تھا جس کا تجزیہ کئے بغیر اقبال سے رہا نہ جا سکا ۔ انہیں اس کی زہر ناکی میں پنجۂ یہود بھی نظر آ گیا تھا جو سراسر مغربی سازش کے تحت ارض مقدس اور فلسطین میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہے تھے ۔ مغربی استعمار کی دلی خواہش تھی کہ یہود کی حمایت کرتے ہوئے فلسطین میں عربوں کی قوت کو ختم کر دیا جائے ۔ غیر قانونی طور پر وہاں عربوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرکے وہاں پورے یورپ سے یہودی لا بسائے جائیں یہاں تک

۱۔ جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار!
ترکانِ 'جفا پیشہ' کے پنجے سے نکل کر
بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار!
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ص ۱۵۴/۶۱۵)

۲۔ اس دور میں مے اور ہے جام اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، بانگ درا ، ص ۱۶۰)

کہ ان کا ملک اسرائیل بن جائے۔ اقبال نے اسے استعماری حیلہ گری قرار دیا۔[1] بلکہ اس مسئلہ پر ایک بھر پور بیان سارے عالم اسلام کے لئے جاری کیا۔[2] آپ نے ارض مقدس میں اسرائیل کے قیام کی سازش کو مشرق کے دروازے پر ایک خطرناک مرکز کا قیام قرار دیا۔[3] انہوں نے مصر کو بھی یہودی استعمار سے متنبہ کیا اور کہا کہ عالم عرب پر نا جائز تسلط جمانے کے لیے جس طرح یہود کو مغرب نے کھلی چھٹی دے دی ہے ایک روز یہ سود خور قوم اس قدر طاقت ور ہو جائے گی کہ خود مغربی استعمار اس کے اشارے پر رقص کرے گا۔[4]

اقبال نے مغربی دانشوری کی تہہ میں موجود مادیت کا طوفان دیکھا تھا جن پر اس تہذیب کی اساس ہے۔ مغربی استعماری ذہنیت نے تہذیب کے محاذ پر یہی جراثیم اقوام مشرق میں پھیلائے اور خود فراموش عالم مشرق

۱۔ ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا ؟
مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا !

(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ۶۱۹ - ۶۱۸/۱۵۷ - ۱۵۶)

۲۔ "فلسطین میں یہود کے لیے ایک قومی وطن کا قیام محض ایک حیلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی امپیریلزم مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ میں مستقل انتداب اور سیادت کی شکل میں اپنے ایک مقام کی متلاشی ہے۔" "اقبال نامہ" ، جلد اول ، ص ۱۵۴

۳۔ "اقبال نامہ" ، جلد دوم ، ص ۲۷۔

۴۔ تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار
جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ !
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ !

(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، بال جبریل ، ص ۴۵۹/۱۶۷)

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی !

(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ص ۶۰۲/۱۴۰)

ان سے متاثر ہوتا رہا ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال نے مغربی تہذیبی اور سیاسی استعمار کی یلغار کا دو طرفہ دفاع کیا یعنی مشرق کو روحانی زوال آمادگی سے بچایا جائے اور سیاسی محاذ پر اسے تنبیہ کی جائے ۔ مغرب نے مشرق کو ذہنی غلام بنانے کے لیے اپنے مخصوص نظام تعلیم سے بھی فائدہ اٹھایا اور غلام مشرق کی نئی نسل کو گرفتار خرافات کر دیا جن میں موسیقی اور صورت گری کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا ۔ اس نظام تعلیم نے مشرق کی خودی کو تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر ملائم اور موم کرنے کے بعد اسے جس طرف چاہا پھیر لیا اور مغرب نے یوں غلام مشرق کو تیغ سے زیر کرنے کے ساتھ ہی ساتھ خرافات سے زیر کرنے کا حربہ بھی خوب خوب آزمایا ۔[1] یہاں پوری انسانیت کے لیے اقبال کی اخلاص مندی بھی سامنے آتی ہے کہ چونکہ مادیت اور بے راہ عقلیت اقوام مشرق کے علاوہ خود اقوام مغرب کے لیے بھی ہلاکت کا باعث بن سکتی ہیں ۔ اس لیے محض انسانی بنیاد پر انہوں نے مغرب کو بھی بعض فتنوں کی ہلاکت آفرینی سے متنبہ کیا ۔[2] اس مغربی عقلیت نے جو علم کے واسطہ سے مشرق میں در آئی تھی ، مسلمانوں میں محدود وطنیت کے تصور کو فروغ دیا تھا ۔ اقبال نے اس پر بہت احتیاط کے ساتھ نکلسن کے نام ایک خط میں توجہ دلائی کہ اجتماعی زندگی کے ارتقاء اور نشو و نما میں قبیلے اور قومی

۱- آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات
(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ص ۵۴۰/۷۸)

۲- اقبال کا خط بنام پروفیسر نکلسن اور یہ اشعار بھی :
از من اے بادِ صبا گوے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را این بہ جگر می زند ، آں رام کند
عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ، ورنہ
آں چہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

نظامات کا وجود ایک عارضی حیثیت رکھتا ہے اور جب اسی کو انتہائی منزل قرار دے دیا جائے تو یہ بد ترین لعنت بن جاتے ہیں ۔ اقبال نے جسمانی غلامی سے زیادہ ہمیشہ ذہنی غلامی کو خطرناک جانا ۔ تہذیب مغربی نے اقوام مشرق میں جو مصلحت آمیز رویہ اور معذرتی لب و لہجہ پیدا کر دیا تھا اس کی خطرناکی سے اقبال آگاہ تھے ۔ ان کے سامنے ایک طبقہ مسلمانوں کے درمیان ایسا بھی موجود تھا جو تہذیب ملت بیضاء کو تہذیب مغرب سے ہم آہنگ کرنا چاہتا تھا ۔ یہ رویہ دانستہ اور نا دانستہ دونوں سطحوں پر پایا جاتا تھا ۔ اقبال نے اس کے خلاف دانش ورانہ جنگ لڑی ۔ ذہنی اور سیاسی انحطاط کے اس دور میں جب مسلمان اپنے ماضی سے ایک طرح سے لاتعلق ہوئے بیٹھے تھے اور اپنے تہذیبی فاتحین کی ہمرکابی پر فخر محسوس کرتے تھے ، اقبال نے اجتہادی اور تقلیدی دونوں رویوں پر نظرثانی کا مشورہ دیا ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مغربی تہذیب نے معاشرتی اقدار کے اظہار میں مبالغہ آرائی کی ، اگرچہ اپنے باطن میں یہ اقدار کھوکھلی ہو چکی تھیں ۔ یہ بات اسلامی کلچر کے خلاف ہے جس کی اساس اعتدال اور توازن پر ہے اور جو حیات دنیاوی اور حیات آخر دونوں پر محیط ہے اسی باعث اقبال نے مغربی تعلیمی مادیت کو تاریخ کی تخلیقی صلاحیت کا دشمن سمجھا ۔[1] مغرب کا ثقافتی رویہ اقبال کی شاعری کی زبان میں بے ذوق ہے اور دل بیدار ، عطاء کرنے سے محروم ہے ۔ اس میں خود اپنے افکار کا سفر کرنے کی جرأت نہیں ہے ساتھ ہی یہ بے حرم بھی ہے ۔ اس لیے اس کی بنیاد پر

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تر است
دانش اندوختہ ، دل ز کف انداختہ
آہ زاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختہ

(کلیات اقبال ، حصہ فارسی ، پیام مشرق ، ص ۱۸۸/۳۵۸)

۱- یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات !
یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبر ، یہ حکومت !
پیتے ہیں لہو ، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات !

خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کے امکانات معدوم ہونے لگتے ہیں ۔

عورت کی آزادی مغربی استعمار کا ایک اور شاخسانہ ہے ۔ جس سے اقوام مشرق بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں ۔ اس سے نژاد نو کی پاکیزہ اموت سے محرومی کا جو سلسلہ چلا ، اس کے اثرات دور رس ہیں ۔ جاوید نامہ میں اقبال نے اس محاذ پر بھی اپنا نقطۂ نظر خوبصورتی سے پیش کیا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی ہر سطح پر مرد و عورت کی مساوات کی نفی کرتے ہیں ۔ انہوں نے کہا کہ خاندانی وحدت کے رشتے کو جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزو اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے ۔[1] شعر کے پیرائے میں بھی انہوں نے تہذیب فرنگ کے اس حربے پر بھر پور تنقید کی ہے ۔[2] اور مغربی استعمار کے اس پہلو کو مرگ اموت سے تشبیہ دی ہے ۔[3] عورت مشرق میں ہمیشہ سرمایۂ ملت سمجھی گئی ہے کیونکہ جملہ تہذیبی اوصاف اسی کے وجود کے مرہون ہوتے ہیں ۔ اقبال نے مشرق عورت کو اسوۂ بتول رضؓ اپنانے کی تلقین کی ۔ وہ عورت کو تمدن کی جڑ سمجھتے تھے جس سے تمام نیکیاں نمو کرتی ہیں ۔ اسے زیور تعلیم سے مزین

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات ؟
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات !

(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، بال جبریل ، ص ۴۰۰ - ۱۰۸/۳۹۹ - ۱۰۷)

۱- ”ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر“ ، ص ۳۸ -

۲- کوئی پوچھے حکیمِ یورپ سے
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش !
کیا یہی ہے معاشرے کا کمال ؟
مرد بیکار و زن تہی آغوش !

(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ص ۵۵۵ - ۹۳/۵۵۴ - ۹۲)

۳- تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اموت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت !
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت !

(کلیات اقبال ، حصہ اردو ، ضرب کلیم ، ص ۹۶/۵۵۸)

کرنا سارے خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ لیکن مغربی ڈھب کی تعلیم اس کے لیے سم قاتل ہے۔[1] یہ مسئلہ عمر بھر ان کے پیش نظر رہا اور اس عقدۂ مشکل کی کشود ممکن نہ ہو سکی۔[2]

اقبال مشرق کے ساتھ جس مغربی تہذیبی اور سیاسی استعمار کا مقابلہ کرتے ہیں اس کے بنیادی اجزاء عام طور پر مندرجہ بالا امور ہیں۔ شیشے کی یہ عمارت جو آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ مغرب کی نعمتیں ایسی بھی ہیں جو اقبال کے نزدیک اصلِ اسلام کا وہ اجر ہیں جنھیں مغرب نے 'چپکے چپکے' وصول کیا۔ بہرحال اگر انھوں نے مغرب کے استعمار کے خلاف جدوجہد کی ہے تو مشرق کے لیے گن بھی نہیں گائے بلکہ اس پر بھی انتقاد کیا ہے۔ ہاں مگر مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں کو انھوں نے کھل کر نمایاں کیا ہے اور مشرق کو اس کی سست روی پر جنجھوڑا ہے۔ مشرق کی جو صورت حال تھی اور جو لوگ اس کے ذمہ دار تھے۔ اقبال نے سب کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا کہ احیائے ملت کے لیے یہ از بس ضروری تھا۔[3] اس کے باوجود انھیں مشرق کی پختہ اقدار پر یقین تھا اور ان کی بحالی پر ان کا ایمان تھا۔ وہ مانتے تھے کہ اپنی ساری فسوں گری کے باوصف 'فرنگ رہگزر یہ سیلِ بے پناہ میں ہے'۔ اقبال کی فکری دیانت داری یہ ہے کہ مغربی استعمار کو انھوں نے صرف

۱۔ "لیکن اس ضمن میں ایک غور طلب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریق کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے ان کے شریفانہ اطوار مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص میں قائم رہیں۔ میں نے اس سوال پر غور و فکر کیا ہے مگر چونکہ اب تک کسی قابل عمل نتیجے پر نہیں پہنچا اس لیے فی الحال اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔" مضامینِ اقبال، ص ۴۲

۲۔ میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود!
(کلیات اقبال، حصہ اردو، ضرب کلیم، ص ۹۷/۵۵۹)

۳۔ بگزر از خاور و افسونیٔ افرنگ مشو
کہ نیرزد بہ جوئے ایں ہمہ دیرینہ و نو
(کلیات اقبال، حصہ فارسی، زبور عجم، ص ۱۳۰/۵۲۲)

اپنے وطن برصغیر کے حوالے سے نہیں دیکھا بلکہ اس کے مضمرات اور خطرات کو پورے عالمِ اسلام اور اقوامِ مشرق یہاں تک کہ خود مغرب کے لیے بھی محسوس کیا اور اپنے تجزیے، پیغام اور اپنے افکار کو شاعری نثر، خطبات، فارسی، اردو اور انگریزی پر حوالے اور وسیلے سے پیش کیا۔

ہر چند کہ اقوام مشرق کی جنگ مغربی استعمار کے تہذیبی اور سیاسی محاذ پر ابھی جاری ہے مگر مشرق نے جو تہذیبی اور سیاسی سنبھالا لیا ہے وہ بے شک بقول ڈاکٹر علی شریعتی اقبال ہی کے خواب کی تعبیر کا ایک حصہ ہے۔ غلام مشرق کی استعماری زنجیریں کٹ چکی ہیں مگر استعمار بھی ساتھ ہی ساتھ اپنے رنگ میں بدل بدل کر حملے کر رہا ہے۔ جبر کے خفیہ ہاتھوں نے دستانے پہن رکھے ہیں، مگر یہ خواب اپنی مکمل تعبیر کے ساتھ ایک روز سامنے آ کر رہے گا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ عصر حاضر میں اقبال کے افکار کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے باطن میں روحِ عصر ہے۔ مغربی استعمار کے تہذیبی اور سیاسی محاذ پر اقبال کی تمام تر فکری جدوجہد اقوامِ مشرق اور ملتِ اسلامیہ کے پاس آج بھی ایک متحرک امانت ہے۔ اس لیے کہ ایک عقیدے کے طور پر اقبال نے مشرق کے اتحاد پر ایمان رکھا۔[1] ان کا اپنا اعلان ہے:

"ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے، وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔"[2]

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے مے خانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا!

(کلیات اقبال، حصہ اردو، بال جبریل، ص ۳۱۵/۲۳)

۱۔ "اسلام ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالا تر ہوگی۔ اور جس میں شخصی اور مطلق العنانی بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی گنجائش نہ ہوگی۔ دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت پیدا کر دے گا۔ غیر مسلموں کی نگاہوں میں شاید یہ محض خواب ہو، لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔" گفتارِ اقبال

"میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہوگا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلالِ اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔" اقبال نامہ، حصہ دوم، ص ۱۶۳

۲۔ "مقالاتِ اقبال"، ص ۱۴۴۔

علامہ اقبالؒ اور ترکی

محمد یعقوب مغل

دور حاضر کے عظیم مفکر، فلسفی شاعر اور ترجمان حقیقت علامہ اقبال کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ گو علامہ اقبال مسلم ہند کے فارسی گو شاعر کی حیثیت سے ابھرے اور شاعری کے ذریعے ہی سے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کی، تاہم شاعری میں ادب محض بحیثیت ادب کبھی ان کا مطمح نظر نہ رہا ۔ ان کا نصب العین اور مقصد حیات اسلامی نظریے کے تحفظ اور مسلمانوں کی بہبود کے علاوہ کچھ نہ تھا ۔ در حقیقت دور جدید میں حکیم الامت علامہ اقبال نے شاعری کے ذریعے دین اسلام کی جو بے لوث خدمت کی ہے، وہ قابل تعریف ہے ۔

علامہ اقبال نے نہ صرف برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا تصور پیش کیا، بلکہ انہوں نے عالم اسلام کو خواب غفلت سے بھی بیدار کیا ۔ علامہ اقبال نے عالم اسلام کو مغربی تسلط سے نجات دلانے کے لیے شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا اور اس عمدہ پیرائے میں مختصر عرصے میں اتنا بڑا ذہنی انقلاب برپا کیا کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ علامہ اقبال نے مسلم ممالک میں جہاں جہاں آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں ان کو سراہا اور خراج تحسین پیش کیا ۔ پورے عالم اسلام نے ان کے پیغام کو گہری توجہ کا مستحق جانا اور ان کے خیالات و افکار سے اثر قبول کیا، اس کے نتیجے میں ممالک اسلامیہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور ان کے حوصلے بلند ہونے اور ان میں باہم اشتراک و اتحاد اور ملت اسلامیہ کے احیاء کا نیا شعور پیدا ہوا ۔

بیسویں صدی کا ربع اول دولت عثمانیہ اور ترکوں کے لیے بڑی آزمائش کا دور تھا ۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا ۔ مسلمانان ہند نے ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ترک بھائیوں کی مالی امداد

کے لیے چندہ فراہم کیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر انصاری ایک وفد کے ساتھ قسطنطنیہ (استانبول) بھی گئے ۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے اس جذبہ کو سخت نا پسند کیا اور برصغیر ہند و پاک کے ان مسلمان رہنماؤں کو جو ترکی اور خلافت عثمانیہ سے ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے، جیل میں ڈال دیا۔ ان قائدین میں مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر اخبار 'زمیندار' کا نام سر فہرست ہے ۔ اقبال نے ان مظالم کے خلاف احتجاج کیا اور کہا :

دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی !!

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں طرابلس کی جنگ کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ایک نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' پر بھی لکھی ہے، جو غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی ۔ اس کے علاوہ اقبال اپنی ایک اور نظم بعنوان ''حضور رسالت مآب میں'' طرابلس کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

''حضورؐ ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں''[۲]

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک رہی ۔ اس جنگ کے آغاز کے بعد فرانس اور برطانیہ نے مل کر یہ کوشش کی کہ وہ درۂ دانیال پر ان کا قبضہ ہو جائے تاکہ استانبول اور خلافت عثمانیہ کے دیگر علاقوں پر آسانی سے قبضہ کیا جا سکے ۔ لیکن مصطفیٰ کمال پاشا کی عسکری صلاحیتوں

۱- کلیات اقبال حصہ اردو بانگ درا ، ص ۱۹۴ -
۲- ایضاً ، ص ۱۹۷ -

اور عزم کے سامنے ان کا بس نہ چل سکا ۔ برطانیہ ، فرانس اور ان کے حلیفوں کی متحدہ قوت کو پسپا ہونا پڑا ۔ اس شکست کے بعد انگریز سیاسی چال چلے اور عربوں کو آزادی کا جھانسہ دے کر انہیں ترکوں کے خلاف ابھارا ۔ حجاز کا گورنر حسین بھی انگریزوں کی سیاسی چال میں آ گیا اور عثمانیوں کے خلاف بغاوت کر دی ۔ وہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک حجاز کا خود مختار حکمران رہا ۔ بالآخر نجدیوں نے اسے شکست دے کر مار بھگایا ۔

اقبال نے حجاز کے ہاشمی گورنر حسین کی عثمانیوں سے غداری کو سخت نا پسند کیا اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا :

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش[1]

۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں جرمنی اور اس کے حلیف ترکی کو شکست فاش ہوئی اور خلافت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر گیا ۔ مغربی طاقتوں کا سارا نزلہ عالم اسلام پر گرا ۔ اتحادیوں نے دولت عثمانیہ کے مقبوضات کو آپس میں بانٹ لیا ۔ مغرب کے مشرقی صوبے بلقان ، ہنگری اور بلغاریہ وغیرہ مکمل طور خود مختار علاقے قرار دے دیئے گئے ، ایران اور شام پر عملاً فرانس کا قبضہ ہو گیا ، مصر اور عراق پر برطانیہ نے اپنا تسلط جما لیا ۔ اس طرح عالم اسلام اپنی آزادی سے محروم ہو گیا ۔ مسلم ہند پر ۱۸۵۷ء سے ہی برطانیہ قابض ہو چکا تھا ۔ اس انحطاط کے دور میں مصطفیٰ کمال پاشا نے عثمانی خلیفہ اور اتحادیوں کے خلاف جنگ آزادی کا آغاز کیا اور ۱۹۱۹ء میں انقرہ میں نئی حکومت قائم کی اور ترکوں کو یونان اور اتحادیوں سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ابھارا ۔ بالآخر ۱۹۲۲ء میں مصطفیٰ کمال نے اتحادیوں کے حلیف یونان کو زبردست شکست دی ۔ ۱۹۲۳ء میں ترکوں نے تھریس پر بھی قبضہ کر لیا ۔ پھر ۱۹۲۳ء میں ہی ترکی میں جمہوری حکومت کا اعلان کر دیا گیا ۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی اس عظیم کامیابی پر علامہ اقبال نے انہیں اپنی مشہور نظم ''طلوع اسلام'' میں زبردست خراج تحسین پیش کیا ۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے بر صغیر میں تحریک خلافت کو غیر

---

۱ ۔ کلیات اقبال حصہ اردو بانگ درا ، ص ۲۵۷ ۔

معمولی عوامی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اور ترکوں کے حق میں مسلمانان برصغیر کے شدید جذبات تھے ۔ وہ خلافت کے ادارہ اور آزاد قوم کی حیثیت سے ترکوں کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے انگریزوں سے مطالبہ کر رہے تھے مگر علامہ اقبال انگریزوں سے اس مطالبے کے حق میں نہ تھے بلکہ بہ زور بازو اس کو حاصل کرنے کے حق میں تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ یہ تحریک ترکی میں جنگ آزادی کی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے انگریزوں کے اشارے پر چلائی جا رہی تھی ۔ اپنے ایک مکتوب بنام مولانا سید سلیمان ندوی ، علامہ لکھتے ہیں :

''مدت سے یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ معلوم نہیں آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے ۔ واقعات صاف اور نمایاں ہیں مگر ہندوستان کے سادہ لوح مسلمان نہیں سمجھتے اور لندن کے شیعوں کے اشارے پر ناچتے چلے جاتے ہیں[1] ۔ ۔ ۔ ۔

اس طرز عمل کو اقبال نے اپنی ایک نظم ''دریوزۂ خلافت'' میں گدائی سے مشابہت دی ہے ۔ انہوں نے کہا :

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا ؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی ![2]

یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال اتا ترک نے خلافت کو ختم کرکے جمہوریت کا اعلان کیا تو اقبال نے اتاترک کے اس عمل کو خلافت کے سلسلے میں اجتہادی عمل قرار دیا ۔ اور کہا کہ مصطفیٰ کمال نے حق خلافت امت مسلمہ کو واپس دلوا دیا ، گویا خلافت جو شوریٰ کا حق ہے ، اس کو لوٹا دیا ۔

۱۔ اقبال نامہ ص ۱۰۵ ، ۱۰۶ ۔

۲۔ کلیات اقبال حصہ اردو بانگ درا ، ص ۲۵۴ ۔

علامہ اقبال کا ترکی میں اولین تعارف ترکی کے قومی شاعر اور قومی ترانہ کے خالق محمد عاکف کا مرہون منت ہے ۔ محمد عاکف کو جنگ آزادی کے دوران علامہ اقبال کے فارسی کلام پڑھنے کا موقع ملا اور وہ اقبال کے کلام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے نہ صرف ان کے اشعار کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا بلکہ اپنے ایک مقالہ میں اقبال کو ''رومی عصر'' قرار دیا ۔ خلافت کے خاتمے کے بعد اتا ترک سے سیاسی اختلاف کی وجہ سے محمد عاکف کو ملک چھوڑ کر مصر آنا پڑا ۔ محمد عاکف نے مصر سے اپنے ایک دوست کو ۱۹۲۵ء میں ایک خط روانہ کیا جس میں انہوں نے علامہ اقبال کی دو فارسی کتب کے ہاتھ لگنے اور مطالعے کا ذکر کیا ہے ۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کے کلام نے مجھے مدہوش کر دیا ہے ۔'' مزید عرض کر دوں کہ مصر پہنچنے کے بعد محمد عاکف نے اپنی تازہ تصنیف (Safahat) ''صفحات'' علامہ اقبال اور دیگر احباب کو روانہ کی تھی ۔ اس طرح اپنے دور کے دو عظیم مسلم دانشوروں کا باہمی رابطہ قائم ہو چکا تھا ۔ محمد عاکف کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ مصر کے قیام کے دوران انہوں نے وہاں اقبال شناسی کا فرض بھی ادا کیا اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کو اقبال کے کلام سے متعارف کرایا اور ڈاکٹر عزام کو ترغیب دی کہ اقبال کے کلام کا عربی میں ترجمہ کریں ۔

اقبال اور جدید ترکی کے روابط کے سلسلے میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ۱۹۳۲ء میں جنگ بلقان کے ہیرو ایڈمرل رؤف پاشا ، ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں توسیعی خطبات دینے کے لیے فرانس سے ہندوستان تشریف لائے ۔ رؤف پاشا نے چھ خطبات دیئے ۔ ان خطبات کے سلسلے میں دو اجلاسوں کی صدارت اقبال نے فرمائی ۔ علامہ کی خواہش پر رؤف پاشا کو لاہور میں مدعو کیا گیا ۔ ۲۳ مارچ ۱۹۳۳ء کو اسٹفل (Stiffles) ہوٹل میں ان کو عظیم الشان استقبالیہ دیا گیا ۔ یہ سب اہتمام اقبال کی ترکوں سے والہانہ محبت اور عقیدت کی وجہ سے کیا گیا تھا ۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے ترکیہ جمہوریہ سے سفارتی تعلقات قائم ہوئے تو پاکستان کے پہلے سفیر میاں بشیر احمد نے اقبال شناسی کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دیں ۔ انقرہ یونیورسٹی اور کئی دیگر

مقامات پر علامہ اقبال کی حیات ، کلام اور پیغام کو ترکوں سے متعارف کرایا ۔ اس کے علاوہ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کی یوم ولادت اور یوم وفات پر اجتماعات کے انعقاد کا باقاعدہ سلسلہ جاری کیا گیا جس میں ترکی کے دانشور ، معزز سیاستدان ، مفکرین اور علامہ اقبال کے پرستاروں کو مدعو کیا جاتا ہے ۔ اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ترکی میں اقبال شناسی کو فروغ حاصل ہوا اور عوام اقبال کے کلام میں گہری دلچسپی لینے لگے اور سرعت سے علامہ اقبال کے فارسی کلام کا ترکی زبان میں ترجمہ شائع ہونے لگا ۔

سفارتی تعلقات قائم ہونے کے بعد ترک پاکستان کلچر ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا ۔ اس غیر سرکاری جمعیت نے دونوں ملکوں کے تعلقات کو فروغ دینے کے علاوہ اقبال کو ترکی میں متعارف کرانے میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ۔

جناب شریف الحسن مرحوم کا ترکی میں مختلف ادوار میں دس گیارہ سال قیام رہا ۔ بحیثیت پاکستان کے پریس اتاشی ، قونصل جنرل اور ڈپٹی سیکریٹری جنرل سینٹو ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں ۔ انہوں نے اپنی زندگی کا مشن ، اقبال کے کلام و پیام کو ترکی میں متعارف کرانا بنا لیا تھا ۔ اتفاقاً ان کے قیام کے دوران میں بھی ترکی میں اولاً اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں (۱۹۶۲-۱۹۶۲) اور پھر بحیثیت ریسرچ فیلو اور بانی انچارج اردو اور مطالعات ثقافت پاکستانی (۱۹۷۲-۱۹۷۵ء) استانبول یونیورسٹی اور آخری بار بحیثیت کلچرل کونسلر (۱۹۷۷-۱۹۸۰) انقرہ میں رہا ۔ اس لیے مجھے شریف الحسن مرحوم سے اکثر و بیشتر ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا رہتا تھا ۔ میں ان کی شخصیت اور اقبال سے والہانہ عقیدت سے بے حد متاثر تھا ۔ شریف الحسن نے استانبول میں پاکستان قونصلیت جنرل کو علم و ادب اور مطالعات اقبال کی دانشگاہ بنا دیا تھا ۔ اس زمانے میں ترک پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن استانبول کے صدر پروفیسر ڈاکٹر علی نہاد تارلان تھے ۔ پروفیسر تارلان کو علامہ اقبال سے بے انتہا عقیدت اور والہانہ عشق تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں (۱۹۶۰-۱۹۰۸) پاکستان قونصلیت جنرل میں ہفتہ وار اجتماعات ہوا کرتے تھے اور اقبال کے کلام پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا ۔ یہی وہ دور ہے جس میں پروفیسر تارلان نے اقبال شناسی میں خصوصی نام پیدا کیا ۔ اور ''پیام مشرق'' (Sarktan Haber)

۱۹۶۳ء میں ، ''زبور عجم'' (Zebur-u Acemden Secmeler) ۱۹۶۳ء میں ''رموز بے خودی'' (Esrar re Rumuz) ۱۹۶۰ء میں ، ''ضرب کلیم'' (Darb-i Kalim) ۱۹۶۸ء میں ''ارمغان حجاز'' (Hicax Armagani) کا ۱۹۶۸ء میں ترکی ترجمہ پیش کیا ۔ ان تراجم کے علاوہ ڈاکٹر تارلان نے اقبال کے افکار و تصورات کو تشریح میں اہم مقالات و مضامین بھی پاکستان پوسٹ (Pakistan Postasi ترکی زبان میں سفارت خانہ پاکستان کی طرف سے شائع ہونے والا ماہوار میگزین) اور دیگر رسائل میں شائع کروائے ۔

پروفیسر تارلان کے سلسلے میں اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۹۵۷ء میں اقبال اکادمی نے پروفیسر تارلان کو پاکستان آنے کی دعوت دی تھی اور انہوں نے یہاں اقبال پر لیکچر بھی دیئے تھے - پروفیسر تارلان عرصہ دراز تک ترک پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن کے اعزازی صدر کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں اور اسی پلیٹ فارم سے انہوں نے اقبال شناسی کا اہم کام اپنے ذمہ لیا ۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ترکی میں علامہ اقبال اور پروفیسر تارلان لازم و ملزوم بن گئے اور وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اقبال شناسی کا فریضہ انجام دیتے رہے -

پروفیسر تارلان کے علاوہ اقبال کے اور بھی کچھ شیدائی اور پروانے تھے ، جنہوں نے اقبال کے کلام اور افکار کو ترکی زبان کا جامہ پہنایا ۔ ان میں جناب قورو جو (A.U. Kurucu) بھی شامل ہیں - ان کی کتاب Buyuk Islam Sairi Dr Muhammad Ikbal یعنی عظیم اسلامی شاعر ڈاکٹر محمد اقبال' انقرہ سے ۱۹۵۷ء میں چھپی ۔ اس کے علاوہ اقبال کے چھ لیکچروں کے مجموعے The Reconstruction of Religious Thought in Islam کا ترکی ترجمہ جناب صوفی حری (Safi Huri) نے Islam'da Dini Teffekkurun Yeniden Tesekkulu یعنی ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' ۱۹۶۴ء میں استانبول میں چھپوا کر شائع کیا ۔ پری حان آریبورن (Perihan Ariburun) جو ترکی سینیٹ کے سابق چیرمین جنرل آریبورن (General Tekin Ariburun) کی زوجہ ہیں اور علامہ اقبال کے کلام کی پرستار ، انہوں نے ۱۹۷۹ء میں علامہ اقبال کے چھ لیکچروں کا دوبارہ ترکی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور سفارتخانہ پاکستان کی طرف سے علامہ اقبال کی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam بھی انہیں مہیا کی گئی تھی ۔ کہہ نہیں سکتا پری حان نے ترجمہ

مکمل کر لیا ہے یا ابھی کچھ کام باقی ہے ۔ ویسے اتنا عرض کر دوں کہ حکیم الامت کے صد سالہ یوم ولادت کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں مادام یری حان کو بھی پاکستان مدعو کیا گیا تھا ۔

پروفیسر تارلان کے بعد ترکی کی ایک اور اہم علمی شخصیت پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قرہ حان (Professor Dr. Abdul Kadir Karahan) کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ نا انصافی ہو گی ۔ پروفیسر قرہ حان پچھلے پچیس سال سے ترک پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن سے وابستہ ہیں ۔ اور پچھلے پندرہ سال سے وہ اس ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوتے آ رہے ہیں ۔ ڈاکٹر قرہ حان (Dr. Karahan) متعدد بار حکومت پاکستان اور اقبال اکادمی کی دعوت پر پاکستان تشریف لا چکے ہیں اور ہمارے ملک کے علمی حلقوں میں وہ جانی پہنچانی شخصیت ہیں خاص طور پر آج کی مجلس میں کئی احباب پروفیسر قرہ حان کے شخصی دوست ہم میں موجود ہیں ۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ پروفیسر قرہ حان پاکستان کے عظیم دوست اور علامہ اقبال کے پرستار ہیں اور ترکی میں اقبال شناسی میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ۔

جمہوریہ ترکیہ کے قیام کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ۱۹۷۴ء میں سینٹو کی طرف سے پروفیسر عبدالقادر قرہ حان کی تحریر کردہ ایک کتاب یعنی "Dr. Muhammad Ikbal ve Eserlerinden Secmeler" ''ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کا منتخب کلام'' ترکی زبان میں شائع کی گئی ۔ اس کتاب میں پہلی بار علامہ اقبال کے منتخب اردو کلام کا ترکی ترجمہ اردو متن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ اردو سے ترکی میں ترجمے کا شرف اس ناچیز کو اور کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ اسلام کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر کو حاصل ہے ۔

مختلف ادوار میں مختلف حیثیتوں سے مجموعی طور مجھے ترکی میں گیارہ سال قیام کرنے کا موقع ملا ۔ اس دوران میں مجھے علامہ اقبال کے سلسلے میں منعقد ہونے والی مجالس اور مذاکرات میں شمولیت کے مواقع ملتے رہے ۔ کئی موقعوں پر میں نے ''علامہ اقبال کا پیام'' اور ''اقبال اور رومی'' کے موضوعات پر ترکی زبان میں مقالے بھی پڑھے ۔ علامہ اقبال کے افکار پر میرے چند مقالے ترکی زبان میں شائع ہو چکے ہیں ۔ ان مجالس میں میرا ترکی کے دانشوروں اور مفکروں سے تعارف بھی ہوتا رہا

ہے ۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ دور جدید کے ترک دانشور علامہ اقبال کے کلام اور افکار سے بے حد متاثر ہیں ۔

۱۹۷۳ء میں مولانا جلال الدین رومی کی سات سو سالہ برسی کے موقع پر قونیہ میں بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا گیا تھا ۔ اس موقع پر پاکستان سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سابقہ وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد کو مدعو کیا گیا تھا ۔ شریف الحسن مرحوم جو اس زمانے میں سینٹو میں ڈپٹی سیکرٹری جنرل کے عہدہ پر فائز تھے اور میں بھی ، اس کے علاوہ ہماری جانی پہچانی شخصیت اور اقبال کی پرستار پروفیسر اینی میری شمل بھی اس سیمینار میں مدعو تھیں ۔ اس موقع پر مختلف مقررین نے اپنے عالمانہ مقالوں میں مولانا رومی کے ساتھ ساتھ ''عصر حاضر کے رومی'' کو بھی زبردست خراج عقیدت پیش کیا ۔

۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ یوم ولادت کے موقع پر پاکستان میں ایک بین الاقوامی کانگرس کا اہتمام کیا گیا تھا ۔ اس موقع پر ترکی سے سات دانشور اور اقبال کے پرستار مدعو کئے گئے جن میں ڈاکٹر لطفی دوغان (Dr. Lutfi Dogan) جو اس وقت بلند ایجوت (Bulunt Ecevit) کی حکومت میں وزیر مذہبی امور تھے ، پروفیسر ڈاکٹر سعدی ارماک (Prof. Dr. Sadi Irmak) سابق وزیر اعظم ترکی اور اس وقت وہ ترک پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن کے صدر بھی تھے ، پری حان آریبون (Perihan Ariburun) فواد بیرام اوغلو (Fuat Bayramoglu) سابق سیکرٹری جنرل وزارت خارجہ ترکی نوزت یالچین طاس Nevzet Yalcintas ماہر اقتصادیات اور سابق ڈائریکٹر جنرل ٹرکش ٹی وی اور ریڈیو اور پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قرہ حان کے نام قابل ذکر ہیں ۔ ترکی وفد نے اس موقع پر حکیم الامت کی حیات اور فلسفے پر روشنی ڈالی اور عالمانہ مقالات پیش کیے ۔

علامہ اقبال کے صد سالہ یوم ولادت کے سلسلے میں پورے ترکی میں ترک حکومت ، ترک پاکستان ثقافتی جمعیتوں اور سفارتخانہ پاکستان کے اشتراک سے ایک مربوط پروگرام مرتب کیا گیا ۔ علامہ اقبال کے افکار کو فروغ دینے اور حکیم الامت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے حکومت ترکی نے ، مئی ۱۹۷۸ء کو جسٹس جاوید اقبال کو لیکچر دینے کے لیے ترکی مدعو کیا ۔ چنانچہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے لیے انقرہ ، قونیہ اور استانبول میں لیکچروں کا انتظام کیا گیا تاکہ ان مقامات پر وہ

علامہ اقبال کے پیغام و افکار کو ترک بھائیوں تک پہنچا سکیں ۔ اُسی سال دسمبر میں مولانا رومی کی برسی کے موقع پر ایک بار پھر ڈاکٹر جاوید اقبال کو مدعو کیا گیا ۔ اس موقع پر مولانا رومی کے شہر قونیہ میں ان کی تقاریر کا ترجمہ ترکی زبان میں پیش کرنا میرے ذمہ تھا ۔ جس وقت ڈاکٹر جاوید اقبال نے مولانا رومی سے عقیدت کی وجہ سے یہ کہا کہ قونیہ کی خاک بھی میرے لیے سرمے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جب میں نے یہ ہی الفاظ ترکی زبان میں ادا کیے تو سامعین بے حد جذباتی ہوگئے اور کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے ۔ جاوید اقبال اس کے چشم دید گواہ ہیں کہ قونیہ کا بچہ بچہ حکیم الامت علامہ اقبال کے نام سے واقف ہے اور وہاں پہنچنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم پاکستان کے کسی شہر میں ہیں ۔

گو علامہ اقبال کبھی ترکی یا قونیہ تشریف نہ لائے تھے تاہم قونیہ پہنچنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ''پیر رومی'' اور ''مرید ہندی'' ایک دوسرے سے آشنا تھے اور لوگ بھی ایسا تاثر دیتے ہیں گویا کہ مولانا رومی کی طرح علامہ اقبال بھی ان کا قومی شاعر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا رومی کے مزار کے قریب علامہ اقبال کی ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے ۔ یہ یادگار پیرو مرید کے وصال کا زندۂ جاوید مجسمہ ہے اور یہ یاد دلاتا ہے کہ ''عصر حاضر کے مولانا'' یعنی علامہ اقبال اپنے مرشد حضرت مولانا جلال الدین رومی کی خدمت میں عقیدت کے پھول نچھاور کر رہے ہیں ۔

یونیورسٹیوں میں مطالعۂ اقبال

(صد سالہ جشن ولادت ۱۹۷۷ تک)

سید معین الرحمٰن

۱

علامہ اقبال ہمارے شعر و ادب کی اُن خوش قسمت استثنیات میں سے ہیں جو اپنی زندگی ہی میں اہل علم کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں ۔ گزران وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی محبوبیت اور مرکزیت بڑھتی ہی جا رہی ہے ۔ ہماری جامعات کا وہ بالخصوص بہت محبوب اور مرغوب موضوع ہیں اور رہے ہیں اور یہ صرف ہماری پاکستانی یونیورسٹیوں ہی کی بات نہیں ، اقبال کا مطالعہ مشرق اور مغرب کی متعدد یونیورسٹیوں میں ہوا ہے اور یہ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ صرف اُردو ہی میں نہیں دنیا کی متعدد زبانوں میں ہوا ہے ۔ اقبال پر پی ایچ ڈی کا سب سے پہلا کام اقبال کے انتقال کے پانچ برس بعد ۱۹۴۳ء میں سامنے آیا ۔[1]

۱۹۴۳ء سے ۱۹۷۷ء تک کے چونتیس برسوں میں میرے علم و نظر کی حد تک اقبال پر سات مختلف زبانوں میں پی ایچ ڈی کے لیے اکیس مقالے

۱۔ "The Metaphysics of Iqbal" از : ڈاکٹر عشرت حسن انور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، ۱۹۴۳ء نگران کار : ڈاکٹر سید ظفر الحسن (علیگ) ۱۹۴۴ء میں یہ مقالہ لاہور سے شائع ہوا (ص ۹۱) ۔ جشن ولادت (۱۹۷۷ء) کے موقع پر اس مقالے کا اُردو ترجمہ ''اقبال کی ما بعد الطبیعات'' کے عنوان سے شائع ہوا ۔ (ص ۹۹ ، مطبوعہ اقبال اکادمی ، لاہور) یہ ترجمہ ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے ۔

لکھے گئے ۔ ان میں سے دس انگریزی زبان میں ہیں ، چھ اُردو میں ، ایک چیک زبان میں ، ایک جرمنی ، ایک فرینچ ، ایک عربی اور ایک فارسی زبان میں ۔ ایک مقالے پر جو انگریزی میں ہے اور شعبۂ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور کے لیے لکھا گیا ، ابھی ڈگری تفویض نہیں ہوئی ۔[1] بقیہ بیس مقالات پر دنیا کی ان پندرہ یونیورسٹیوں سے پی ایچ ۔ ڈی کی اسناد عطا ہوئیں :

۱۔ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ چار ڈگریاں : تین شعبہ فلسفہ[2] میں
ایک اردو میں[3] ۔

۲۔ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور تین ڈگریاں : دو شعبہ فلسفہ[4] میں
ایک سیاسیات میں[5]

۳۔ ڈرہم یونیورسٹی ، انگلستان شعبۂ فلسفہ میں ایک ڈگری[6]

۴۔ تہران یونیورسٹی تہران شعبۂ فارسی میں ایک ڈگری[7]

۱۔ "Iqbal's Concept of Religion" از : پروفیسر افتخار احمد چشتی (فیصل آباد) ۔

2. (a) The Metaphysics of Iqbal by : Dr. Ishrat Hasan Enver.
   (b) The Place of God, Man and Universe in the Philosophic System of Iqbal : Dr. Jamila Khatoon.
   (c) Sri Aurobindo and Iqbal : Dr. M. Rafiq.

۳۔ "مطالعۂ تلمیحات و اشارات اقبال" از : ڈاکٹر اکبر حسین قریشی

4. (a) Iqbal's Philosophy of knowledge : Dr. Muhammad Maruf.
   (b) The Impact of Rumi upon the Religious Thought of Iqbal : Dr. M Nazeer.

5. The Political Philosophy of Iqbal : Dr. Parveen Feroze Hasan.

6. An Analysis of the Philosophical Ideas and Works of Iqbal : Dr. Riffat Hasan

۷۔ "شرح حال و آثار و سبک اشعار و افکار اقبال" از : دکتر سید محمد اکرم شاہ

۵- عین الشمس یونیورسٹی ، قاہرہ شعبۂ عربی میں ایک ڈگری[1]

۶- کراچی یونیورسٹی ، کراچی شعبۂ اردو میں ایک ڈگری[2]

۷- الہ آباد یونیورسٹی ، الہ آباد شعبۂ اردو میں ایک ڈگری[3]

۸- گورکھپور یونیورسٹی ، گورکھپور شعبۂ اردو میں ایک ڈگری[4]

۹- چارلز یونیورسٹی پراگ ،
چیکو سلوواکیہ شعبۂ اردو میں ایک ڈگری[5]

۱۰- بہار یونیورسٹی ، مظفرپور بہار شعبۂ اردو میں ایک ڈگری[6]

۱۱- جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن شعبۂ اردو میں ایک ڈگری[7]

۱۲- پیرس یونیورسٹی ، فرانس شعبۂ فلسفہ میں ایک ڈگری[8]

۱۳- ماربرگ یونیورسٹی ، جرمنی شعبۂ دینیات میں ایک ڈگری[9]

۱۴- کلیر ماؤنٹ یونیورسٹی ، امریکہ شعبہ فلسفہ میں ایک ڈگری[10]

۱۵- شکاگو یونیورسٹی ، امریکہ شعبہ دینیات میں ایک ڈگری[11]

۱- ''رسالۃ الخلود'' (جاوید نامہ ، ترجمہ مع تشریح و تعلیقات)
از : ڈاکٹر محمد السعید جمال الدین ، قاہرہ

۲- ''اسلامی تصوف اور اقبال'' از : ڈاکٹر ابو سعید نور الدین

۳- ''اقبال کا فلسفہ خودی اور اس کا ماخذ و مقصد'' از : ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی

۴- ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' از : ڈاکٹر عبدالحق

۵- "Life and Works of Iqbal" از : ڈاکٹر جان ماریک

۶- ''فوق البشر کا تصور اور اقبال کا مرد مومن'' از : ڈاکٹر حاتم سہر

۷- ''اقبال کا تصور انسان کامل'' از : ڈاکٹر غلام عمر خاں

۸- ''محمد اقبال ــ فلسفی شاعر'' از : ڈاکٹر مسعود حسین

۹- ''اقبال کے مذہبی افکار'' از : ڈاکٹر محمد انور علی

10. The Concept of Personhood in the Thought of Martin Buber ; Disetz Suzubi & Muhammad Iqbal'' by : Dr. Natividad Gatbonton Barrauda.

11. "The Contribution of Sir Muhammad Iqbal to Modern Islamic Thought." by : Dr. H. J. Singh.

ان تحقیقی مقالات میں سے بیشتر چھپ چکے ہیں ۔ بعض بہ تمام و کمال اور کچھ جزواً ۔ پی ایچ ۔ ڈی کے ان ۲۱ مقالات میں سے تین ، خواتین کی تحقیق و تلاش اور محنت و ریاضت کا ثمر ہیں ۔ یہ سب مقالے اپنے اپنے مضمون اور میدان کے معتبر اور ممتاز معلمین اور محققین کی رہنمائی میں لکھے گئے ۔ ان عالموں کے اسماء کام کے معیاری ہونے کی بدیہی ضمانت ہیں ۔[1]

ان اکیس مقالات کے علاوہ جو براہ راست اقبال اور ان کے فکر و فن پر لکھے گئے ، جنوبی کیلیفورنیا یونیورسٹی ، میکگل یونیورسٹی ، کولمبیا یونیورسٹی ، جنوبی الی نوائس یونیورسٹی اور سراکیوس یونیورسٹی (نیویارک) سے پانچ ایسے تحقیقی مقالات پر پی ایچ ۔ ڈی کی اسناد تفویض کی گئی ہیں جو براہ راست اقبال پر نہیں لیکن جن کا بیشتر حصہ اقبال اور ان کے افکار و تصورات سے بحث کرتا ہے ۔[2]

پی ایچ ۔ ڈی سے بڑھ کر اقبال پر ڈی لٹ کی ڈگری کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی ڈاکٹر آصفہ زمانی ، تحقیقی کام میں مصروف ہیں ، اُن کا موضوع ہے :

"Dr. Sir Muhammad Iqbal and his Persion Poetry—A Critical Survey."

یہ کام ڈاکٹر آصفہ زمانی کے حسب خواہ مکمل ہو گیا تو اقبال پر ڈی ۔ لٹ کی سند فضیلت حاصل کرنے والی سب سے پہلی اسکالر ہونے کا اعزاز اور امتیاز اُن کا مقدر ہو گا !

۱۔ مثلاً (i) اُردو : بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔

(ii) فلسفہ : پروفیسر ایم ۔ ایم ۔ شریف ، ڈاکٹر سید ظفر الحسن ، پروفیسر خواجہ غلام صادق ، ڈاکٹر سی ۔ اے ۔ قادر ۔

(iii) فارسی : ڈاکٹر حسین خطیبی ۔

(iv) سیاسیات : ڈاکٹر منیر الدین چغتائی ۔

۲۔ تفصیل کے لیے رجوع کیجیے : جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ، از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مطبوعہ : اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور ، ۱۹۷۷ ، ص ۳۵۶ — ۳۵۹

اقبال۔آج بھی مغرب اور مشرق کی متعدد یونیورسٹیوں میں تحقیق کا موضوع ہیں ۔ اقبال کی ولادت کے صد سالہ جشن ۱۹۷۷ء کی زمانی حد تک میرے علم و یقین کے مطابق بر عظیم پاک و ہند اور دیار مغرب کی کم و بیش درج ذیل نو یونیورسٹیوں میں اقبال پر پی ایچ ۔ ڈی کی سطح کا تحقیقی اور تنقیدی کام زیر تکمیل ہے :

۱- بہار یونیورسٹی ، مظفر پور ، بہار[1]

۲- مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ[2]

۳- دہلی یونیورسٹی ، دہلی[3]

۴- بھوپال یونیورسٹی ، بھوپال[4]

۵- جبل پور یونیورسٹی ، جبل پور[5]

۶- جموں و کشمیر یونیورسٹی ، سرینگر[6]

۷- سندھ یونیورسٹی ، حیدر آباد ، جامشورو[7]

۸- پنجاب یونیورسٹی ، لاہور[8]

۱- (الف) عبدالحئی عادل : ''اقبال کا سیاسی شعور''
(ب) محمد خاں فہیم : ''اقبال کے بعد اُردو نظم''
(ج) منظور عالم لعانی : ''اقبال کی غزل گوئی''

۲- (الف) بیگم حامدہ مسعود : اُردو میں نظریہٗ شاعری۔ولی سے اقبال تک''
(ب) قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی : ''اقبال کا فن''

۳- شہناز اختر : ''اقبال کے فکر و فن کے سماجی اور ثقافتی رشتے''

۴- محمد ایوب : ''اقبال اور اُردو غزل''

۵- قمر جہاں : ''اقبال پر قرآن کا اثر''

۶- تارا چرن رستوگی : ''اقبال پر مغربی اثرات''

۷- رفعت علی خاں : ''اقبال کا ذہنی ارتقاء''

۸- رفیع الدین ہاشمی : ''تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ''

۹- ہارورڈ یونیورسٹی[1]

بہار یونیورسٹی (مظفر پور) میں تین اور مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ میں دو اصحاب اقبال پر تحقیقی کام میں مصروف ہیں ، باقی جامعات سے ایک ایک ریسرچ اسکالر وابستہ ہے -

۲

علامہ اقبال پر ڈاکٹریٹ کی سطح کے تحقیقی و تنقیدی کام سے قطع نظر ، یونیورسٹی کی بعض دوسری ڈگریوں کی جزوی تکمیل کے سلسلے میں میری تلاش اور تحقیق کے مطابق پچھلے تیس پینتیس برسوں میں دنیا کی دس یونیورسٹیوں میں اقبال پر ۱۲۳ مقالات مرتب ہوئے - یہ مقالات جن بارہ مختلف ڈگریوں کے حصول کے لیے لکھے گئے ، اُن کی تفصیل یہ ہے :

۱- ایم - اے (اُردو) ٦۹ مقالات (طلباء ۲۲ ، طالبات ۴۷)

۲- ایم - اے (فلسفہ) ۲۰ مقالات (طلباء ۷ ، طالبات ۱۳)

۳- ایم - اے (فارسی) ۸ مقالات (طلباء ۴ ، طالبات ۴)

۴- ایم - اے (سیاسیات) ۷ مقالات (طلباء ٦ ، ایک طالبہ)

۵- ایم - اے (اسلامیات) ۵ مقالات (طلبا ۲ ، طالبات ۳)

٦- ایم - ایڈ (ایجوکیشن) ۷ مقالات (۴ مقالے ۹ طلباء کی مشترکہ مساعی ، ۳ مقالے ۳ طالبات کے)

۷- ایم - اے (ایجوکیشن) ایک مقالہ (مقالہ نگار : میاں محمد طفیل)

۸- ایم - اے (معاشیات) ایک مقالہ (مقالہ نگار : رفعت یعقوب)

۹- ایم - اے (تاریخ) ایک مقالہ (مقالہ نگار : نسرین طاہرہ)

۱۰- ایم - اے (عربی) ایک مقالہ (مقالہ نگار : سمیر عبدالحمید ابراہیم)

۱۱- ایم - اے (لائبریری سائنس) ایک مقالہ (مقالہ نگار : محمد اسلم)

۱- ڈاکٹر این میری شمل کی زیر نگرانی : ابلیسیات اور اقبال کے تصور ابلیس کا پس منظر"

۱۲- منشی فاضل دو مقالات ، دو طلباء کے

ان ۱۲۳ مقالات میں سے ۱۱۳ ، پاکستان کی تین یونیورسٹیوں میں لکھے گئے :

۱- پنجاب یونیورسٹی ، لاہور : ۹۸ مقالات

۲- سندھ یونیورسٹی ، حیدر آباد : ۸ مقالات

۳- کراچی یونیورسٹی ، کراچی : ۷ مقالات

ایک مقالے پر امریکن یونیورسٹی آف بیروت ، لبنان سے اور ایک پر قاہرہ یونیورسٹی ، مصر سے ڈگری ملی - بیروت یونیورسٹی والا مقالہ انگریزی میں ہے اور قاہرہ یونیورسٹی کے لیے لکھا جانے والا مقالہ عربی میں ہے اور یہ دونوں مقالے لاہور میں چھپ چکے ہیں ، باقی آٹھ مقالے ہندوستان کی ان پانچ یونیورسٹیوں میں پیش کیے گئے :

۱- بھوپال یونیورسٹی بھوپال (تین مقالات)

۲- جامعہ عثمانیہ ، حیدر آباد دکن (دو مقالات)

۳- مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ (ایک مقالہ)

۴- جموں و کشمیر یونیورسٹی ، سری نگر (ایک مقالہ)

۵- وکرم یونیورسٹی ، اجین (ایک مقالہ)

ان آٹھ مقالات میں سے پانچ طالبات نے تحریر کیے ہیں ، چار اُردو اور ایک شعبۂ فلسفہ کے لیے انگریزی میں۔طلبا کے تینوں مقالے اُردو میں ہیں ، ابھی کوئی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا -

پاکستان میں لکھے گئے ۱۱۳ مقالات میں سے ۶۸ ، طالبات کے زور قلم کا نتیجہ ہیں اور ۴۵ مقالے ۴۹ طلباء کی مشترکہ مساعی کا حاصل ہیں- مجموعی طور پر ۸۹ مقالات اُردو میں لکھے گئے ہیں اور ۲۴ انگریزی میں- ان ۲۴ میں سے ۱۱ ، طالبات کے تحریر کردہ ہیں -

یونیورسٹی ڈگری کے لیے لکھے گئے ان مقالات کی نگرانی کا فرض بھی ثقہ اور معتبر اہل علم کے سپرد رہا ہے - ستمبر ۱۹۷۰ء میں پروفیسر سید وقار عظیم ، شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی اورنیٹنل کالج ، لاہور سے اکیس برس کی منصبی وابستگی کے بعد سبکدوش ہوئے تو اُن کی نگرانی میں اقبال

پر لکھے گئے مقالات کی تعداد ۱۶ تھی ۔ وقار عظیم صاحب کے حین حیات (۱۹۷۶ء) بر عظیم پاک و ہند کی کسی بھی یونیورسٹی کے کسی بھی اُستاد نے اقبال پر وقار عظیم صاحب سے زیادہ تحقیقی اور تنقیدی کام نہیں کرایا ، ولادت اقبال کے صد سالہ جشن (۱۹۷۷ء) کی زمانی حد تک صورت یہ ہے:

۱- ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (پنجاب یونیورسٹی) : ۱۷ مقالات

۲- پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم : ۱۶ مقالات

۳- پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (سندھ یونیورسٹی) : ۸ مقالات

۱۹۷۲ء کے لسانی فسادات میں سندھ یونیورسٹی (حیدر آباد) کے شعبۂ اُردو کی سیمینار لائبریری تباہ کر دی گئی اور مختلف علمی و ادبی موضوعات پر ایم ۔ اے کے کئی سو قلمی مقالے نذر آتش ہو گئے ۔ اس کا قوی امکان ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب یا سندھ یونیورسٹی شعبہ اُردو کے دوسرے اساتذہ کی نگرانی میں آٹھ سے زیادہ متعلمین نے اقبال پر تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہو ۔

پنجاب یونیورسٹی کے جن دوسرے اساتذہ نے اقبال پر تحقیقی اور تنقیدی کام کی روایت کو مستحکم بنانے میں نسبتاً زیادہ دل چسپی لی اور خود تحقیقی کام کی ذمہ داری سنبھالی اُن کے اسماء یہ ہیں :

۱- پروفیسر خواجہ غلام صادق (شعبۂ فلسفہ) : ۷ مقالات

۲- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (شعبۂ اُردو) : ۶ مقالات

۳- جناب نعیم احمد (شعبۂ فلسفہ) : ۵ مقالات

۴- ڈاکٹر وحید قریشی (شعبۂ اُردو) : ۵ مقالات

۵- جناب عبدالخالق (شعبۂ فلسفہ) : ۴ مقالات

۶- جناب شوکت علی (شعبۂ سیاسیات) : ۴ مقالات

پروفیسر خواجہ غلام صادق کی نگرانی میں ایم ۔ اے کے سات مقالات سے قطع نظر ، فلسفے میں اقبال پر پی ایچ ۔ ڈی کی ایک سند بھی تفویض ہوئی ۔

ایم ۔ اے کے لکھے گئے ان مقالات میں سے دو اپنے ''حجم'' کی بنا پر نمایاں قرار دیے جا سکتے ہیں ، ایک ''طوالت'' کے لحاظ سے اور دوسرا

''اختصار'' کے اعتبار سے۔ دونوں کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے ہے ۔ ایم ۔ اے (فارسی) کے لیے انور سلطانہ کا مقالہ ''اقبال کی فنی تراکیب'' ۷۹۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس سے قطع نظر کہ ''فنی'' سے کیا مراد ہے ؟ اقبال کی فارسی شعری تراکیب کا یہ قیمتی اشاریہ بڑی محنت اور کاہش کے بعد ۱۹۷۲ء میں سید وزیر الحسن عابدی کی زیر نگرانی مرتب ہوا۔اس کے بر عکس ''تخلیق پاکستان میں اقبال کا حصہ'' کے موضوع پر ایم ۔ اے (سیاسیات) کا ایک مقالہ صرف ۴۳ (فل اسکیپ سائز) صفحات پر مبنی ہے جسے فخر النساء نے ۱۹۵۸ء میں جناب شوکت علی کی رہنمائی میں انگریزی میں لکھا ۔

اقبال پر ایم ۔ اے کے ان مقالات میں سے جہاں بیشتر سرسری ہیں اور محض سر کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں ، وہاں بعض مقالے ایسے بھی ہیں جنھیں پروفیسر سید وقار عظیم کے بقول[1] بڑی آسانی سے پی ایچ ۔ ڈی کے مقالوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے ۔

۳

اقبال پر یونیورسٹی کے مختلف امتحانات کے ۱۲۳ مقالات میں سے ۶۹ ایم ۔ اے (اُردو) کے لیے لکھے گئے اور ان پر یہ تفصیل ذیل بر عظیم پاک و ہند کی سات یونیورسٹیوں نے اسناد عطا کیں :

۱۔ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۵۳ مقالات (۴۰ طالبات ، ۱۳ طلباء)

۲۔ سندھ یونیورسٹی ، حیدرآباد ۸ مقالات (۳ طالبات ، ۵ طلباء)

۳۔ بھوپال یونیورسٹی بھوپال تین مقالے (دو طلباء ایک طالبہ
(شعبۂ اُردو ، سیفیہ کالج)

۴۔ جامعہ عثمانیہ ، حیدر آباد دکن دو مقالے (حبیب النساء بیگم ، غلام عمر خاں)

۵۔ کراچی یونیورسٹی ، کراچی ایک مقالہ (سیدہ شیریں پروین)

۱۔ اورئینٹل کالج میگزین ، لاہور جلد ۵۰ ، عدد ۱-۴، ۱۹۷۴ء
صفحہ ۱۲۲

۶- جموں و کشمیر یونیورسٹی ، سری نگر : ایک مقالہ (شمس النساء)

۷- وکرم یونیورسٹی ، اجین ایک مقالہ (نشاط زرین) (شعبہ اُردو ، مادھو کالج)

سب سے زیادہ یعنی ۵۳ مقالات شعبہ اُردو ، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور کے لیے تیار ہوئے ان میں سے دو طالبات (سیدہ فرزانہ ناہید گیلانی اور میمونہ روحی) نے شعبہ اُردو ، گورنمنٹ کالج ، فیصل آباد (لائل پور) کے توسط سے اپنے مقالات پر پنجاب یونیورسٹی ، لاہور سے ایم - اے (اُردو) کی سند فضیلت حاصل کی - پنجاب یونیورسٹی سے ملحق ، گورنمنٹ کالج ، فیصل آباد ، صوبہ پنجاب کا (جس میں تین آرٹس یونیورسٹیاں واقع ہیں) سب سے بڑا اور پرانا سرکاری کالج ہے جہاں ایم - اے (اُردو) کی سطح پر تدریس کا انتظام اور اہتمام ہے -

شعبہ اُردو ، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور سے وابستہ آٹھ اساتذہ نے بہ تفصیل ذیل اقبال پر تحقیقی و تنقیدی کام کی رہنمائی کی :

۱- ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ۱۷ مقالات (طالبات ۱۱ ، طلباء ۶)

۲- پروفیسر سید وقار عظیم ۱۶ مقالات (طالبات ۱۲ ، طلباء ۴)

۳- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ۶ مقالات (طالبات ۴ ، طلباء ۲)

۴- ڈاکٹر وحید قریشی ۵ مقالات (طالبات ۴ ، ایک طالب علم)

۵- ڈاکٹر عبید اللہ خاں ۲ مقالات (دونوں طالبات)

۶- ڈاکٹر ناظر حسن زیدی ۲ مقالات (دونوں طالبات)

۷- ڈاکٹر سید عبداللہ ۲ مقالات (دونوں طالبات)

۸- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایک مقالہ (محمد فرمان)

پنجاب یونیورسٹی اورئینٹل کالج کے ان اکاون مقالات میں سے دو اپنی ضخامت کے اعتبار سے نمایاں طور پر سر کشیدہ ہیں :

۱- اُردو مکتوب نگاری ، غالب سے اقبال تک گیتی آراء ، صفحات : ۶۹۱

۲- کلام اقبال میں تاریخی شخصیتیں ریحانہ نسرین دارا ، صفحات : ۶۵۳

پہلا مقالہ براہ راست اقبال سے متعلق نہیں ، اس کے صرف ۱۴ صفحات صفحہ (۵۱۴—۵۲۷) علامہ اقبال کے بارے میں ہیں—دوسرا مقالہ الگ الگ ''تاریخی شخصیتوں'' کے شرح احوال کا مجموعہ ہے ۔ ان تاریخی شخصیتوں کا کلام اقبال میں کہاں کہاں حوالہ آیا ہے یا ان تاریخی شخصیتوں کا اقبال کے نظام فکر سے کیا تعلق ہے ؟ اُس کی طرف اشارے سے کام کی اہمیت اور افادیت بڑھ جاتی ۔

۴

۱۲۳ مقالات میں سے ۷۶ ایم ۔ اے (اُردو) کے امتحان کے لیے لکھے گئے ، بقیہ ۴۵ میں سے ۲۰ مقالے ایم ۔ اے (فلسفہ) کی سند کے لیے مرتب ہوئے ۔ مقالہ نگاروں میں سے ایک خاتون کا تعلق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ[1] سے اور ایک کا کراچی یونیورسٹی سے[2] ہے ۔ باقی سب مقالے پنجاب یونیورسٹی کے لیے تحریر کیے گئے ۔ یونیورسٹی کے لیے دو مقالے شعبۂ فلسفہ ، گورنمنٹ کالج ، لاہور کی وساطت سے پیش ہوئے ۔ ان بیس مقالوں میں سے صرف پانچ اُردو میں لکھے گئے ہیں ، بقیہ پندرہ انگریزی میں ہیں ۔ پروفیسر خواجہ غلام صادق ، جناب نعیم احمد اور عبدالخالق صاحب نے کام کرانے میں زیادہ انہاک اور اشتیاق دکھایا ۔

ایم ۔ اے (فارسی) کے لیے اقبال کے بارے میں لکھے گئے آٹھ مقالے میرے علم میں آئے :

۱۔ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۴ مقالات (۳ طالبات ، ایک طالب علم)

۲۔ کراچی یونیورسٹی ، کراچی ۴ مقالات (۳ طلباء ، ایک طالبہ)

پنجاب یونیورسٹی (شعبۂ فارسی) میں اقبال پر جو تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا اس کی نگرانی کا تین چوتھائی بوجھ تنہا ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ نے اُٹھایا ۔

ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ نے ایک ملاقات میں مجھ سے بیان کیا کہ ۱۹۶۷ء کے قیام ایران کے زمانے میں مشہد یونیورسٹی کے ڈاکٹر رجائی نے اُنھیں

---

1. ''Iqbal's Concept of God'' by : Jamila Khatoon.
2. ''Concept of Perfect man in Iqbal'' by : Hasina Sheikh

اپنی نگرانی میں ایسا نس (فارسی) کی سند کے لیے علامہ اقبال کے بارے میں لکھوائے ہوئے پانچ چھ رسالے (مقالے) دکھائے تھے ۔ افسوس کہ ان مقالات (رسائل) کے کتابیاتی کوائف اب اُن کے پاس موجود اور محفوظ نہیں ۔

منشی فاضل (فارسی) کے لیے لکھے گئے دو مقالے بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی زینت ہیں ۔ اب یہ امتحان پنجاب یونیورسٹی کے دائرۂ کار سے خارج ہے ۔ یہ مقالات مولانا عبدالمجید سالک اور جناب آقا بیدار بخت کی رہبری اور نگرانی میں تیار ہوئے ۔

ایم ۔ اے (سیاسیات) کی ڈگری کے لیے اقبال سے متعلق پنجاب یونیورسٹی میں سات مقالے لکھے گئے ۔ یہ سب انگریزی میں ہیں اور ایک استشنیٰ کے علاوہ سب کے سب طلباء کے حسن رقم کا نتیجہ ہیں اور بیشتر جناب شوکت علی کے زیر نگرانی مکمل ہوئے ہیں ۔ ایم ۔ اے اسلامیات کے لیے پانچ مقالے لکھے گئے ان میں سے تین طالبات کی محنت کا حاصل ہیں ۔

اقبال پر ادارۂ تعلیم و تحقیق Institute of Education and Research ، پنجاب یونیورسٹی کے سات مقالوں میں تین طالبات نے لکھے ہیں ، بقیہ چار مقالے نو طلباء کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہیں ۔ ایم ۔ اے (معاشیات) ، ایم ۔ اے (تاریخ) اور لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری کے لیے بھی ایک ایک مقالہ لکھا گیا ہے ۔ اول الذکر دو مقالات بالترتیب رفعت یعقوب اور نسرینہ طاہرہ نے پنجاب یونیورسٹی کے لیے تحریر کیے اور موخرالذکر مقالہ کراچی یونیورسٹی شعبہ لائبریری سائنس کے طالب علم محمد اسلم نے ترتیب دیا ہے ۔

۱۹۷۷ء تک مختلف یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ یا ایم ۔ اے کے لکھے گئے یا لکھے جانے والے ڈیڑھ سو کے قریب تحقیقی اور تنقیدی مقالات اور ان کے موضوعات پر ایک نظر ڈالی جائے تو ان کے ہمہ جہتی تنوع کو دیکھ کر ایک خوشگوار طمانیت کا احساس ہوتا ہے ۔

اقبال کے فلسفے ، اُن کے مذہبی عقائد اور سیاسی شعور ، اُن کے افکار و تصورات اور ان کے مآخذ ، اُن کے ذہنی ارتقا اور ان کے فکری سرچشموں ، ان کے فن شعر ، شعری و نثری تصنیفات ، ان کی اردو اور فارسی شاعری اور اس کے اثرات مابعد پر بعض صورتوں میں اچھا اور قابل توجہ کام ہوا ہے بایں ہمہ منجملہ مباحث دیگر ، اقبالیات کے دو

موضوع اور میدان اب بھی ایسے ہیں جو کسی آبلہ پا کو جاں کاہی کی دعوت دیتے ہیں ۔

ایک ــ اقبال کے سوانح اور وقائع زندگی کی تعیین و تلاش اور دوسرے ، اقبال کے نثری سرمائے کی قدر و قیمت کا تعین ــ غالب کو انتقال کے کوئی تیس برس بعد حالی میسر آئے جنہوں نے شاعر غالب کو ''محض شاعر'' سے بڑھ کر ایک بڑے شخص اور نثر نگار کے طور پر بھی دریافت اور متعارف کیا ــ صد سالہ جشن ولادت اقبال کے موقع پر ، اقبال کو ہم سب سے رخصت ہوئے کوئی چالیس برس گزر چکے ان کی بلند اور غالب شخصیت ، ہنوز اپنے بھرپور اور یادگار تجزیے کے لیے کسی حالی کی منتظر ہے ۔

چمن میں خوش نوایان چمن کی آزمائش ہے !

[اقبال عالمی کانگریس منعقدہ لاہور ۲ــ۹ دسمبر ۱۹۷۷ء کے لیے لکھا گیا]

اقبالیات کا مطالعہ

پروفیسر سید وقار عظیم (مرحوم)

مرتبہ

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

زیرِ نظر کتاب اقبال کے فکر و فن اور بعض صورتوں میں اقبال کی شخصیت کے متعلق ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو معاصرینِ اقبال نے اُن کی زندگی میں لکھے ۔ ان مضامین میں سے اکثر اقبال کے مطالعے میں آئے اور ان میں بعض کے متعلق انہوں نے اپنے خیالات بھی ظاہر کیے ، کبھی تحسین و تشکر کی صورت میں اور کبھی تردید و توضیح کے انداز میں ۔

اقبال نے دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کی تردید اور توضیح میں جو مضامین اور خطوط لکھے ، وہ ان کے فکر و فن کے طالب علم کے لیے ایک بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

بحیثیتِ مجموعی اس مجموعے کے مضامین کے مطالعے سے سب تنقیدی روے سامنے آتے ہیں ، جو اقبال کے معاصرین نے فکرِ اقبال اور شعر اقبال کے متعلق اختیار کیے تھے اور جن کی بنا پر ایک خاص طرح کی تنقید وجود میں آئی تھی ۔

صفحات : ۴۳ + ۳۶۴ - قیمت : ۹۴ روپے

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ ، لاہور

یونیورسٹیوں میں مطالعۂ اقبال

(۱۹۰۸ء سے ۱۹۸۲ء تک)

سید معین الرحمٰن

۱

اردو زبان اور ادبیات سے متعلق موضوعات پر اردو میں پی ایچ ۔ ڈی کی اولین اسناد برعظیم پاک و ہند سے باہر دور سات سمندر پار یورپ سے عطا ہوئیں ۔ اردو ادب سے متعلق ڈاکٹریٹ کی سند فضیلت حاصل کرنے کا پہلا امتیاز ڈاکٹر سید عبداللطیف (ولادت : ۱۸۹۱ء ، وفات : ۱۹۷۱ء) کو حاصل ہوا[۱] جنہوں نے ۱۹۲۵ء میں کنگس کالج ، انگلستان کے شعبۂ انگریزی سے ''اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات'' کے موضوع پر تحقیقی کام کی تکمیل کی اور پی ایچ ۔ ڈی کی سند پائی ۔[۲]

غیر منقسم ہند میں اردو میں پی ایچ ۔ ڈی کی پہلی ڈگری اب سے کوئی باون برس پہلے ۱۹۳۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے دی گئی ۔ یہ امتیاز ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ (ولادت : مارچ ۱۸۹۹ء) کو حاصل

۱۔ ڈاکٹر گیان چند کا یہ کہنا درست نہیں کہ : ''اردو کے پہلے ڈاکٹر مرحوم محی الدین قادری زور تھے ۔''

(الف) آج کل ، دہلی ، اگست ۱۹۶۷ء ص ۲۷ ۔

(ب) تجزیے ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی ، ۱۹۷۳ء ص ۸۵

۲۔ حسن الدین احمد ، انجمن ، ولا اکیڈمی ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۷۳ء ص ۸۵ ۔

ہوا۔ ان کا موضوع تھا : ''جدید اردو شاعری کی خصوصیات و رجحانات''[۱]

اردو میں ڈی لٹ کی ایک ناتمام کوشش ڈاکٹر محی الدین قادری زور (۱۹۰۵ء - ۱۹۶۲ء) سے منسوب ہے جنھوں نے ۱۹۲۹ء میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقین اسٹڈیز لندن یونیورسٹی سے پی ایچ - ڈی کی سند حاصل کی ۔ ڈاکٹر گیان چند کے بقول ڈاکٹر زور :

''۱۹۲۹ء میں لندن سے پی ایچ - ڈی کرنے کے بعد ۔ ۔ ۔ ڈی لٹ کے لیے پیرس پہنچے اور پروفیسر جیولز بلاک کی رہنمائی میں ''گجراتی فارم آف ہندوستانی'' پر مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اسے پورا نہ کیا ۔ ۔ ۔''[۲]

وہ یہ مقالہ کامیابی کے ساتھ پورا کر لیتے تو اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے پہلے اسکالر کا امتیاز ان کا مقدر ہوتا ۔ ۔ ۔ اردو میں ڈی لٹ کی سب سے پہلی ڈگری حاصل کرنے کا اعزاز برسوں بعد ، ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین (۱۸۹۸ء—۱۹۷۵ء) کو حاصل ہوا ۔[۳] یہ سند امتیاز انہیں الہ آباد یونیورسٹی سے ''اردو شاعری پر مذہب کا اثر ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء'' کے موضوع پر کام کے سلسلے میں عطا کی گئی ۔[۴]

۱- ''دو برس بعد ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کو ان کے تحقیقی مقالے : ''پنجابی ادب کا تاریخی جائزہ'' پر پنجاب یونیورسٹی ، لاہور سے ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی گئی''

(تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ، ۱۹۶۲ء ، ص ۱۷۵)

۲- (الف) لسانی مطالعے ، نیشنل بک ٹرسٹ ، انڈیا ، دھلی ، ۱۹۷۳ء ص ۲۶۴ -

(ب) سب رس ، کراچی دسمبر ۱۹۷۸ء ، جنوری ۱۹۷۹ء ، ص ۸۵ -

۳- ہفت روزہ ہماری زبان ، دھلی ، ۸ مئی ۱۹۷۹ء ص ۳ -

۴- ''۱۹۲۸ء میں ایم - اے کی سند لینے کے بعد (ڈاکٹر سید اعجاز حسین) نے پی ایچ - ڈی کے لیے ریسرچ میں داخلہ لے لیا تھا ، موضوع مقالہ تھا : ''اردو شاعری پر تصوف کا اثر'' لیکن خدا معلوم

مذکورہ اصحاب اور موضوعات کے علاوہ ۱۹۵۷ء تک میرے علم اور یقین کی حد تک بہ ترتیب ذیل اردو ادبیات و شخصیات سے متعلق ان بارہ چودہ موضوعات پر اہل علم نے تحقیقی کام کی تکمیل کی اور صلے میں مختلف جامعات سے پی ایچ ۔ ڈی کی اسناد پائیں ۔

۱۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور : اردو زبان اور ادب کی تنقیدی تاریخ ۱۷۲۰ء تک[1]
لندن یونیورسٹی ، ۱۹۲۹ء

کیوں ، مقالہ پیش نہیں کیا ۔ ۔ ۔ (برسوں) بعد انہوں نے ڈی لٹ کی سند لینے کی ٹھانی اور مقالہ بہ عنوان ''مذہب و شاعری'' تیار کیا ۔ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو موضوع پر ڈی لٹ کی سند لینے والے وہ پہلے شخص (ہیں) ۔ ۔ ۔''

(مالک رام ، تذکرۂ معاصرین ، جلد ۳ ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی ۱۹۷۸ء ، ص ۲۲۰)

۱۔ ڈاکٹر زور کے پی ایچ ۔ ڈی کے موضوع کے بارے میں ایک عام غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ :

○ ''ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۱۹۲۹ء میں لندن یونیورسٹی سے ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی صوتیات پر ڈگری لی ۔ ۔'' ڈاکٹر گیان چند :

(ا) آج کل ، دہلی ، اگست ۱۹۶۷ء ص ۲۷ ۔

(ب) تجزیے ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی ۱۹۷۳ء ، ۳۵ ۔

○ ڈاکٹر زور نے ''آریائی زبانوں کا تقابلی مطالعہ'' کے موضوع پر لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ ۔ ۔'' (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ، چہرہ چہرہ داستان ، نیشنل بکڈپو ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۷۷ ، ص ۲۷) ۔

۲۔ ڈاکٹر محمد حفیظ سید : قاضی محمود بحری ۔ بارہویں صدی ہجری کا ایک صوفی شاعر ۔ اس

○ ''ڈاکٹر زور (نے) آریائی زبانوں کا تقابلی مطالعہ (پر) اردو کا تحقیقی کام کرکے پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری لی''
(سید حرمت الاکرام ، سب رس ، کراچی ، دسمبر ۱۹۷۸ء جنوری ۱۹۷۹ء ، ص ۹۹) ۔

''موضوع'' کے بارے میں یہ غلط فہمی غالباً'' ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر زور کے ایک مکالے پر مبنی ہے :

''ایک بار میں نے بھوپال کے اسٹیشن پر ڈاکٹر زور سے پوچھا کہ آپ کو پی ایچ ۔ ڈی کس کتاب پر ملی تھی ؟ انہوں نے کہا کہ ''ہندوستانی صوتیات'' اور ''اردو شہ پارے'' پر۔ چونکہ ڈاکٹر زور کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ۱۹۲۹ء میں مل چکی تھی اور یہ کتابیں اس کے بعد مرتب ہوئیں اس سے ظاہر ہے کہ ان کا تحقیقی مقالہ ان کتابوں کے نقش اول کا مرقع ہو گا ۔''
(ڈاکٹر گیان چند ، لسانی مطالعے ، نیشنل بک ٹرسٹ ، انڈیا ، دھلی ۱۹۷۳ء ، ص ۲۶۳) ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کے پی ایچ ۔ ڈی کا تھیسس اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز ، لندن یونیورسٹی میں محفوظ ہے اور اس کا موضوع یہ ہے :

"A Critical History of Urdu Language and Literature down to the year 1720."

یہ مقالہ آج تک چھپا نہیں ہے اور لندن سے باہر کے اسکالرز کے لیے اس سے استفادہ ممکن نہیں ، اس لیے کہ بد قسمتی سے متعلقہ یونیورسٹی کے قواعد ، مقالہ نگار کی اجازت کے بغیر ، مقالے کی فوٹو سٹیٹ نقل فراہم کرنے میں مزاحم ہیں ۔ (پروفیسر کرسٹوفر شیکل ، اینول آف اردو اسٹڈیز ، شکاگو ، ۱۹۸۲ء ، ص ۳۸) ۔

کا عہد ، زندگی اور کارنامے[1]
لندن یونیورسٹی ، ۱۹۳۲ء

۳۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین : نو طرز مرصع[2] کا تقابلی مطالعہ اور اردو نثر کی تاریخ ابتدا تا ۱۷۷۵ء[3]
لندن یونیورسٹی ، ۱۹۳۳ء

۴۔ ڈاکٹر میاں تصدق حسین خالد : حالی بحیثیت شاعر ، نقاد اور سوانح نگار اور اردو ادب پر حالی کے اثرات[4]
لندن یونیورسٹی ، ۱۹۳۵ء

۵۔ ڈاکٹر محمد صادق : محمد حسین آزاد ، حیات ، خدمات اور اثرات[5]
پنجاب یونیورسٹی لاہور ، ۱۹۳۹ء

۱۔ پروفیسر کرسٹوفر شیکل ، اینول آف اردو اسٹڈیز ، شکاگو ، ۱۹۸۲ء ، ص ۱۴۸ ۔

۲۔ پروفیسر کرسٹوفر شیکل ، اینول آف اردو اسٹڈیز ، شکاگو ، ۱۹۸۲ء ، ص ۱۴۸ ۔

۳۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین (۱۸۹۵ء—۱۹۵۵ء) کے صاحبزادے سید شاکر سجاد اور بعض دوسرے مثلاً اہل علم خواجہ حمیدالدین شاہد ، ضیاءالدین برنی مرحوم کا یہ کہنا درست نہیں کہ ڈاکٹر سید سجاد حسین نے لندن یونیورسٹی سے ''ہند آریائی فلسفے میں پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری لی'' ۔ رجوع کیجیے : سب رس ، کراچی ، اگست ۱۹۸۰ء ص ۱۷ ، ص ۷ اور ص ۱۰ (علی الترتیب) ۔

۴۔ پروفیسر کرسٹوفر شیکل ، اینول آف اردو اسٹڈیز ، شکاگو ، ۱۹۸۲ء ، ص ۱۴۸ ۔

۵۔ مقالہ پی ایچ ڈی ، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، لاہور کال نمبر : ا ۳۶۸ ص ، ۲۹۲۳ء ۸۹۱ ق ۔

۶- ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ : اردو ناول اور افسانے کا ارتقاء[۱]
لندن یونیورسٹی ، ۱۹۴۰ء

۷- ڈاکٹر سید رفیق حسین[۲] اردو غزل اور اس کی نشو و نما ۱۸۵۷ء تک[۳]
الہ آباد یونیورسٹی[۴] ، ۱۹۴۲ء

۸- ڈاکٹر عشرت حسن انور : دی میٹا فزکس آف اقبال[۵] :
(مابعد الطبیعات اقبال)
علی گڑھ ، ۱۹۴۳ء

۹- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی : لکھنؤ کا دبستان شاعری[۶]
علی گڑھ ، ۱۹۴۳ء

۱۰- ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی : دلی کا دبستان شاعری[۷]
علی گڑھ ، ۱۹۴۳ء

۱- فرام پردہ ٹو پارلیمنٹ ، بیگم شائستہ اکرام اللہ ، لندن ، ۱۹۶۳ء ، ص ۸۴ -

۲- ڈاکٹر گیان چند کا یہ کہنا خلاف واقعہ ہے کہ ''ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اردو کے پہلے ڈاکٹر سید رفیق حسین ہیں'' :

(الف) آج کل ، دھلی ، اگست ۱۹۶۷ء ص ۲۷ -

(ب) تجزیے ، دھلی ۱۹۷۳ ، ص ۴۵ -

۳- ہفت روزہ ہماری زبان ، دھلی ، ۸ مئی ۱۹۷۹ء ، ص ۳ -

۴- پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ''یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام الہ آباد یونیورسٹی سے شروع ہوا -'' [ابلاغ ، رانچی ، جلد ۱ ، شمارہ ۱ ، ۱۹۸۱ء ، ص ۸۶ ، ۸۷]

۵- طبع اول : شیخ محمد اشرف ، لاہور ، ۱۹۴۴ء -

۶- طبع اول : سلسلہ مطبوعات ، مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ، طبع دوم : لاہور ۱۹۵۵ء -

۷- طبع اول : انجمن ترقی اردو ، کراچی ۱۹۴۹ء -

۱۱- ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی : اردو شاعری میں فطرت نگاری[1]
الہ آباد ، ۱۹۴۴ء

۱۲- ڈاکٹر جگت نرائن پیکروال :[2] پریم چند ۔ حیات اور کارنامے[3]
لکھنؤ ، ۱۹۴۵ء

۱۳- ڈاکٹر عبارت یار خاں : بریلوی اردو تنقید کا ارتقا[4]
لکھنؤ ، ۱۹۴۶ء

۱۴- ڈاکٹر محمد عزیز : اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ[5]
علی گڑھ ، ۱۹۴۷ء

پیش نظر تفصیل سے ظاہر ہے کہ ''اقبال'' ان چند ممتاز شخصیات میں سے ایک ہیں جن کے ذکر و فکر کو غیر منقسم ہند میں پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کے لیے اول اول منتخب کیا گیا۔ اردو شعر و ادب کی کوئی ساڑھے پانچ صدی کی تاریخ میں اقبال سے پہلے صرف تین اشخاص کو پاک و ہند یا بیرون ہند یورپ میں پی ایچ ۔ ڈی کا موضوع بنایا گیا ۔

قاضی محمود بحری کو ان کے انتقال (۱۷۱۷ء) کے قریب سوا دو سو برس بعد ، حالی کو ان کے وصال (۱۹۱۴ء) کے کوئی بیس اکیس برس بعد اور آزاد کو ان کے انتقال (۱۹۱۰ء) کے کوئی تیس برس بعد۔

۱- ہفت روزہ، ہماری زبان ، دہلی ، ۸ مئی ۱۹۷۹ ، ص ۳ -

۲- ''کیا لطف ہے کہ اردو کے مرکز لکھنؤ کی یونیورسٹی سے اردو میں سب سے پہلا پی ایچ ۔ ڈی کرنے والا ایک غیر مسلم (جگت نرائن پیکروال) تھا ۔'' (ڈاکٹر گیان چند ، حقائق ، الہ آباد ، ۱۹۷۸ء ، ص ۲۲۵) ۔

۳- ہفت روزہ ، ہماری زبان ، دہلی ، ۱۵ جون ۱۹۷۹ء ، ص ۴ -

۴- طبع اول : انجمن ترقیٔ اردو پاکستان ، کراچی ، ۱۹۴۹ء -

۵- طبع اول : انجمن ترقیٔ اردو ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۵۵ء -

بعری اور حالی پر کیا گیا تحقیقی کام آج تک روز اشاعت کا منتظر اور طباعت کی روشنی سے محروم ہے۔ آزاد پر ڈاکٹر محمد صادق کا تھیسس، ڈگری ملنے کے ایک چوتھائی صدی بعد شائع ہوا جب کہ اقبال اپنی زندگی ہی میں تحقیق اور توجہ کا موضوع اور مرکز بن گئے تھے، اور ان کے انتقال (۱۹۳۸ء) کے پانچویں برس ان پر کیے گئے تحقیقی کام پر ڈگری تفویض ہو گئی اور ڈگری تفویض کیے جانے کے معاً بعد یہ تھیسس ۱۹۴۴ء میں شائع بھی ہو گیا۔ یہ امتیاز اور اختصاص اقبال کے علاوہ اردو شعر و ادب کی کسی دوسری شخصیت کو نصیب نہیں!

۲

اقبال پر پی ایچ۔ ڈی کا کام کرنے کا اولین اعزاز عشرت حسن انور کو حاصل ہوا۔ ان کا مقالہ: "The Metaphysics of Iqbal" انگریزی میں ہے اور اس پر انہیں شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ڈاکٹر سید ظفرالحسن کی زیر نگرانی کام کی تکمیل پر ۱۹۴۳ء میں ڈگری ملی۔ ۱۹۴۴ء میں یہ مقالہ لاہور سے شائع ہوا۔[1] ۱۹۷۷ء میں اقبال کی صد سالہ تقریبات ولادت کے موقع پر اس مقالے کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں سامنے آیا۔[2]

قیام پاکستان ۱۹۴۷ء کے بعد بوجوہ اقبال پر توجہ بڑھی اور برعظیم پاک و ہند سے باہر بھی وہ متعدد یونیورسٹیوں میں اعلیٰ علمی اسناد کے لیے تحقیق کا موضوع بنے۔ تقسیم ہند ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک کے تیس برسوں میں یعنی علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت تک کی حد زمانی میں میرے علم و نظر کی حد تک اقبال پر سات مختلف زبانوں میں پی ایچ ڈی کے لیے

۱۔ کتابیاتی کوائف کے لیے رجوع کیجیے "جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ" از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، ۱۹۷۷ء ص ۵۹—۶۰۔

۲۔ اقبال کی مابعدالطبیعات، مترجم: ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحات ۹۹۔

اکیس مقالے لکھے گئے ۔ ان میں سے نو انگریزی زبان میں ہیں ، چھ اردو زبان میں ، ایک جرمن ، ایک فرینچ ، ایک عربی اور ایک فارسی زبان ایک چیک میں ۔ ایک مقالے پر جو انگریزی میں ہے ابھی ڈگری تفویض نہیں ہوئی ۔[1] بقیہ بیس مقالات پر دنیا کے نو ممالک : (پاکستان ، ہندوستان ، ایران ، مصر ، چیکوسلواکیہ ، انگلستان ، فرانس ، جرمنی اور امریکہ) کی پندرہ یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دی جا چکی ہیں ۔

۱۹۴۳ء سے ۱۹۷۷ء تک کے ۳۵ برسوں میں مندرجہ بالا اکیس مقالات کے علاوہ جو براہ راست اقبال اور ان کے فکر و فن پر لکھے گئے ، پاک و ہند سے باہر کچھ ایسے تحقیقی مقالات بھی احاطۂ تحریر میں آئے ''اقبال'' جن کا مرکزی یا بنیادی موضوع نہیں ہے لیکن جن کا ایک یا بیشتر حصہ اقبال کی تعلیمات اور افکار و تصورات سے بحث کرتا ہے ، ایسے بعض مقالات کے کوائف دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے :

1. Dr. Walter B. Evans :
"The Genesis of the Pakistan Idea :
A Study of Hindu Muslim Relations"
Southern California, 1955.

2. Dr. Muneeruddin Chughtai :
"Muslim Politics in the Indo-Pakistan Subcontinent."
Oxford, 1960.

3. Dr. Lini S. May :
"Muslim Thought and Politics in India after 1857."
Columbia, 1963.

4. Dr. Mushirul Haqq :
"Religion and Politics in Muslim Iudia (1857-1947)".
McGill, 1967.

۱۔ Iqbal's Concept of Religion ، از : افتخار احمد چشتی ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ، نگران : علامہ علاء الدین صدیقی

5. Dr. Abdul Lateef :
"From Community to Nation : the Development of the Idea of Pakistan."
Southern Illinois, 1966.

6. Dr. Sam Iftikhar :
"A Pragmatic Approach to the Solution of Educational Problems in Pakistan."
Syracuse, 1968.

7. Dr. Absar Ahmad :
"Concept of Self and Self Identity in Contemporary Philosophy"
London, 1973.

پہلے پانچ اندراجات کے لیے ڈاکٹر ممتاز اے ۔ انور کی کتاب :

"Doctoral Research on Pakistan"

میرا ماخذ ہے[1] جو پاکستان کے بارے میں ۱۹۷۱ء تک غیر ملکی یونیورسٹیوں میں ڈاکٹریٹ کے لیے قبول کیے گئے مقالات کی ببلیو گرافی پر مشتمل ہے ۔

چھٹے اندراج کا ماخذ خود مقالہ نگار ہیں ۔ ڈاکٹر سام افتخار[2] لائبریری آف کانگرس ، واشنگٹن سے وابستہ ہیں اور اقبال انٹرنیشنل کانگرس ، منعقدہ لاہور (۲ - ۹ دسمبر ۱۹۷۷ء) میں امریکی مندوب کے طور پر تشریف لائے تھے ۔ اس موقع پر ڈاکٹر سام افتخار نے بتایا کہ انھوں نے ۱۹۶۸ء میں سراکیوس یونیورسٹی ، نیویارک سے ڈاکٹر رچرڈ کی زیر نگرانی مقالہ لکھ کر پی ایچ ۔ ڈی کی سند حاصل کی ۔ یہ مقالہ جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے ڈاکٹر سام افتخار کے بقول : مشرق اور مغرب کے فلاسفک ، سوشل ، پولیٹیکل اور ایجوکیشنل تصورات کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ہے اور مقالے

۱- مطبوعہ : پاک بک کارپوریشن ، لاہور ، اپریل ۱۹۷۶ء ۔

۲- ڈاکٹر ممتاز اے ۔ انور نے مقالہ نگار کا نام ''سیموئیل افتخار'' ریکارڈ کیا ہے جو درست نہیں ۔ انہیں ڈگری بھی ۱۹۶۸ء میں ملی ، ۱۹۶۹ء صحیح نہیں ۔ (ڈاکٹورل ریسرچ آن پاکستان ، لاہور ۱۹۷۶ء ، صفحہ ۱۹)

کا تین چوتھائی حصہ علامہ اقبال کے افکار اور حوالوں سے مزین ہے ۔''

اس سلسلے کے آخری حوالے کا ماخذ خود مقالہ نگار ڈاکٹر ابصار احمد ہیں جو شعبہ فلاسفی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے وابستہ ہیں ۔ انہوں نے اپنا تحقیقی کام پروفیسر ایچ ۔ ڈی لیوس (Prof. H.D. Lewis) کی نگرانی میں مکمل کیا ۔

۳

۱۹۷۷ء تک یونیورسٹیوں میں مطالعہ اقبال کے تحقیقی اکتساب کا جائزہ ، میں پہلی اقبال عالمی کانگرس (منعقدہ لاہور ۲ - ۹ دسمبر ۱۹۷۷ء) میں پیش کر چکا ۔ زیر نظر مقالے کو ۱۹۷۷ء کے بعد سے ۱۹۸۲ء تک کے پانچ برس کی حدِ زمانی میں دنیا بھر کی مختلف یونیورسٹیوں میں اقبال پر تکمیل شدہ یا زیر تکمیل تحقیقی کام کی پیش رفت کا ایک جائزہ خیال کرنا چاہیے جس میں اضافے اور مشورے کی ہر آواز میرے لیے خوشی کا باعث ہو گی ۔

۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء کے پانچ برسوں میں پاک و ہند کی مختلف یونیورسٹیوں میں اقبال پر جو تحقیقی کام پایہ تکمیل کو پہنچا ، اس کی معلوم تفصیل یہ ہے :

۱۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی :

اقبالیات—تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ

پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ، ۱۹۸۱ء

۲۔ ڈاکٹر چمن لال رینہ :

اقبال اور آروبندو

اقبال انسٹی ٹیوٹ ، کشمیر یونیورسٹی ۱۹۸۱ء

۳۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی طاہر :

اقبال پر مغربی اثرات گوہاٹی یونیورسٹی ، ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ڈاکٹر وحید قریشی کی رہنمائی میں کام مکمل کیا ۔ ان کے مقالے کو شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور سے ''اقبالیات'' کے سلسلے کے اولین مقالے کا امتیاز حاصل ہے ۔ ان کا یہ تحقیقی کام ، پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری ملنے کے بعد سال بھر ہی میں چھپ

کر عام دسترس میں آ چکا ۔[1]

ڈاکٹر چمن لال رینہ نے ''اقبال اور آروبندو'' کے موضوع پر تحقیقی کام انجام دیا ۔ اسی موضوع پر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ سے ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر ایم ۔ رفیق کو ڈگری تفویض ہوئی تھی ۔[2] ڈاکٹر رینہ نے پروفیسر آر ۔ کے ۔ شرما صدر شعبۂ ہندی ، کشمیر یونیورسٹی اور اقبال انسٹی ٹیوٹ ، سری نگر کے ڈائریکٹر پروفیسر آل احمد سرور کی زیر نگرانی پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی[3] تارا چرن رستوگی نے ''اقبال پر مغربی اثرات'' کے موضوع پر جموں و کشمیر یونیورسٹی ، سری نگر سے پی ایچ ۔ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرایا تھا ،[4] یہ ۱۹۷۶ء کی بات ہے ۔ اب ڈاکٹر گیان چند کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق انہوں نے اسی موضوع پر گوہاٹی یونیورسٹی سے انگریزی میں پی ایچ ۔ ڈی کی سند حاصل کی ہے ۔[5]

۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء کے پانچ برسوں میں اقبال انسٹی ٹیوٹ، سری نگر سے دس اسکالرز نے ایم فل کی ڈگری کے لیے تحقیقی کام کیا :

۱۔ محمد امین اندرابی	اقبال کے خطوط کا تنقیدی مطالعہ	۱۹۸۱ء
۲۔ نصرت اندرابی	حالی ، اکبر اور اقبال کی پیامی شاعری ۔ تقابلی مطالعہ	۱۹۸۱ء
۳۔ شفیقہ رسول	اقبال اور ہیومنزم	۱۹۸۱ء

۱۔ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ، اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور ، ۱۹۸۲ء ، صفحات ۲۰+۵۰۴+۴۶ ۔

۲۔ کوائف کے لیے رجوع کیجیے : جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ، لاہور ۱۹۷۷ء ، صفحہ ۶۹

۳۔ اقبالیات ، شمارہ ۲ ، اقبال انسٹی ٹیوٹ ، کشمیر یونیورسٹی ، سری نگر ، ۱۹۸۲ء ، صفحہ ۲۶۹

۴۔ عبدالقوی دسنوی ، اقبال ریویو ، لاہور ، جولائی ۱۹۷۶ء ، صفحہ ۱۰۵

۵۔ ڈاکٹر گیان چند ، حقائق ، الہ آباد، ۱۹۷۸ء ، صفحہ ۲۲۵-۲۲۶

۴- بلقیس سراج	اردو نظم میں اقبال کا کارنامہ	۱۹۸۱ء
۵- زاهده پروین	اقبال پر غالب کے فکر و فن کا اثر	۱۹۸۲ء
۶- فریده بانو	اقبال اور کشمیر	۱۹۸۲ء
۷- زرینہ بٹ	اقبال کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ	۱۹۸۲ء
۸- بشیر احمد نحوی	اقبال اور تصوف	۱۹۸۲ء
۹- نذیر احمد شیخ	اقبال اور سوشلزم	۱۹۸۲ء
۱۰- طالعہ افروز	اقبال اور فنون لطیفہ	۱۹۸۲ء
۱۱- نثار حسین مسعودی	اقبال اور مولانا رومی	۱۹۸۲ء
۱۲- سبھاش چندر آنند	اقبال اور جدید اردو شاعری	۱۹۸۲ء
۱۳- محمد شفیع سنبلی	کشمیری شعراء پر اقبال کا اثر	۱۹۸۲ء

ان اسکالرز میں سے پہلے دس کو ایم - فل کی ڈگری مل چکی ، موخر الذکر تین اسکالرز کام میں مصروف ہیں - ایم فل پا لینے والے اسکالرز میں سے پانچ : (محمد امین اندرابی ، نصرت اندرابی ، شفیقہ رسول ، بلقیس سراج اور فریدہ بانو) کا پی ایچ ڈی کے لیے داخلہ ہو چکا ہے اور وہ اپنے کام میں مصروف ہیں -[1] ان سب اسکالرز کے کام کی رهنمائی کی خدمت بحیثیت مجموعی پروفیسر آل احمد سرور کے سپرد رہی - ایک دوسرے ماخذ کے مطابق[2] ایک اسکالر : خورشید اختر نے ''اقبال اور مارکسزم'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر جواهر لال نہرو یونیورسٹی ، دهلی سے ایم - فل کی ڈگری حاصل کی ہے - اس مقالے میں کلام اقبال میں مارکسزم کے اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے -

---

۱- (الف) اقبالیات ، شمارہ ۲ ، اقبال انسٹی ٹیوٹ ، سری نگر ، ۱۹۸۲ء ، صفحہ ۲۶۹-۲۷۰

(ب) اقبال انسٹی ٹیوٹ منزل بہ منزل ، کبیر احمد جائسی ، سری نگر ، ۱۹۸۳ء

۲- محمد نعمان خان ، مجلہ سیفیہ ، یادگار اقبال ، جلد ہفتم ، بھوپال ، ۱۹۷۹ء—۱۹۸۰ء ، صفحہ ۱۲۴

۱۹۸۲ء تک کے پانچ برسوں میں ، شعبۂ اردو ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور سے بہ تفصیل ذیل چار اسکالرز ، پی ایچ ۔ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرانے میں کامیاب ہو سکے[1] :

۱۔ محمد صدیق جاوید :
فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ
نگران : ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ۱۹۷۸ء

۲۔ ناہید سلطانہ :
کلام اقبال میں اعلام و اماکن کی فکری اہمیت
ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ، ۱۹۷۹ء

۳۔ ثریا جبین ملک :
شارحین اقبال ۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ
مرزا محمد منور ، ۱۹۸۱ء

۴۔ صابر حسین کلوروی :
باقیاتِ شعرِ اقبال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ، اور
ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ، ۱۹۸۲ء

پہلے اسکالر محمد صدیق جاوید ، اپنا تحقیقی کام اور سفر تقریباً مکمل کر چکے ہیں ، امید ہے کہ وہ مقالہ اسی برس ڈگری کے لیے پیش کر دیں گے ۔ باقی تین اسکالرز کام میں مصروف ہیں ۔ ناہید سلطانہ کا کام تکمیل کے مرحلے میں ہے ۔ ثریا جبین اور صابر حسین ابتدائی تیاری کی منزل میں ہیں ۔

دسمبر ۱۹۸۰ء سے ایک کل وقتی وظیفہ یاب ریسرچ اسکالر محمد یوسف مغل ، شعبۂ اقبالیات ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور سے وابستہ ہیں ۔ پی ایچ ۔ ڈی کے لیے ان کا منظور شدہ موضوع ہے : ''حضرت علامہ اقبال کے فکر و

۱۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : (الف) اورینٹل کالج میگزین ، لاہور شمارہ خاص ۱۹۸۲ء ، صفحہ ۳۵۱-۳۵۴ ، (ب) اخبار اردو ، کراچی ، اپریل ۱۹۸۳ء ، صفحہ ۲۰-۲۱

فن پر عربی فکر و ادب کے اثرات'' ان کے نگران شعبۂ اقبالیات کے چیرمین پروفیسر مرزا محمد منور ہیں ۔ محمد یوسف مغل ، تحقیقی کام میں مصروف ہیں ۔

پچھلے پانچ برسوں میں ہندوستان کی تین یونیورسٹیوں میں اقبالیات سے متعلق پی ایچ ۔ ڈی کے لیے نیا رجسٹریشن ہوا :

۱- غلام نبی حلیم :
''اقبال اور تصوف''
نگران : ڈاکٹر اسد اللہ کامل ، شعبۂ اردو ، کشمیر یونیورسٹی ،[۱] ۱۹۷۸ء

۲- دینش چند :
''اقبال اور دن کر''
نگران : ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین اور ڈاکٹر تارا چرن رستوگی شعبۂ اردو ، کلکتہ یونیورسٹی ،[۲] ۱۹۷۹ء

۳- فہمیدہ خاتون :
''اقبال کی شاعری میں ہندوستانی قومیت کے تصورات''
ڈاکٹر عبدالرؤف ، شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی ،[۳] ۱۹۷۹ء

اقبال کے صد سالہ جشن ولادت سے پہلے ہندوستان کی چھ یونیورسٹیوں میں دس اسکالرز اقبال سے متعلق پی ایچ ۔ ڈی کی سطح کے تحقیقی کام میں مصروف تھے[۴] ۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کو اس عرصے میں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی ، دو کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کام میں منہمک ہیں :

۱- ہفت روزہ ، ہماری زبان ، دہلی یکم جون ۱۹۷۹ء ، صفحہ ۴
۲- ہفت روزہ ، ہماری زبان ، دہلی ، ۲۲ - جون ۱۹۷۹ء ، صفحہ ۴
۳- ہفت روزہ ، ہماری زبان ، دہلی ، ۲۲ - جولائی ۱۹۷۹ء ، صفحہ ۴
۴- تفصیل کے لیے رجوع کیجیے : جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ، لاہور ، ۱۹۷۷ء ، صفحہ ۷-۳۱

۱- شہناز اختر :
''اقبال کے فکر و فن کے ساجی اور تہذیبی رشتے''[1]
نگران : ڈاکٹر عبدالحق شعبۂ اردو ، دہلی یونیورسٹی ، ۱۹۷۹ء

۲- محمد ایوب خان :
''اقبال اور اردو غزل''[2]
نگران : عبدالقوی دسنوی شعبۂ اردو ، سیفیہ کالج ، بھوپال ، ۱۹۸۰ء

باقی سات کی خیریت کے بارے میں اس دوران کچھ سن گن نہیں مل پائی ، عجب نہیں کہ بعض ترک کار کر چکے ہوں اور کچھ تکمیل کار میں لگے ہوئے ہوں یا منزل مراد پا چکے ہوں ۔

پچھلے پانچ سال کی مدت میں ایم ۔ اے کی جزوی تکمیل کے سلسلے میں یونیورسٹیوں میں لکھے گئے مقالات کا احاطہ ایک بڑی فرصت چاہتا ہے ، صرف پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ہی کے مختلف شعبوں میں ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک ایم ۔ اے کے لیے لکھے گئے مقالات کی تعداد ایک چوتھائی سینکڑے سے کم نہیں ۔

اقبال کے افکار و ادبیات پر ان کے انتقال کے بعد اب تک کے پینتالیس برسوں میں مشرق تا مغرب پی ایچ ۔ ڈی یا ایم ۔ فل وغیرہ کی ۳۵ ہی کے لگ بھگ اسناد دی جا چکی ہیں ۔ ایم اے کے جو تنقیدی اور تحقیقی مقالات پاکستان اور بھارت کی مختلف یونیورسٹیوں میں اب تک لکھے گئے ان کی تعداد بلامبالغہ سینکڑوں تک پہنچتی ہے ۔

اقبال یونیورسٹیوں میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ٹھہرے ۔ یہ امتیاز اردو شعر و ادب کی پوری تاریخ میں ، کسی بھی دور اور کسی بھی مرتبے کی کسی دوسری شخصیت کے حصے میں نہیں آیا ۔ ولی ، میر اور غالب اردو ادب کے تین مسلمہ اکابر ہیں ۔ اقبال ان کے پیش رو ہیں لیکن وہ ولی ، میر یا غالب سے ان معنی میں خوش نصیب

۱- ہفت روزہ ، ہماری زبان ، دہلی ، ۱۵ - مئی ۱۹۷۹ء ، صفحہ ۵
۲- مجلہ سیفیہ ، یادگار اقبال ، جلد ہفتم ، بھوپال ، ۱۹۸۰ء-۱۹۷۹ء ، صفحہ ۳۲۹

ہیں کہ ولی کو ان کے انتقال (۱۷۲۰ - ۱۷۲۵) کے کوئی ڈھائی صدی بعد ڈاکٹریٹ کا موضوع بنایا گیا۔[1] میر (۱۸۱۰ء) پر ڈیڑھ صدی بعد[2] اور غالب پر ان کے انتقال (۱۸۶۹ء) کی کوئی آٹھ دہائیاں گزر جانے کے بعد ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ اسناد فضیلت عطا کی گئیں۔[3] جبکہ اقبال پر ان کے انتقال کے پانچویں برس ہی ڈگری مل گئی اور ڈگری ملنے کا یہ عمل ایک فی سال کی اوسط سے آج تک چلا آ رہا ہے۔

اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ علامہ اقبال ہمارے شعر و ادب کی ان خوش قسمت استثنیات میں سے ہیں جو حین حیات اہل علم کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں اور ہماری یونیورسٹیوں کا تو وہ بالخصوص بہت ہی مرغوب موضوع رہے ہیں اور آج بھی وہ سب سے زیادہ محبوب موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کشش اور توجہ میں ان کی عظمت، وسعت، ان کی گہرائی اور بحیثیت مجموعی ان کی آفاقیت کا اشارہ مضمر ہے۔

[دوسری اقبال عالمی کانگرس، لاہور ۹ - ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء کے لیے لکھا گیا]

۱۔ ''کلیات ولی'' (ترتیب و تہذیب)، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، لکھنؤ، ڈی لٹ، ۱۹۵۷ء (ہفت روزہ، ہماری زبان، دہلی ۱۵ - جون ۱۹۷۹ء، صفحہ ۳)

۲۔ ''مطالعۂ میر''، ڈاکٹر سید نواب حسین، الہ آباد، پی ایچ ڈی، ۱۹۵۰ء (ہفت روزہ ہماری زبان، دہلی، ۸ - مئی ۱۹۷۹ء، صفحہ ۳)

۳۔ ''غالب: ہز لائف اینڈ پرشین پوئٹری'' ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی، بمبئی، پی ایچ - ڈی ۱۹۴۷ء (شہنشاہ سخن مرزا غالب کے فارسی کلام پر ناقدانہ نظر، کراچی ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۵)

علامہ اقبال

(صوفی تبسم کی نظر میں)

مرتبہ

نثار احمد قریشی

حضرت علامہ اقبالؒ کے فکر و فن پر صوفی تبسم (مرحوم) نے وقتاً فوقتاً تقاریر اور مضامین کی شکل میں جو کچھ لکھا ، وہ علامہ سے ان کی ذہنی وابستگی کا نتیجہ ہیں ۔ یہ مواد مختلف رسائل اور اخبارات میں بکھرا پڑا ہے ، ان میں سے جو مل سکا ، یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش خدمت ہے ۔ ان مضامین کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے تاکہ ہر مضمون کا سالِ تصنیف قاری کے ذہن میں رہے ۔

علامہ اقبالؒ کے ساتھ صوفی تبسم کی عقیدت کا آغاز طالب علمی کے زمانے سے ہوا اور تاحیات قائم رہا ۔ انہوں نے علامہ کے افکار و نظریات کو بحیثیت استاد اور شارح ایک طویل مدت تک طلبا کی کئی نسلوں کے ذہنوں میں منتقل کرنے فریضہ انجام دیا ۔

بحیثیت مجموعی ، یہ کتاب اقبالیات کے مطالعہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے ۔

صفحات : ۸ + ۲۱۷ - قیمت : ۳۰ روپے

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ ، لاہور

علامہ اقبال اور بلوچی ادب

نادر قمرانی

بخود خزیدہ و محکم چو کوهساران زی
چوخس مزی کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

ایک انوکھی آواز ابھری اس کی گونج کوہ و صحرا میں پھیل گئی۔ اس میں تلخی، درشتگی اور شیرینی بھی تھی۔ پارس نے اسے مزدک سمجھا اور ہند نے اسے کالی داس کہا۔ مگر یہ جلال الدین رومی کی روح تھی جو آدم گم گشتہ کی تلاش میں اقبال کے روپ میں نمودار ہوئی اور:

حرف بااھل زمین زندانہ گفت
حور و جنّت را بت و بتخانہ گفت

شاعر نے اسے شاعرانہ نکتہ سنجی کہا۔ اللہ والوں نے اسے تصوف کا نام دیا۔ اور فقیہہ شہر چیں بہ جبیں ہوئے۔

واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

ہر شخص نے اپنے ظرف اور بساط کے مطابق علامہ اقبال کو سمجھا اور پہچانا اور اسی اندازے کے مطابق ان سے اثر لیا۔ کسی نے انہیں قومی شاعر سمجھا۔ کسی نے بین الاقوامی شاعر کہا۔ ایک بات سب کی سمجھ میں مشترک تھی۔ وہ یہ کہ اقبال کے کلام میں حرکت ہے "عمل" گرمی رفتار اور خودی کا شعلہ ہے جو آدمی کی شخصیت کو روشن کر دیتا ہے۔

اقبال فلسفہ خودی کے پیام بر اور پان اسلام ازم کے داعی ہیں۔ اسلامی اتحاد کے علمبردار ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

اس اتحاد کی خاطر اقبال کبھی عالم عرب کو بیدار کرتا ہے ، کبھی عجم کو پکارتا ہے ، کبھی ترک اور افغان کو ان کا منصب یاد دلاتا ہے۔ اور کبھی ہندی مسلمان کو اس کی عظمت رفتہ سے روشناس کراتا ہے۔ اور جب بلوچستان پہنچتا ہے تو بڈھے بلوچ کا روپ دھار کر بلوچوں کو خواب خرگوش سے جگاتا ہے۔

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارہ
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا

علامہ اقبال نے برصغیر میں اسلامیان ہند کے لئے ایک الگ مملکت کے قیام کی تجویز پیش کی۔ تاکہ مسلمان قرآن و سنت کے مطابق اپنی جدا گانہ اور آزاد سر زمین پر زندگی بسر کر سکیں ، اقبال کا یہ پُر سوز مطالبہ مسلمانوں کے دل میں اثر کر گیا ۔ انہوں نے اس تجویز کو دل سے قبول کیا ۔ شدید جد و جہد اور بے پناہ قربانیوں کے بعد آزادی حاصل کی۔

علامہ اقبال کی آواز پر لبیک کہنے کا مطلب یہ تھا کہ قوم نے ان کے مافی الضمیر کو پا لیا تھا ۔ شاعروں ، ادیبوں اور دانشوروں نے ان کے فلسفے کو سمجھ لیا تھا ۔ ان کے پیغام کو قبول کر کے عوام تک پہنچانے کا بیڑا اٹھا لیا تھا ۔ علامہ اقبال کے کلام کے تراجم دنیا کی اکثر زبانوں میں کئے جا چکے ہیں ۔ ملک کے اندر بھی علاقائی زبانوں کے شعرا اور قلم کاروں نے اس سلسلے میں اہم کام کیا ہے اور مسلسل کام کر رہے ہیں کیونکہ اقبال زمانے کا تسلسل ہیں اور ان پر ہمیشہ کام ہوتا رہے گا۔

بلوچی زبان میں اقبال پر جو کام ہوا ہے ۔ وہ کئی لحاظ سے تاریخی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے ۔ اس کے ایک سرسری جائزے کے لئے بھی ایک دفتر درکار ہے ۔ اس مختصر مضمون میں بس اتنی ہی گنجائش ہے کہ اقبال کے کلام کے تراجم اور ان کے کلام کے اثرات کی طرف اشارے کئے جا سکیں۔

بلوچی کی جدید شاعری پر اقبال کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے موجودہ دور کے بلوچی شعرا کے سرخیل اور ملک الشعرا میر گل خان نصیر

کی شاعری کے بعض پہلو پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں علامہ کی فکر اور انداز بیان کے اثرات نمایاں ہیں ۔ میر گل خان کے شعروں کے پہلے مجموعے کا نام "گلبانگ" ہے جو یقیناً "بانگ درا" کے زیر اثر اس نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ میر گل خان نصیر نے علامہ کے کلام کے تراجم بھی کئے ۔ اور تصانیف بھی لکھی ہیں ۔ ہم یہاں فکری اثرات کے چند نمونے پیش کرتے ہیں ۔ اقبال نے کہتا ہے :

گر تو میخواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور میر گل خان کہتا ہے ۔

توچی کسے مسلماں نبیستئے صاحب ایماں و قرآں لستیئے
گردن روگشتن مفا گردن بچن تو نہی ء زیر فرمان بیتئے
سجدگء کپتی پرنگء درگہء لا اللہ ء تو نگہباں نبیتئے
مومن و کفرء گلامی چون بیت تو گلام بیتئے مسلماں نہ بیتئے

میر گل خان نصیر کے ان بلوچی اشعار کا مطلب کچھ یوں ہے "اگر تم صاحب ایمان و قرآن نہیں ہو تو سب کچھ ہو سکتے ہو مگر مسلمان نہیں ہو سکتے ۔ تمہاری مسلمانی اس وقت تک مکمل نہیں جب تک کہ تم ہر طرح سے رسول خدا صلعم کی پیروی نہیں کرو گے ۔ اگر میں غلط کہتا ہوں تو بے شک گردن زدنی ہوں تم جو فرنگ کے در پر سجدہ ریز ہو ۔ تو لا اللہ کی نگہبان کے لائق کیسے ٹھہرائے جا سکتے ہو ۔ مومن اور پھر کافر کی غلامی یہ نا ممکن ہے ۔ اگر تم نے غلامی قبول کی تو تم مسلمان نہیں ہو ۔"

اقبال کہتا ہے :

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگ آدم ، ننگ دیں ، ننگ وطن !

اس موضوع پر میر گل خان نصیر کے بلوچی اشعار ملاحظہ ہوں ۔

اے وتی قوم عزت و ننگء اے وتی ملک و تاج واورنگء
گرتہ سودا گون واجہ افرنگء است گدارے جعفرے رنگء
اے وتی قوم و دین و ایمانء گرتہ سودا بہ لنکھیے نانء

ترجمہ : یعنی جس نے قوم کی عزت و ناموس وطن کی آزادی اور اقتدار کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا ، وہ جعفر جیسا غدار ہی ہو سکتا

ہے - جس نے قوم ، وطن ، دین اور ایمان کو ایک لقمہ نان کی خاطر فروخت کر دیا -

فلسفہ خودی کے بارے میں اقبال کہتا ہے :

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجرو طغرل سے کم شکوہ فقیر

اور یہی موضوع میر گل خان نصیر کے ہاں کچھ اس طرح ہے -

وت بوشتت وتی پا دانی سرا وت واجہ بیئے کارانی وتی
تقدیر گئی دستنت مگر ، پرواہ پہ طلا وسیم مکن

ترجمہ : خود پہ بھروسہ کرو - اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ ، تم حکمران ہو - تمہاری تقدیر تمہارے ہاتھوں میں ہے مال و زر کی پروا مت کرو -

اقبال کہتا ہے :

ع شمشیر و سناں اول ، طاؤس و رباب آخر

گل خان نصیر نے اسی بات کو اس طرح کہا ہے :

اِشتکن سگارا ، زرتگن چنگ و رباب
داتگن ماتی دیاءَ بستگن زہرین تناب

اقبال کہتا ہے :

ع ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

گل خان نصیر کے الفاظ میں یہی موضوع اس طرح ہے -

وت شمے دستءَ انت مردان بخت و تقدیرے مہار
وخت ہمیشدت اڑز گفت آزاتیءَ مردان توار

ترجمہ : مسلمانوں نے شمشیر آبدار کو رکھ کر چنگ و رباب کو سنبھالا - اس لئے زنجیروں میں جکڑے گئے -

اے مرد مومن تمہاری تقدیر تمہارے ہاتھوں میں ہے اٹھو اور آزادی کا نعرہ لگاؤ -

میر گل خان نصیر قوم کے جوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں :

قدم قدم روان بیت دلیرو پہلوان بیت
گر آسمان شمے سرا پرشت پر غضب بیت
پہ نام و ننگ آدمی سران وتی دیان بیت

ترجمہ : بڑھے چلو بڑھے چلو ، دلیر اور پہلوان بنو - اگر تم پر آسمان ٹوٹے تو تم اور بھی غضبناک ہو جاؤ - اپنی جان قربان کرکے انسانیت کی لاج رکھو -

علامہ کے ہاں دل کو ایک خاص مقام حاصل ہے کہتے ہیں :

دل کی آزادی شہنشاہی ! شکم سامان موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے ، دل یا شکم ؟

دل کے بارے میں علامہ اقبال نے بہت کچھ کہا ہے بلوچی کے کہنہ شاعر ، ادیب اور صوفی جناب پیر محمد زبیرانی کے اشعار بھی سنیئے -

نہ ہنچوں ہوں ترنپے انت اے دل
مذن ملکے ءَ شہرے انت اے دل
دریاب انت بہا پایان نئے نی
سمندر موج و بحرے انت اے دل
دل آہا انت کہ کلیت صد جہان
کہ ہوں ہا رو ہورے انت اے دل
دل آ ہمرا کن مان شف تہارا
کہ روکین شو چراگے انت اے دل

ترجمہ : یہ دل محض خون کا ایک قطرہ نہیں ، بلکہ ایک لا محدود دنیا ہے ، موج در موج ایک طوفان ہے ، یہ دل اندھیری راتوں میں ایک مشعل ہے

فلسفہ خودی کے بارے میں پیر محمد زبیرانی کچھ یوں کہتے ہیں :

گان کس ءِ خودی ءَ گپت محکم
جہاں ءَ مان دوئن ءَ بیت بے گم
مرد کانی خودی انت زندگانی
چہ کاہوشء خودیءِ درچک بے گم

یعنی : جس نے اپنی خودی پہچان لی ، وہ دونوں جہانوں میں ممتاز

ہو گیا ۔ خودی سے موت کو شکست دی جا سکتی ہے ۔ خودی کا چمن خزاں سے نا آشنا ہے ۔

اقبال کی نظر میں عشق کا بڑی ایک خاص مقام ہے ۔

عشق دم جبرئیل ، عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام!
عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات
عشق سے نور حیات ، عشق سے نار حیات
یا
کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق !

پیر محمد زبیرانی کے ہاں عشق ملاحظہ ہو ۔

عشق زندن ، عشق بودن عشق نامن خالقءِ
عشق قرآن ، عشق ایمان عشق دین من آدمءِ
عشق رحمت عشق برکت عشق حجے اکبرے
عشق بازوئے علی ئن عشق ساہن عاشقءِ

ترجمہ : عشق اصل حیات ہے ۔ عشق ہستی ہے ، عشق خالق کا نام ہے عشق قرآن ہے ، عشق ایمان ہے ، عشق دین ہے ، عشق ہر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے ، عشق رحمت و برکت ہے ، عشق حج اکبر ہے ، عشق بازوئے حیدر ہے ، خیبر شکنی ہے ، عشق مشتاق کی زندگی ہے ۔

پیر محمد زبیرانی نے جہاں اقبال کے فکر کو اپنایا ہے وہاں انہوں نے اقبال کے کلام کا ترجمہ بھی کیا ہے ۔

نوجوان شعرا میں عطا شاد نے بلوچی شاعری کو جدید رنگ سے آشنا کیا ۔ عطا شاد اپنا ایک نیا لہجہ لے کر بلوچی شاعری میں داخل ہوا ہے جس کی انفرادیت بلوچی اور اردو دونوں میں نمایاں ہے ۔ عطا کی فکر میں جو بے خوفی اور کہستانوں کی گونجتی آواز ہے اس میں اقبال کا فیضان بھی شامل ہے ۔

ع کہساروں کی عطا ریت نہیں خاموشی

عطا نے اقبال کے اشعار کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے اور ان پر تضمینیں بھی لکھی ہیں ۔ عطا نے اقبال کے اسلوب کا اثر بھی لیا ہے ۔

چنانچہ عطا نے بلوچی بحور میں اپنی نظموں کے مطالب کے لحاظ

سے دل پذیر رد و بدل بھی کی ہے اور ایک نئے اسلوب کی طرف نوجوان شاعر کو مائل کیا ہے۔

عطا کی ایک معروف بلوچی آزاد نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو

عالم نزع میں یعنی پھٹی آنکھوں کی خاموشی بھی ایک زبان ہے۔ مگر اسے دیکھنے کے لئے جداگانہ بصیرت چاہیے اور اسے سننے کے لیے الگ سماعت درکار ہے۔ عالم ہست و بود کا عظیم رستا خیز آنے والی نسلوں کے لئے نزع کا عالم ہے۔

بینائی کے باوجود آنکھیں بے نور ہیں
قوت سماعت موجود ہے مگر سننے سے محروم ہیں
روح موجود ہے مگر زندگی مفقود ہے

عطا شاد کے ان اشعار کو سن کر بے اختیار اقبال کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی

مرحوم آزاد جمالدینی ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے۔ انہوں نے مرتے دم تک بلوچی ادب کی خدمت کی۔ اس خدمت میں تمام مال و دولت لٹا دی اور متاع جان بھی نثار کر دی۔ آزاد کی ایک بلوچی نظم کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

افسردہ شمع پھر سے درخشاں کریں گے ہم
ہر قلب ہر نظر کو فروزاں کریں گے ہم
بخشیں گے ہم عروس وطن کو جمال نو
مشاطگئی زلف پریشاں کریں گے ہم
ہر کہنہ رسم جس سے ہے بیمار ذہن قوم
اسکو رہین آتش سوزاں کریں گے ہم
ہر نقش جہل و ظلم و شقاوت مٹائیں گے
اپنے وطن کو رشک گلستاں کریں گے ہم

یہ عہد یہ عزم، لہجہ کی یہ توانائی اقبال کی یاد دلاتی ہے۔

سید ظہور شاہ ہاشمی مرحوم بلوچی کے مایہ ناز شاعر، ادیب اور

نقاد تھے ۔ ان کے کلام میں بھی اقبال کا اسلوب اور فکری اثر نمایاں ہے مرحوم ہاشمی کے چند بلوچی اشعار ملاحظہ ہوں ۔

من گون بے ساری ء سوبے برتنگ
ترسن ایشنت کہ ہدا ساز کئے

ترجمہ : میں نے عالم مدہوشی میں سب کچھ پا لیا خوف دامن گیر ہے کہ دوبارہ ہوش میں نہ آؤں ۔

ماہرنگ ءِ سوگا ات در دورنج سگا نشی
کہ چشین گلگ نہ کنان شات پہ کلءِ نامءَ

ترجمہ : یہ رنج و الم محبوب کا تحفہ ہے ۔ ہم بخوشی برداشت کریں گے مسرتوں پر کبھی کوئی شکوہ کر سکتا ہے ۔

ایک اور شاعر احمد زہیر کا تذکرہ بھی ضروری ہے جیسے کہ شعرِ مولانا روم جسے علامہ اقبال نے تضمیناً استعمال کیا ہے :

ہر نبائے کہنہ کا باداں کنند اول آں بنیاد را ویراں کنند

عسوچت د پتران کہنیانا نوکیں قصہ بیارت
دگر نوکیں سرے بانو ارگین پا گواجہ بیارت
دگر نوکین زمین آزمانے نوکین دنیائے
دگر استارے نوکین روشنین روچ و شعیے بیارت

ترجمہ : پرانے دفتر و دیوان کو آگ لگا دو ۔ اک نئی داستان کی بنا ڈالو ۔ نئی دنیا میں نئے فرمانرواوں کی ضرورت ہے ۔ نئی دنیا کی زمین بھی نئی آسمان بھی نیا ہو ۔ نئے اور روشن ستارے ہوں ۔ نئے روز و شب ہوں اسی طرح مراد ساحر کہتے ہیں ۔

در نوکین دربگیچ ات ہار ہبرءَ لگندان
بہبت دم پہ دم گون برکءَ من آوت سرانگندان

ترجمہ : مجھے اس رہنما کی تلاش ہے جو نئی راہوں پر لے چلے جو موت سے بھی آنکھیں دو چار کر سکے

مراد ساحر آگے چل کر کہتا ہے :

بنا کن ہنچوئیں من آپے تا تو انہیں دل جہانءَ سورچ
کہیں ءَ ظلم ءِ صیادءَ گون باگ د بوستان ءَ سوچ
کئی بیم ءَ ترا اے زند گانی ءَ کنگ در گور
چہ وت سرے را اے بے رحمین زمین و آسانءَ سوچ

یعنی : ایک آپ رسا ہو جو فرسودہ دنیا کو جلا ڈالے ۔ صیاد کے ظلم سے رہائی کے لئے گلشن میں آگ لگا دے ۔ خوف سے کیوں زندہ در گور ہو ۔ جان کی پروا نہ کر اس بے رحم آسمان اور زمین کو جلا ڈال ۔

مراد ساحر کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ۔ جو اقبال کے اس شعر کے ہم معنی ہے ۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ نان جس سے جاتی رہے اس کی آب

ساحر : بکن پھرنیں بہ اے رزقءَ کہ بارت انت ننگ و ناموسءَ
بسیند ءَ گلامی ءَ اے چرپین چنڈے نان ءَ سوچ

بلوچی ادب کا ایک اور نمایاں نام غوث بخش صابر کا ہے ۔ انہوں نے علامہ کی کئی غزلوں کا ترجمہ حسن و خوبی سے کیا ہے ۔ صابر نے علامہ سے فکری اثر بھی لیا ہے ۔

اقبال کہتا ہے :

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ساحر کہتا ہے :

قد ستک دست و بازو مومنانی سست و مگمراہیں
پہ چوریں دژمن ءَ چو آس و نیت و انگرو بیران

بلوچی زبان کے اکثر و بیشتر شعرا نے اقبال کے اسلوب اور رنگ کو اپنایا ہے اور فکری طور پر ان سے اثر لیا ہے ۔ بلوچی میں اقبال کے رنگ میں بے شمار ترانے لکھے گئے ہیں ۔ وطن دوستی ، اسلامی اتحاد اخوت و مساوات اور شاہین کے موضوعات پر کثرت سے نظمیں لکھی گئی ہیں ۔

اقبال پر کام کرنے والوں میں بزرگ اور بلند پایہ ادیب میر مٹھا خان مری کا نام سر فہرست ہے ۔ میر صاحب نے "درگال اقبال" کے عنوان سے

علامہ اقبال کی زندگی اور شاعری پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب بلوچی ادب میں فکر و نظر کے لحاظ سے ایک اضافہ ہے سوانح نگاری اور ناقدانہ پیرائے کا اچھا نمونہ ہے۔

ملک محمد رمضان منجھے ہوئے صحافی، شاعر، ادیب اور قلمکار ہیں علامہ اقبال کے فکر و اسلوب کو اپنانے کے علاوہ انہوں نے بال جبریل کا منظوم بلوچی ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ کام بڑا کٹھن تھا، مگر انہوں نے اس دشوار منزل کو بہ آسانی طے کر لیا۔

مرحوم محمد حسین عنقا بلوچستان کے پہلے نامور صحافی، بلوچی زبان کے اعلیٰ پایہ کے شاعر اور قلمکار تھے۔ بلکہ سیاستدانوں کے بھی میر کارواں تھے۔ انہوں نے بھی علامہ اقبال کے اسلوب اور فکر کے اثرات کو قبول کیا ہے۔

نواب یوسف علی خان عزیز مگسی نے بلوچستان میں سامراج کے خلاف پہلی بار سیاسی جدو جہد کا آغاز کیا کیونکہ ان سے پہلے بلوچستان میں انگریزوں کے خلاف صرف مسلح جدوجہد ہی سے کام لیا تھا۔ مرحوم یوسف علی خان کو مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال کا قرب بھی حاصل تھا۔ مرحوم نے اپنی اردو شاعری میں اقبال کے رنگ اور اسلوب کو اپنایا ہے۔

بلوچی کے موجودہ شعرا جن، میں کریم دشتی، ملک طوق، صدیق آزاد، قاضی عبدالرحیم صابر، مولانا خیر محمد ندوی، احمد جگر، غنی پرواز، بشیر بیدار وغیرہ کسی نہ کسی طرح سے اقبال کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

بات کا سلسلہ طویل ہوتا جاتا ہے۔ بات ہی کچھ ایسی دلچسپ ہے کہ مختصراً بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ چند نمونے جو پیش کئے گئے ''مشتے از خروارے'' ہیں۔

ہر بڑا شاعر خواہ کسی زبان کا ہو، دنیا کے تمام شاعروں کو متاثر کرتا ہے۔ اقبال عظیم شاعر تھے۔ ان کی فکر ہمہ گیر اور ہمہ جہتی تھی ان کی فکر اور اسلوب کی گرفت سے بلوچی شاعری بھی جگمگا اٹھی۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔

احسن الاقوال کی تاریخی اور سماجی اہمیت

محمد اسلم

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حضرت برہان الدین غریب کے ملفوظات پر مشتمل احسن الاقوال کے عنوان سے ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے۔[1] اس مخطوطہ کے ۹۷ ورق ہیں۔ اسے ۷۳۸ھ ۱۳۳۷ء میں حضرت برہان الدین غریب کے ایک مرید حماد بن عماد کاشانی نے مرتب کیا تھا۔ موجودہ دور کے تاریخ دانوں کو قدیم مؤرخین سے یہ گلہ رہا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی تاریخیں صرف سلاطین اور بادشاہوں کے گرد گھومتی ہیں اور ان میں سے بعض تاریخیں تو شاہی دربار کا روز نامچہ بن کر رہ گئی ہیں۔ ان مؤرخین نے عوام کی مذہبی اور سماجی حالت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس کمی کو صوفیاء کرام کی خانقاہوں میں مرتب ہونے والے ملفوظات نے کافی حد تک پورا کیا ہے۔ احسن الاقوال میں قرون وسطیٰ کے خانقاہی نظام اور صوفیہ اور عوام کی معاشرتی اور سماجی زندگی پر جس انداز سے قلم اٹھایا گیا ہے، اس کی نظیر اور کسی بزرگ کے ملفوظات میں نہیں ملتی۔

صاحب ملفوظات

حضرت برہان الدین غریب، سلطان المشائخ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے انہیں ''صاحب شوق و ذوق'' لکھا ہے[2]۔ اس عہد کے اہل علم اور مشائخ کے

۱- یونیورسٹی کلکشن فارسیہ، مذہب، تصوف نمبر ۳۱۸۔

۲- عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۹۳

ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے ۔ امیر خسرو اور امیر حسن علاسجزی جیسے با کمال حضرات ان کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے[۱] ۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات تھے ۔

حضرت برہان الدین کو حضرت سلطان المشائخ کے ساتھ اس قدر عقیدت تھی کہ انہوں نے مدت العمر کبھی غیاث پور (بستی حضرت نظام الدین) کی طرف پشت نہیں کی ۔[۲]

ایک بار موصوف حضرت نظام الدین اولیا کے جماعت خانہ میں بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے کمبل تہ کرکے اس پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے ۔ سلطان علاء الدین خلجی کے اعزاء میں سے ملک نصرت اور علی زنبیلی نے حضرت سلطان المشائخ سے اس کا ذکر کیا تو حضرت بے حد ناراض ہوئے ۔ انہوں نے فوراً اپنے خادم خاص اقبال سے کہا ۔ کہ برہان الدین سے کہو کہ وہ فوراً یہاں سے چلا جائے ۔ حضرت برہان الدین پریشان ہو کر اپنے گھر چلے گئے ۔ جب ان کے احباب کو اس واقعہ کا پتہ چلا تو وہ ان کے پاس اظہار افسوس کے لیے جانے لگے ۔ کئی روز بعد امیر خسرو اپنے گلے میں دستار ڈال کر سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں معافی دلوائی[۳] ۔

حضرت برہان الدین غریب سات صد درویشوں کے ہمراہ دکن کی طرف روانہ ہوئے ۔ وہ درویش انہیں پالکی میں بٹھا کر دکن لے گئے ۔ دکن کی تاریخ میں ''پالکی کی آمد'' بڑی اہمیت کی حامل ہے[۴] ۔ حضرت برہان الدین کے نام نامی کی مناسبت سے برہان پور کی بنیاد رکھی گئی اور یہ شہر مدتوں تک خاندیش کے فاروقی سلاطین کا پایہ تخت رہا ۔

حضرت برہان الدین اور ان کے ساتھیوں نے دکن کی سر زمین میں اسلام کی تبلیغ میں بڑی سر گرمی دکھائی ۔ ان کا انتقال ۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء میں ہوا[۵] ۔ ''نور عشق بود'' اور ''اولیاء خاص'' سے ان کی تاریخ وفات

۱- عبدالحق محدث ، ص ۹۳-۹۴ ''فضلائے زمانہ مثل امیر خسرو و امیر حسن و خوش طبعان دیگر اسیر محبت او بودند'' ۔

۲- ایضاً ، ص ۹۴ ۳- ایضاً ۔

۴- شیخ محمد اکرام ، آب کوثر ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء ، ص ۲۱۳

۵- ایضاً ، ص ۲۱۲ ۔

نکلتی ہے ۔ حضرت کا مزار اورنگ آباد سے سترہ اٹھارہ میل کے فاصلہ پر خلد آباد میں واقع ہے ۔ سڑک کے بائیں جانب ایک چار دیواری کے اندر حضرت برہان الدین محو خواب ابدی ہیں ۔ اسی احاطۂ قبور میں ریاست حیدر آباد کا بانی نظام الملک آصف جاہ اول اور ناصر جنگ شہید مدفون ہیں - حضرت برہان الدین کی درگاہ کے بالمقابل ایک ایسی ہی چار دیواری کے اندر شیخ زین الدین کا مزار ہے اور وہیں اورنگ زیب عالمگیر ، شہزادہ اعظم اور امیر حسن علاسجزی کی قبریں ہیں -

جامع ملفوظات

جامع ملفوظات نے متن میں دو جگہ اپنا نام حماد بن عماد کاشانی تحریر کیا ہے ۔ ایک جگہ اس نے اپنے ایک بھائی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

برادرم مجمع الادب قدوۃ الاکتساب خواجہ رکن الدین کاشانی[1]

ایک موقع پر اس نے اپنے دوسرے بھائی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :

برادرم صدر الافاضل خواجہ برہان الدین کاشانی[2]

اس کا ایک تیسرا بھائی بھی تھا جس کا نام خواجہ مجد الدین کاشانی تھا ۔ جامع ملفوظات نے اس کے نام سے پہلے ''قدوۃ البلغا'' لکھا ہے[3] ۔ مؤخر الذکر دونوں بھائی حضرت برہان الدین غریب سے بیعت تھے[4] ۔

احسن الاقوال کی اہمیت

حماد کاشانی نے جس محنت اور کاوش کے ساتھ احسن الاقوال کو مرتب کیا ہے ، اس کی مثال ملفوظات نویسی کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی ۔ اس عہد میں مرتب ہونے والے ملفوظات میں قصے کہانیوں

۱- احسن الاقوال ، ورق ۱۰ الف

۲- ایضاً ، ورق ۷ الف

۳- ایضاً ، ورق ۷ ب ۔

۴- ایضاً ۔

کی بھر مار ہے لیکن حماد کاشانی نے اس پرانی ڈگر سے ہٹ کر قلم اٹھایا ہے اور اس نے اسے خانقاہی نظام کا دستور العمل بنا دیا ہے ۔

حضرت برہان الدین غریب کی عمر کا بیشتر حصہ حضرت سلطان المشائخ کی صحبت میں گزرا تھا ، اس لیے احسن الاقوال میں سلطان المشائخ کے بارے میں اہم معلومات ملتی ہیں ۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سلطان المشائخ کے سوانح نگاروں میں سے کسی نے بھی اس تصنیف سے استفادہ نہیں کیا ، حالانکہ حضرت برہان الدین غریب بہت سے واقعات کے عینی شاہد ہیں ۔ اسی طرح انہوں نے سلطان المشائخ سے بابا فرید الدین گنج شکر کے بارے میں کئی باتیں سنی تھیں ، انہیں بھی سند کا درجہ حاصل ہے ۔ اس لیے بابا صاحب کا کوئی سوانح نگار احسن الاقوال سے پہلو تہی نہیں کر سکتا ۔

اگر کسی شخص نے اس عہد کی چشتی خانقاہ میں رہنے والے درویشوں کے شب و روز کے آداب و مشاغل کا مطالعہ کرنا ہو ، تو اُسے احسن الاقوال سے بہتر کتاب نہیں مل سکتی ۔

حماد کاشانی نے احسن الاقوال میں حضرت برہان الدین غریب کے ۲۹ اقوال مختلف عنوانات کے تحت نقل کئے ہیں ۔ جہاں کہیں حضرت کا ذکر آتا ہے ، فاضل مرتب ان کے نام کے بعد ''طیب اللہ قبرہٗ باحسن الطیب'' کے دعائیہ کلمات ضرور لکھتا ہے ۔

قول اول : حماد کاشانی نے قول اول پر ''روشنہائے اصحاب طریقت و سنن ارباب طریقت'' کا عنوان لگایا ہے ۔ اس کے تحت موصوف لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدین فرمایا کرتے تھے کہ جب مرید پیر کے پاس موجود ہو تو اس کے لیے پیر کے مشاہدہ سے بڑھ کر اور کوئی مشغولیت نہیں ہونی چاہیئے ۔ اُسے اسے ہی سب سے بڑا شغل سمجھنا چاہیئے ۔ اگر مرید کہیں دور رہتا ہو اور اُسے پیر کی صحبت میسر نہ ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ تصوف کی کسی کتاب کے چند صفحات روز پڑھ لیا کرے[1] ۔

حضرت برہان الدین فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص دن میں ۷۵ بار سورۂ الم نشرح پڑھے گا ، اللہ تعالیٰ اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دے گا ۔

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۷ الف

قرون وسطیٰ میں مسافر عموماً سراؤں یا خانقاہوں میں قیام کیا کرتے تھے - حضرت فرماتے ہیں کہ مسافر کا حق لنگر میں تین دن تک ہے ۔ اس کے بعد اُسے کوئی کام کرنا چاہیئے ۔ وہ یا تو ہمہ تن عبادت میں مشغول ہو جائے یا لنگر میں ہاتھ بٹائے یا وہاں سے رخصت ہو جائے[1]۔

حضرت اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص کسی درویش کی ملاقات کو جائے تو جیسا وہ درویش کرے ویسا ہی ملاقاتی بھی کرے ۔ اگر درویش قیلولہ کر رہا ہو تو ملاقاتی بھی وہاں جا کر لیٹ جائے ۔ اگر وہ عبادت میں مشغول ہو تو یہ بھی وہاں جاتے ہی عبادت میں مشغول ہو جائے ۔ اسی طرح اگر درویش عمارت تعمیر کر رہا ہو تو زائر بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائے ۔[2]

اگر کوئی درویش کسی کو گھڑا ، کوزہ یا لوٹا دینا چاہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ خالی نہ دے ۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی درویش کے لیے طشت یا چھاگل لے جائے تو اس میں کوئی چیز ضرور ڈال لے ۔ اگر کوئی چیز میسر نہ ہو تو تازہ پھل ، خربوزہ یا کھیرہ ہی رکھ لے ۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر ان میں ایک سکہ ہی رکھ کر لے جائے ۔[3]

حضرت فرماتے ہیں کہ درویش کو کسی سے دستانے اور سونے یا چاندی کی انگوٹھی قبول نہیں کرنی چاہیئے ۔ جب حماد کاشانی کے دو بھائی حضرت سے بیعت ہوئے تو انہوں نے اپنی طلائی انگوٹھیاں حضرت کی خدمت میں پیش کیں ۔ حضرت نے فرمایا کہ انہیں بیچ کر جو رقم ملے اُسے حضرت سلطان المشائخ کے ایصال ثواب کے لیے خرچ کر دیں ۔[4]

درویش کو چاہیئے کہ وہ کسی کی امانت نہ رکھے اور نہ کسی کا ضامن ہی بنے ۔ اسی طرح وہ کسی دستاویز پر اپنی گواہی نہ ڈالے ۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ نیکی کرے تو احسان مند جواب میں جزاک اللہ ضرور کہے ۔ ایک روز خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مجاور سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اس نے عرض کیا کہ لوگ اُسے چیزیں دیتے

۱۔ احسن الاقوال ورق ۷ الف

۲۔ ایضاً ، ورق ۶ ب

۳۔ ایضاً ، ورق ۱۱ ب

۴۔ ایضاً ، ورق ۷ ب

ہیں وہ ان کے حق میں گیا کیا کرے ؟ سلطان جی نے فرمایا کہ اگر وہ جزاک اللہ کہہ دیا کرے تو حق ادا ہو جائے گا ۔[1]

حضرت برہان الدین غریب فرماتے ہیں کہ ایک روز سلطان جی استراحت فرما رہے تھے کہ ایک مسافر آیا اور خدام سے کہنے لگا کہ اس نے گھوڑا خریدا ہے اور وہ اس خوشی میں کچھ رقم سلطان جی کی نذر کرنا چاہتا ہے ۔ خدام نے کہا کہ وہ تو اس وقت آرام فرما رہے ہیں لہذا وہ رقم انہیں دے دے ۔ اس نے وہ رقم حاضرین میں بانٹ دی ۔ اتفاق سے چند روز بعد اس کا گھوڑا کھو گیا ۔ وہ پریشان حال سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام قصہ انہیں سنایا ۔ حضرت نے فرمایا جن لوگوں نے اس سے روپے لئے تھے ان سے کہے گھوڑا لا کر دیں ۔ حاضرین نے کہا کہ انہیں کیا خبر کہ گھوڑا کہاں ہے ؟ اس پر حضرت نے فرمایا کہ درویش کسی کی چیز ضائع نہیں کرتے ۔ اگر انہیں کوئی ایک جیتل دے تو وہ اس کا دس جیتل کا کام کرتے ہیں ۔ تب کہیں اس جیتل پر ان کا حق بنتا ہے[2] ۔

ایک روز ایک شخص نے سلطان جی کی خدمت میں ایک تنکہ پیش کیا ۔ اتفاق سے چند ہی روز بعد وہ شخص بیمار ہوگیا ۔ حضرت کو جونہی اس کی علالت کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اس کا دیا ہوا تنکہ اب تک ان کے دل میں اٹکا ہوا ہے لہذا اس کے لیے دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اسے صحت عطا فرمائے[3] ۔

حضرت برہان الدین غریب فرماتے ہیں کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پیر اپنے مرید کے اور استاد اپنے شاگرد کے سامنے کھڑا نہ ہو ۔

دہلی میں عماد الدین تیر گر نام کا ایک شخص رہتا تھا اور اسے حضرت بہاء الدین زکریا کے ساتھ بڑی عقیدت تھی ۔ ایک روز ایک شخص دہلی سے ملتان جا رہا تھا ۔ عماد الدین نے اس کے ہاتھ حضرت زکریا کے لئے نقدی روانہ کی ۔ جب وہ شخص اجودھن پہنچا تو بابا فرید الدین سے بھی ملا ۔ اس نے بابا صاحب سے کہا کہ عماد الدین نے جو نقدی اُسے

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۸ ب
۲۔ ایضاً ، ورق ۹ الف
۳۔ ایضاً ۔

دی ہے ، وہ بابا صاحب لے لیں ۔ وہ حضرت زکریا کی خدمت میں کوئی اور چیز پیش کر دے گا ۔ اس پر بابا صاحب نے فرمایا کہ وہ راستے میں رہزن بن کر نہیں بیٹھے ۔ جب وہ کسی دوسرے کو نقدی دینے کی نیت کرکے چلا ہے تو وہ اسے کیوں کر قبول کر لیں[۱] ۔

حضرت برہان الدین کے زمانے میں درویش کے لیے سب سے معتبر قسم یہ تھی کہ وہ اپنے شیخ کے مصلے پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے[۲] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک مرید جب سفر سے واپس آئے تو پہلے اپنے شیخ سے ملنے جائے ، پھر اپنے گھر جائے ۔ اسی طرح جب سفر پر روانہ ہو تو اپنے اہل خانہ سے وداع ہو کر شیخ کی خدمت میں حاضری دے اور وہیں سے سفر پر روانہ ہو جائے[۳] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت نظام الدین نے شیخ نصیر الدین محمود اودھی کو اودھ جانے کے لیے وداع کیا تو انہوں نے کسی سے کہا کہ ان کی قیام گاہ پر جو گھوڑا بندھا ہوا ہے اُسے فلاں جگہ پہنچا دے کیونکہ شیخ سے وداع ہونے کے بعد اپنی قیام گاہ پر جانا ادب کے منافی ہے[۴] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر دو آدمی مل کر ایک ہی برتن میں کھانا تناول کر رہے ہوں اور ان میں سے کوئی کسی کام کے لیے اٹھ جائے تو دوسرے کو چاہیئے کہ وہ بھی اتنی دیر کے لیے کھانے سے ہاتھ کھینچ لے[۵] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ شیخ کو مرید کی تربیت صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر کرنی چاہیے ۔ شیخ میں لالچ اور بخل نہیں ہونا چاہیے ۔ اگر خدا اُسے القا کرے کہ فلاں نعمت فلاں مرید کو دے دے تو اس میں بخل سے کام نہ لے[۶] ۔

۱- احسن الاقوال ، ورق ۸ ب
۲- ایضاً ، ورق ۹ الف
۳- ایضاً ،
۴- ایضاً ۔
۵- ایضاً ، ورق ۱۰ ب
۶- ایضاً ۔

اگر شیخ کی خانقاہ میں مسافر آ کر ٹھہرے تو خادم کو چاہیے کہ اُسے پانی کی جگہ اور قدمچا (بیت الخلاء) دکھا دے ۔ ادب کا یہ تقاضا ہے کہ مسافر خانقاہ سے بازار جائے تو واپسی پر خالی ہاتھ نہ آئے ۔ اگر اور کچھ میسر نہ ہو تو ایک کھیرا یا ککڑی ہی لیتا آئے[1] ۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ملک قنبر جب بھی سلطان جی کی خدمت میں آتا تو ایک کدو خانقاہ کے لیے ضرور ساتھ لاتا اور سلطان جی کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ساتھ لاتا ۔ حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ یہ روش لازم نہیں ہے لیکن مستحب ہے ۔[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان جی شہر سے غیاث پور کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص سے مڈبھیڑ ہوئی ۔ وہ ایک خالی خوانچہ سر پر رکھے سلطان جی کی خانقاہ کی طرف جا رہا تھا ۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ درویشوں کے پاس خالی ہاتھ نہیں جاتے ، اگر اور کچھ نہیں تو وہ دو جیتل کے نان خرید کر خوانچہ میں رکھ لے ۔ اسی طرح خالی پیالے میں شربت یا مصری ڈال لینی چاہیے ۔ اگر کوئی شخص پاندان شیخ کی خدمت میں پیش کرنا چاہے تو اس میں پان رکھ لے[3] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ درویشوں کے لیے چھری یا اُسترا نہیں لے جانا چاہیے ۔ اگر کوئی شخص یہ دونوں چیزیں درویش کے لیے لائے تو اُسے چاہیے کہ ایک سوئی بھی ساتھ لائے ۔ اس لیے کہ چھری اور اُسترا کاٹنے کے اوزار ہیں اور سوئی جوڑنے کے کام آتی ہے ۔ اگر کوئی شخص کسی درویش کی خدمت میں صرف چھری پیش کرنا چاہیے تو وہ گوشت کا ایک ٹکڑا بھی ساتھ لائے ۔ اسی طرح سوئی کے ساتھ دھاگا بھی ہونا چاہیے[4] ۔

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ ایک مسافر شیخ جمال الدین ہانسوی سے ملنے آیا ۔ شیخ اس وقت مسجد میں تھے ۔ وہ انہیں تلاش کرتے

۱۔ کھیرا اور ککڑی ان دنوں بڑے گراں ہیں ۔ اُس زمانے میں یہ کوڑیوں کے بھاؤ فروخت ہوا کرتے تھے ۔

۲۔ احسن الاقوال ، ورق ۱۱ الف ۔

۳۔ ایضاً ، ورق ۱۱ ب

۴۔ ایضاً ، ورق ۱۲ الف ۔

کرتے وہاں پہنچا ۔ شیخ نے نماز سے فارغ ہوتے ہی نفلوں کی نیت باندھ لی ۔ مسافر نے اپنا مصلا لپیٹا اور چلنے لگا ۔ شیخ نے جلدی سے سلام پھیرا اور معذرت چاہی ۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مسافر کو زیادہ دیر تک انتظار میں نہیں رکھنا چاہیے ۔ مقیم پر واجب ہے کہ مسافر کو انتظار کی زحمت نہ دے[1] ۔

اگر کوئی شیخ کسی شخص کو کسی کے ہاں بھیجے اور صاحب خانہ اس کے ہاتھ شیخ کے لیے کپڑے ، نقدی یا شیرینی وغیرہ بھیجے تو شیخ انہیں قبول نہ کرے ۔ اُسے چاہیے کہ ان پر فاتحہ پڑھ کر واپس لوٹا دے[2] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ درویش کو باریک کپڑے نہیں پہننے چاہیں ۔ درویش کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی خلوتی ہوتا ہے اور کبھی جلوتی ۔ اس زمانے میں نیلا لباس زیب تن کرنا یا کسی مجلس میں بلند آواز سے قرآن پڑھنا ، لوگوں سے سوال کرنے کے مترادف تھا ۔ اس لیے ان دونوں کاموں سے احتراز کرنا چاہیے[3] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے ہاں مسافر آئے تو صاحب خانہ اُسے دو گرم چیزیں فوراً فراہم کرے ۔

۱- ہاتھ منہ دھونے کے لیے گرم پانی ۔ ۲- گرم شوربا ۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ درویشوں کے پاس تین اوقات میں نہیں آنا چاہیے ۔

۱- نماز اشراق سے قبل ۔
۲- دوپہر کو قیلولہ کے وقت ۔
۳- نماز عصر کے بعد[4] ۔

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ ایک روز شیخ داؤد حسن شیرازی حضرت برہان الدین غریب سے کہنے لگے کہ ان کے پاس لوگ آتے ہیں

۱- احسن الاقوال ، ورق ۱۱ الف ۔
۲- ایضاً ۔
۳- ایضاً ، ورق ۱۴ الف ۔
۴- ایضاً ، ورق ۱۲ الف ۔

تو ان کے اوراد و وظائف فوت ہو جاتے ہیں ۔ ان کی بات سن کر حضرت نے فرمایا :

اذا جاء الاخوان سقطت النوافل

شیرازی نے دوبارہ وہی جملہ دہرایا تو حضرت نے جواب دیا کہ اگر کوئی شخص ملنے آئے تو اس کے سامنے کلمۂ حق کہنا چاہیے اور کلمۂ حق کہنے سے اگر اوراد فوت ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے ۔ اگر کوئی شخص کسی کام کے لیے آئے تو اُسے کام میں لگا دے اور اوراد و وظائف فوت نہ کرے[1] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسافر نماز عصر کے بعد شہر میں داخل ہو تو وہ سیدھا لنگر میں نہ جائے ۔ وہ رات کو کسی دوسری جگہ قیام کرے اور اگلی صبح اشراق کے بعد لنگر میں داخل ہو[2] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص نئے کپڑے پہنے تو اُسے مبارک باد دینی چاہیے ۔ درویش کا مہمان اگر بیمار ہو جائے تو جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائے ، اسے اپنے ہاں سے جانے نہ دے ۔ ایک بار خواجہ مبارک معروف ، جنہیں حضرت شیخ کامل کہا کرتے تھے ، حضرت کے ہاں آ کر ٹھہرے ۔ چند دن بعد ان کی آنکھ میں تکلیف ہو گئی ۔ انہوں نے حضرت سے اپنے گھر جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے فرمایا کہ جب تک صحت نہ ہو جائے اس وقت تک اجازت نہیں ملے گی ۔ تکلیف چونکہ ان کے گھر میں شروع ہوئی ہے اس لیے صحت بھی یہیں ہونی چاہیے[3] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ قبرستان سے سیدھا کسی مریض کی عیادت کو نہ جائے ۔ یہ امر مریض کے حق میں باعث برکت نہیں ہے ۔ اسی طرح کسی کی تعزیت کے بعد شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے یا کسی مریض کی عیادت کے لیے نہ جائے ۔ راستے میں اگر کوئی مسجد نظر آئے تو تھوڑی دیر کے لیے وہاں رک جائے یا تھوڑی دیر کے لیے کسی جگہ بیٹھ جائے ، پانی پئے اور پھر جائے[4] ۔

۱۔ احسن الاقوال ورق ۱۲ الف

۲۔ ایضاً ، ورق ۱۳ ب ۔

۳۔ ایضاً ، ورق ۱۵ الف ۔

۴۔ ایضاً ۔

قول اول : جس میں آداب مجلس منقول ہیں ، بڑا طویل ہے اور یہ دس ورقوں پر پھیلا ہوا ہے ۔ اسے اس عہد کی مجلسی زندگی کا مرقع سمجھنا چاہیے ۔

قول دوم : ”در رعایت آداب مجلس مشائخ برجادہ و اولیای صاحب سجادہ“ ۔

اس عنوان کے تحت حضرت برہان الدین غریب فرماتے ہیں کہ جب کسی شیخ کی مجلس میں دستر خوان بچھایا جائے تو خادم کو چاہیے کہ وہ پہلے حاضرین کے ہاتھ دھلائے اور پھر اپنے ہاتھ دھوئے ۔ دستر خوان پر شیخ کے سامنے نمکدان رکھنا چاہیے اور دستر خوان کے کونوں پر زیادہ روٹیاں رکھنی چاہئیں ۔ جب خادم بسم اللہ کہے تب حاضرین کھانا شروع کریں ۔ سب سے پہلے ایک چٹکی نمک کی اپنے منہ میں ڈالیں ، پھر شوربا استعمال کریں ۔ اگر کوئی شخص چمچے سے کھانا تناول کرے تو آداب مجلس کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنا چمچہ مشترکہ پیالے میں نہ ڈالے تا کہ لوگ کراہیت محسوس نہ کریں ۔ لقمہ ہمیشہ دائیں جبڑے سے چبانا چاہیے اور بائیں جبڑے سے لقمہ چبانے سے احتراز کرنا چاہیے[1] ۔

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ درویش کی مجلس میں کوئی شخص بائیں طرف کے دانتوں سے لقمہ چبا رہا تھا ۔ درویش نے اس سے پوچھا کہ وہ کس بزرگ کا مرید ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ اس کے بائیں طرف کے دانتوں میں تکلیف ہے اس لیے وہ مجبوراً بائیں جبڑے سے لقمہ چبا رہا ہے[2] ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ کسی شخص سے یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ وہ کس کا مرید ہے ، کیونکہ اس سے اس کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے ۔ ایک بار امیر خسرو سے کسی نے پوچھا کہ وہ کن کے مرید ہیں ؟ انہوں نے کہا کہ ان سے کون سی بے ادبی ہوئی ہے جو وہ ایسا سوال کر رہا ہے[3] ۔

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ ہر لقمہ منہ میں رکھتے وقت بسم اللہ کہنی چاہیے ۔ جب کھانا ختم ہو جائے تو الحمد للہ کہے ۔

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۱۶ الف ۔

۲۔ ایضاً ۔

۳۔ ایضاً ۔

کھانے کے دوران میں پانی نہ پیا جائے کیونکہ داہنا ہاتھ آلودہ ہوتا ہے اور اس سے گلاس بھی خراب ہو جائے گا اور اس میں کھانے کے ریزے بھی گر جائیں گے ۔ بائیں ہاتھ سے پانی پینا منع ہے ۔ درویشوں کے ہاں یہ رواج ہے کہ وہ دستر خوان پر شوربا پیش کرتے ہیں تاکہ حلق خشک نہ ہو اور پانی پینے کی نوبت نہ آئے ۔ اگر کسی شخص کو ضرورت پڑے تو وہ شوربا پی لے ، پانی نہ پیے ۔ کھانے کے دوران میں سلام کا جواب نہ دے ، کیونکہ درویشوں کے ہاں کھانا بھی عبادت سمجھا جاتا ہے اور عبادت میں مخل ہونا مناسب نہیں[1] ۔

ایک بار ایک شخص حضرت برہان الدین کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اس وقت موصوف کھانا تناول فرما رہے تھے ۔ اس نے سلام کیا ۔ حاضرین خاموش رہے ۔ وہ شخص بھی کھانے میں شریک ہو گیا ۔ کھانے سے فراغت کے بعد حضرت نے اس کی تعظیم کی اور فرمایا کہ درویشوں کا یہی طریقہ ہے جو اس نے اختیار کیا تھا[2] ۔

درویش کے لیے لازم ہے کہ وہ دستر خوان پر ہی روٹی توڑے اور جب تک ایک روٹی ختم نہ ہو جائے ، دوسری روٹی نہ اُٹھائے ۔ دستر خوان پر روٹیوں کے ٹکڑے کرنے مناسب نہیں ہیں اور نہ کوئی ٹکڑا باقی چھوڑنا مناسب ہے ۔ دستر خوان سے ٹکڑے اٹھا کر کھانے میں بڑی فضیلت ہے[3] ۔

ایک بار خواجہ شمس الملک حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا ۔ اتنے میں ایک بلی کے بولنے کی آواز آئی ۔ شمس الملک نے بلی کی آواز سن کر روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے آگے ڈال دیا ۔ شیخ نے کہا کہ تمہیں اس کی اجازت ہے لیکن یہ کام خادم کو کرنا چاہیے تھا ۔ اس کے علاوہ کسی کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ میزبان کی اجازت کے بغیر کسی کو لقمہ دے[4] ۔

اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ خادم اور شیخ کو پھل اور کھانے

۱- احسن الاقوال ، ورق ۱۷ الف ۔
۲- ایضاً ۔
۳- ایضاً ۔
۴- ایضاً ، ورق ۱۷ ب

کا دوگنا حصہ دیا جاتا تھا ، تاکہ اگر کوئی شخص بعد میں آئے تو اُسے بھی دے سکیں ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ درویش نے وضو کھانا نہ کھائیں کیونکہ ان کے نزدیک اس سے زیادہ بُری اور کوئی بات نہیں ہے ۔ اگر کسی کے حصے میں کھانے کی کوئی کڑوی چیز آ جائے تو اُسے چاہیے کہ اسے بلا کراہت کھا لے ، کیونکہ وہ اس کے حصے میں آئی ہے ۔ مولانا یوسف چندیری مجلس میں کڑوا کھیرا اس طرح مزے سے کھایا کرتے تھے جیسے حلوہ کھا رہے ہوں[1] ۔

درویشوں کی مجلس میں کوئی شخص کلی کرتے وقت آواز نہ نکالے ورنہ پانی دستر خوان پر گرے گا اور اس سے کراہیت پیدا ہو گی ۔ کھانے کے بعد حاضرین کو خلال مہیا کئے جائیں ، جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدین کے ہاں خلال دینے کی خدمت لطیف الدین کے ذمے تھی[2] ۔

کھانے کے بعد ہاتھ دھلانے کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے خادم اپنے ہاتھ دھوئے اور پھر دوسروں کے ہاتھ دھلائے ۔ حضرت برہان الدین ہاتھ دھوتے وقت دوبار سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے تھے ۔ ایک بار حضرت نصیر الدین محمود کے استفسار پر انہوں نے فرمایا کہ موصوف ایک بار فاتحہ اللہ تعالیٰ کے لیے اور دوسری بار سلطان جی کی روح کو ایصال ثواب کے لیے پڑھتے ہیں[3] ۔

ہاتھ دھونے کے بعد پان پیش کیا جاتا تھا ۔ پان کھانے کے آداب یہ تھے کہ خالی پان منہ میں رکھے اور پان منہ میں ڈالتے وقت منہ زیادہ نہ کھولے تا کہ دوسروں کی نظر نہ پڑے ۔ پان منہ میں رکھنے کے بعد چھالیہ منہ میں ڈالے اور اس بات کا خیال رکھے کہ ایک دم ساری چھالیہ منہ میں نہ ڈال لے بلکہ ایک ایک ٹکڑا کرکے ڈالے[4] ۔

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ اگر کسی مجلس میں مخلوق اور

۱۔ احسن الاقوال ورق ۱۷ ب ۔
۲۔ ایضاً ، ورق ۱۹ ب
۳۔ ایضاً ، ورق ۲۰ الف
۴۔ ایضاً ۔

مجمع دو طرح کے لوگ جمع ہوں تو مجمع کو مخلوق پر فضیلت دے جائے[۱] ۔

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدین کے ہاں نمکدان کو ''ابوالفتح'' اور دستر خوان کو ''بساط الرحمت'' کہا کرتے تھے ۔ اسی طرح روٹی کو بقیہ بساط الرحمت ، کسرۃ یا فصلہ کا نام دیا گیا تھا[۲]۔

حماد کاشانی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حضرت کے سامنے سلطان جی کی مریدی کا دعویٰ کرتا تو حضرت فرماتے کہ اس پر گواہ لاؤ یعنی سلطان جی کے اخلاق میں سے کوئی چیز پیش کرو ۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان لوگوں کو خلال دیا جائے تو انہیں خلال کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے اور دعویٰ کرتے ہیں سلطان جی کی مریدی کا[۳] ۔ (اس سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ شیخ اپنے مریدوں کی کس انداز سے تربیت کیا کرتے تھے) ۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مرید کو چاہیے کہ جب وہ پیر کی خدمت میں آئے تو بائیں طرف سے نہ آئے ، سامنے سے آئے اور سلام عرض کرے ۔ وہ جتنی دیر وہاں رہے ، اپنی نظریں نیچی رکھے اور زیادہ باتیں نہ کرے ۔ شیخ جو بات پوچھے صرف اسی کا جواب دے اور واپسی پر شیخ کی طرف پشت نہ کرے[۴] ۔

قول سوم : در حسن عقیدۃ اصحاب اعتقاد

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک روز سلطان جی نے آئینہ دیکھا تو ریش میں ایک سفید بال نظر آیا ۔ اُسے دیکھ کر سلطان جی نے فرمایا ''الحمد للہ میں نے ایک سیاہ بال بابا صاحب کی خدمت میں بھیج دیا ہے''[۵] ۔

ایک روز مولانا فرید الدین ، حضرت کے دستر خوان پر موجود تھے ۔ انہوں نے خوب سیر ہو کھانا کھایا اور کھانے سے فراغت کے بعد کہنے

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۱۸ الف ۔

۲۔ ایضاً ، ورق ۱۹ الف

۳۔ ایضاً ، ورق ۱۹ ب ۔

۴۔ ایضاً ، ورق ۲۰ ب ۔

۵۔ ایضاً ، ورق ۲۲ الف ۔

لگے "آپ کا کھانا "محی دل" ہے اور جنت کا کھانا "محی نفس" ہو گا۔ اس لیے یہ اس سے افضل ہے[1]۔

جامع ملفوظات حماد بن عماد کا شانی کے بھائی رکن الدین کو سلطان نے دہلی سے دولت آباد جانے کا حکم دیا۔ وہ ڈاک کے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ حماد لکھتے ہیں کہ دوران سفر وہ ہر صبح نماز فجر کے بعد دہلی کی طرف رخ کر کے اپنا چہرہ زمین پر ملا کرتے تھے۔ حماد کا شانی اس پر شاہد ہے کہ جب کبھی خواجہ قطب الدین دبیر سلطان جی کے مزار کی زیارت کے لیے جاتا تو گنبد پر نظر پڑتے ہی اپنا چہرہ زمین پر ملتا۔ اس نے کبھی غیاث پور (بستی حضرت نظام الدین) کی طرف منہ کر کے نہیں تھوکا تھا۔[2]

قول چہارم: در آداب آمدن مرید در خدمت پیر و رعایت آداب در وقت تقریر۔ ایک بار حضرت برہان الدین غریب[3] سلطان جی کی زیارت کے لئے دہلی سے غیاث پور کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ان کا ایک واقف کار انہیں زبردستی اپنے گھر لے گیا اور ناشتہ کرایا۔ حضرت ناشتے سے فارغ ہو کر غیاث پور کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ بھول گئے ان دنوں دہلی اور غیاث پور کے درمیان رہزن مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ حضرت کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ ان کے کپڑے ہی نہ اتروا لیں۔ حضرت اس طرف سے کئی بار گزرے تھے، اس کے باوجود راہ گم کر بیٹھے اور باوجود کوشش کے انہیں راستہ نہ ملتا تھا۔ معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ اپنے گھر سے سلطان جی سے ملنے کی نیت کر کے نکلے تھے لیکن راستے میں کسی واقف کار کے ہاں چلے گئے۔ یہ اسی بدنیتی کا ثمر ہے۔ انہوں نے فوراً توبہ کی تو انہیں راستہ مل گیا۔[3]

حضرت فرماتے ہیں کہ جب کبھی خواجہ شمس الدین، سلطان جی کی زیارت کو جاتے تو دونوں ہاتھ آگے باندھ کر چلتے۔

۱- احسن الاقوال، ورق ۲۲ ب۔
۲- ایضاً ورق ۲۳ ب۔
۳- ایضاً ورق ۲۵ الف۔

قول پنجم : در آداب بیعت ۔

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ بیعت کے دن عقیدت مند روزہ رکھے ، صدقہ دے اور نماز ادا کرے ۔ شیخ عقیدت مند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے :

عہد کردی باین شکستہ و خواجہٗ
این شکستہ و خواجہٗ خواجہ این
شکستہ و خواجگان چشت و
تابعین و تبع تابعین و بارسول
رب العلمین و با حاملان عرش و
باحضرت پاک جل و علا چشم نگاہداری
و زبان نگاہداری ، بد کسے را نگوئی
و بد کسے را نہ اندیشی و کسی را
مضرتی نرسانی و گرد مناہی نگردی
و بر جادہ شرع باشی ، ہمبرین جملہ
عہد کردی و ہمبرین شرط باشی[1]

ترجمہ: کیا تو اس شکستہ ، اس شکستہ کے مرشد اور اس شکستہ کے مرشد کے شیخ ، خواجگان چشت ، تابعین ، تبع تابعین ، رسول رب العلمین ، حاملان عرش اور اللہ جل شانہ سے یہ عہد کرتا ہے کہ اپنی نگاہ اور زبان پر قابو رکھے گا ۔ کسی کی بد گوئی نہیں کرے گا ، کسی کا برا نہیں سوچے گا ، کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا ، برے کاموں سے اجتناب کرے گا اور جادہ شرع پر قائم رہے گا ۔ تو ان سب باتوں کا عہد کرتا ہے اور ان شرائط پر قائم رہے گا ۔

مرید کہے کہ وہ ان سب باتوں پر عمل کرنے کا عہد کرتا ہے ۔

اس کے بعد شیخ قینچی لے کر اس کے سر کے دائیں جانب سے اور پھر بائیں جانب سے تھوڑے سے بال کاٹے اور سر پر ٹوپی پہنا دے ۔ ٹوپی پہناتے وقت شیخ کہے :

۱- احسن الاقوال ، ورق ۲۶ الف ، ۲۶ ب ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ ہذاللباس التقویٰ و لباس العاقبۃ ۔

مرید اپنا سر شیخ کے قدموں پر رکھ دے اور اس کے بعد دوگانہ ادا کرے ۔ دوگانہ ادا کرنے کے بعد مرید حاضرین مجلس کے ساتھ مصافحہ کرے ۔ بعد ازاں شیخ اسے اس کی قابلیت کے مطابق تلقین کرے ۔[1]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ بیعت کے لیے تین چیزیں شرط ہیں :

۱۔ حلق یا قصر ۔ ۲۔ کلاہ ۔ ۳۔ اقرار بیعت ۔

اگر ان میں سے ایک بھی رہ جائے تو بیعت نہ ہوگی ۔[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ جس روز سلطان جی نے انہیں بیعت کیا تھا اس روز انہیں حفظ ایمان اور اوابین کی تلقین کی تھی ۔ حضرت نے بیعت ہوتے وقت سلطان جی سے پوچھا کہ وہ حلق کرائیں یا قصر ؟ سلطان جی نے فرمایا کہ ہر بال کی جڑ میں شیطان کا محل ہے ، اس لیے وہ حلق کروائیں بابا فرید الدین مسعودؒ نے سلطان جی کو بھی حلق کا حکم دیا تھا اور اس وقت یہ حدیث پڑھی تھی :

ان الشیطان تحت کل شعرۃ ۔[3]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ جس شخص کے سر پر مقراض چل جائے اس کے لیے بال رکھنے حرام ہیں ۔ ایک مجلس میں خواجہ غوری نے حضرت سے پوچھا کہ کتنے عرصہ بعد حلق کروانا چاہیے ؟ اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہفتے میں دو بار ۔[4]

حماد بن عماد کا شانی محرر فرماتے ہیں کہ ان کے والد حضرت برہان الدین سے بیعت ہونا چاہتے تھے لیکن وہ شرف بیعت حاصل کرنے سے پہلے ہی فوت ہوگئے ۔ ایک روز حماد نے حضرت سے اس کا ذکر کیا

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۲۶ ب ۔

۲۔ ایضاً ، ورق ۲۶ الف ۔

۳۔ ایضاً ، ورق ۲۷ الف ۔

۴۔ ایضاً ، ورق ۲۷ ب ۔ مخدوم جہانیاںؒ الدرالمنظوم میں فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی کی رضامندی کے بغیر حلق نہ کروائے ۔ (الدرالمنظوم ، مطبوعہ ملتان ۱۳۷۷ھ ، ص ۲۲۱ ۔

تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی نیت چونکہ نیک تھی ، اس لیے وہ مرحوم کو اپنی فرزندی میں قبول کرتے ہیں ۔[1]

قول ششم : دربیان لباس

قول ششم کے تحت جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک بار لکھنوتی سے کسی عقیدت مند نے سلطان جی کے لیے لباس تیار کروا کے بھیجا تو انہوں نے اسے دیکھتے ہی فرمایا کہ انہوں نے بابا صاحب کو کبھی ایسے لباس میں نہیں دیکھا ، اس لیے وہ کیوں کر اسے پہن سکتے ہیں ۔ اتفاق سے اسی مجلس میں بابا صاحب کا ایک مرید بھی موجود تھا ۔ اس نے کہا کہ اس نے بابا صاحب کو اس لباس میں دیکھا ہے ۔ سلطان جی نے فرمایا "پھر میں یہ لباس پہن لیتا ہوں ۔ اب تم ذمہ دار ہو ۔"[2]

قول ہفتم : دربیان محافظت خلعت و نفائس پیر ہر

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ جب وہ دہلی سے دکن کی طرف روانہ ہوئے تو ان کے ساتھیوں نے چارپائی کو ڈولی میں تبدیل کر کے انہیں اس میں بٹھا لیا ۔ اس کے پاس سلطان جی کا ایک عصا تھا ۔ انہوں نے اس کو ڈولی کے ایک طرف باندھ لیا اور اسے ہی بدرقہ سمجھتے رہے ۔ حضرت فرماتے ہیں کہ موصوف دوران سفر اسی کی پناہ میں رہے ۔[3]

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر مرید کے پاس اپنے پیر کے جوتے ہوں تو دوران سفر انہیں اپنے سر پر دھر لے اور رات کو سوتے وقت انہیں سینے پر رکھ لے ۔ حضرت نظام‌الدین نے خواجہ قطب‌الدین دبیر کو اپنا شب خوابی کا لباس عطا فرمایا تھا ، خواجہ نے اسے سقف میں لٹکا لیا اور رات کو اسی کے نیچے سونے لگا ۔[4]

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۲۸ الف ۔
۲۔ ایضاً ، ورق ۲۹ ب ۔ اس کپڑے کا نام جھمرتلی لکھا ہے ۔
۳۔ ایضاً ، ورق ۳۲ الف ۔
۴۔ ایضاً ،

قول ہشتم : دربیان معاملہ نفس امارہ و فضائل ناہموارہ

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت بایزید بسطامی قبرستان سے گزرے۔ وہاں ایک عورت ایک قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ موصوف بھی اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگے۔ کسی راہ گیر نے ان سے کہا کہ وہ عورت تو اپنے کسی عزیز کی یاد میں رو رہی ہے۔ حضرت کس کو رو رہے ہیں ؟ حضرت نے فرمایا کہ وہ اپنے مردہ دل کو رو رہے ہیں۔[1]

حضرت برہان‌الدین نے ایک مجلس میں فرمایا کہ مولانا وجیہ‌الدین یوسف فرمایا کرتے تھے کہ وہ جب بھی نفس کے کسی عیب کو ختم کرتے ہیں تو دوسرے عیب سر اٹھاتے ہیں۔

قول نہم : دربیان حسن معاملہ

حضرت برہان‌الدین کے زمانے میں ایک چادر دس گیارہ جیتل میں آ جاتی تھی اور بیچنے والا ایک جیتل نفع کماتا تھا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ اس سے زیادہ نفع کمانا جائز نہیں سمجھتے تھے۔[2]

قول دہم : دربیان فضیلت محاسن

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ ایک بچے نے بایزید کو بلایا۔ موصوف اس کی طرف بڑھے۔ اتفاق سے دروازے پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا ، اس نے انہیں واپس کر دیا۔ بچے نے کئی بار انہیں بلایا اور موصوف ہر بار اس کے بلانے پر اس کی طرف متوجہ ہوتے لیکن دروازے تک جا کر واپس لوٹ جاتے۔ ایک شخص نے ، جو یہ منظر دیکھ رہا تھا ، ان سے پوچھا کہ انہوں نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے ؟ حضرت بایزید نے فرمایا کہ وہ بچے کے بلانے پر اسے خوش کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھتے ہیں اور معمر بزرگ کے فرمان کا خیال کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں۔[3]

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک روز سلطان جی نماز ادا کر رہے تھے کہ شیطان نے ان کا کان کھجایا۔ حضرت نے اسے مخاطب کر کے کہا "اے جوانمرد بس کر"۔ حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ یہ سلطان

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۳۳ الف۔

۲۔ ایضاً ، ورق ۳۵ الف۔

۳۔ ایضاً ، ورق ۳۶ الف۔

جی کا اخلاق تھا کہ موصوف شیطان کو بھی جوانمرد کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے ۔[1]

قول یاز دہم : دربیان اظہار عقیدت اصفیا و اخبار کرامت اولیا

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان جی نے امیر خسرو کو کیلو کھڑی کے کوتوال کے نام ایک سفارشی خط دیا ۔ امیر وہ خط لے کر کوتوال کے پاس گیے ۔ اتفاق سے اس وقت وہ دریا کے کنارے بیٹھا تھا ۔ اس نے وہ خط پڑھ کر دریا میں پھینک دیا ۔ امیر خسرو نے واپس آکر سارا واقعہ سلطان جی کے گوش گزار کیا ۔ انہوں نے فرمایا ''او خود را در آب روان کرد'' اگلے روز شیطان (سلطان ؟) نے کوتوال کو قلعے کی دیوار سے اٹھا کر دریا میں پھینک دیا ۔[2]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ سلطان علاؤالدین کا فرزند خضر خان سلطان جی کا مرید ہو گیا ۔ ایک روز اس کے ساتھیوں نے مجلس طرب آراستہ کی اور شراب کا ایک جام اس کی طرف بڑھایا ۔ خضر خان اس جام کو لبوں سے لگایا ہی چاہتا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سلطان جی انگشت بدنداں وہاں کھڑے ہیں ۔ خضر خان نے جام صراحی پر دے مارا اور مجلس سے اٹھ کر چلا گیا ۔ یہ واقعہ بیان کر کے حضرت فرمانے لگے ''خواجگان ما فرندان خودرا در معصیت افتادن نگزارند ۔ اگر در معصیت باشند از جہان نروند تاطاب نشوند'' ۔[3]

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ایک بار کسی شخص نے سلطان جی کی محفل میں بایزید بسطامی کی بزرگی کا ذکر کیا ۔ اس پر سلطان جی نے فرمایا ''ہمارے ہاں بھی بایزید ہے'' ۔ حاضرین نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے ؟ سلطان جی نے فرمایا ''اس وقت وہ جماعت خانہ میں ہے ۔'' ان کا خادم خاص اقبال فوراً جماعت خانہ پہنچا ۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا ۔ اتنے میں حضرت برہان الدین وہاں پہنچ گئے ۔ اقبال نے ان سے کہا کہ سلطان جی نے ابھی ان کے بارے میں اس

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۳۶ ب ۔
۲۔ ایضاً ، ورق ۳۷ ب ۔
۳۔ ایضاً ، ورق ۳۹ ب ۔

خیال کا اظہار کیا ہے ۔[1]

قول دواز دہم : در فضیلت صایم و صوم

حماد کاشانی کی روایات ہے کہ حضرت برہان الدین غریبؒ داؤدی روزہ رکھا کرتے تھے ۔ ایک روز حضرت نے فرمایا کہ روزے سے چار چیزیں حاصل ہوتی ہیں ۔ روزے سے خاموشی حاصل ہوتی ہے اور خاموشی سے فکر یار پیدا ہوتا ہے ۔ اسی فکر سے معرفت حاصل ہوتی ہے اور معرفت کے ذریعے ہی یار تک پہنچتے ہیں ۔[2]

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ روزہ دار سحری ضرور کھائے خواہ وہ پانی کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو ۔

قول سیز دہم : در بیان صدق و صفا

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ جو شخص جھوٹ سے احتراز کرے گا ، وہ جو بات زبان پر لائے گا ویسا ہی ہو گا ۔ اس ضمن میں انہوں نے بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور والئی ملتان کی خط و کتابت کا بھی ذکر کیا ہے ۔[3]

قول چہار دہم : دربیان تاثیر اصحاب نعمت

جامع ملفوظات ، حضرت برہان الدین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک معلم حضرت صدر الدین ملتانیؒ کو پڑھانے پر مامور ہوا ۔ ایک دن استاد و شاگرد کے درمیان کسی مسئلہ پر بحث ہو گئی ۔ دوران بحث حضرت صدرالدین نے فرمایا ''این سخن از بابا (حضرت بہاءالدین زکریاؒ) شنیدہ‌ام'' استاد نے کہا کہ اسے اس میں کلام ہے ۔ صدرالدین نے فرمایا ''بابا از شیخ‌الشیوخ (شہاب‌الدین عمر سہروردی) شنیدہ است'' ۔ استاد نے پھر کہا ''الکلام فیہ'' ۔ صدرالدین نے اپنے والد بزرگوار سے استاد کی شکایت کی ۔ حضرت زکریا نے فرمایا کہ استاد نے ان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے ، وہ اس سے در گزر کرتے ہیں لیکن شیخ الشیوخ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے ، اسے معاف نہیں کر سکتے ۔ حضرت زکریا نے ایک

۱- احسن الاقوال ، ورق ۳۰ الف ۔
۲- ایضاً ،
۳- ایضاً ، ورق ۱۳ الف ۔

خادم کو بلا کر کہا کہ استاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے جماعت خانہ میں لے جائے اور حاضرین کو بتا دے کہ وہ تھپڑ کھانے کے لائق ہے۔ حضرت زکریا کے کہنے کا یہ اثر ہوا کہ اس واقعہ کے بعد وہ معلم جس مجلس میں جاتا وہاں سے تھپڑ کھا کر ہی اٹھتا۔[۱]

قول پانز دہم : دربیان احوال باطن اصحاب محبت

حضرت برہان‌الدین فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان جی نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ[۲] کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک نوجوان انہیں ملا۔ اس نے کہا کہ اس کے حق میں خدا سے دعا کریں کہ وہ اپنی محبت کا ایک قطرہ اس کے حلق میں ٹپکا دے۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے گا۔ نوجوان کے بار بار اصرار پر حضرت عیسیٰ نے اس کے حق میں دعا کی اور اپنی راہ لی۔ جب حضرت کا اس طرف سے دوبارہ گزر ہوا تو انہوں نے اس نوجوان کو دیکھا کہ وہ حیرت کے عالم میں کھڑا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ حضرت عیسیٰ اس کی یہ حالت دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اتنے میں جبرئیل آئے اور کہنے لگے ''اے روح اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ہماری محبت کے دریا میں غرق ہے لہذا اسے معذور سمجھنا چاہیے''۔ یہ واقعہ سن کر برہان‌الدین نے عرض کی ''حضرت آپ بھی عیسیٰ دوران ہیں۔ میرے لیے بھی ایسی دعا کیجیے۔'' سلطان جی نے فرمایا!

نیکو چیز خواستی و نیکو وقت خواستی۔[۲]

قول شانز دہم : دربیان آداب توکل و صبر و تحمل و فاقہ و فقر

حضرت فرماتے ہیں کہ سلطان جی کی خانقاہ میں ایک مسافر آیا اور چند روز وہاں رہ کر شہر چلا گیا۔ شہر میں اس کے کئی رشتہ دار رہتے تھے لیکن وہ ان میں سے کسی کے ہاں نہ ٹھہرا اور مسجد میں جا کر توکل کی نیت کر کے بیٹھ گیا۔ کئی روز گزر گئے لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ آخر کار وہ بھوک سے نڈھال ہو کر سلطان جی کی خدمت میں آیا اور ان سے سوال کرنے لگا کہ اگر متوکل کو پہلے دن

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۴۴ ب۔
۲۔ ایضاً ، ورق ۴۵ الف۔

کچھ نہ ملے تو وہ کیا کرے؟ سلطان جی نے فرمایا ''صبر'' اس نے پوچھا کہ اگر دوسرے روز بھی کچھ نہ ملے تو پھر کیا کرے؟ انہوں نے ارشاد فرمایا ''صبر'' ۔ مسافر نے کہا کہ اگر تیسرے روز بھی کچھ نہ ملے تو؟ سلطان جی نے فرمایا اس کا توکل نہیں تھا کیونکہ جو شخص خدا پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتا ہے ، خدا اسے فراموش نہیں کرتا ۔[1]

قول بیست و یکم : دربیان فضیلت انفاق و احسان

حضرت فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے سلطان جی سے سوال کیا کہ فقیر صابر اچھا ہے یا غنی شاکر؟ انہوں نے جواب دیا کہ دونوں ہی اچھے ہیں ۔[2]

حضرت برہان الدین نے اس ضمن میں بایزید بسطامی کی کئی مثالیں دی ہیں ۔ اس کے علاوہ ورد و وظائف پڑھنے اور نفلی نمازیں ادا کرنے کے کئی طریقے بیان کیے ہیں ۔

قول بیست و پنجم : دربیان وضو و نماز و نوافل و اوراد

اس قول کے تحت حضرت برہان الدین نے حفظ ایمان کے لیے دوگانہ پڑھنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے ۔ حضرت فرماتے ہیں کہ نماز مغرب کی سنتوں کے بعد یہ دوگانہ پڑھنا چاہیے ۔ اس کی ترکیب یوں ہے کہ پہلی رکعت میں سات بار سورۂ فاتحہ اور ایک بار قل اعوذ برب الناس پڑھے ۔ سلام پھیرنے کے بعد تین یا سات بار ''یاحیی یا قیوم ثبتنی علی‌الایمان'' کہے ۔ حضرت فرماتے ہیں کہ سلطان جی کہا کرتے تھے کہ اس پر عمل کرنے والے کا ایمان سلامت رہے گا ۔[3]

اس قول کے تحت حضرت برہان‌الدین نے نماز کوثر ، نماز روشنائی قبر ، نماز برائے روشنیٔ چشم ، صلٰوۃ السعادت ، صلٰوۃ برائے کفایت مہمات ، صلٰوۃ برائے افزودن عقل ، صلٰوۃ الخضر ، صلٰوۃ اشتراق ، صلٰوۃ چاشت ، صلٰوۃ زوال ، صلٰوۃ برائے حصول سعادت دارین ، صلٰوۃ برائے ادائیگی حقوق والدین ، صلٰوۃ برائے حصول ثواب شب قدر اور قبر میں

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۹۴ ب ۔
۲۔ ایضاً ، ورق ۵۳ الف ۔
۳۔ ایضاً ، ورق ۵۹ ب ۔

پہلی رات کو مونس بننے کی نماز پڑھنے کی ترکیبیں بتائی ہیں ۔ اسی طرح انہوں نے مختلف قمری مہینوں میں پڑھنے کے لیے ورد و وظائف بتائے ہیں ۔۱

قول بیست و ششم : در آداب محفل سماع

حضرت برہان الدین سماع بڑے ذوق شوق کے ساتھ سنا کرتے تھے ۔ اس قول کے تحت انہوں نے سماع سننے کے آداب بتائے ہیں ۔ موصوف فرماتے ہیں کہ سماع میں فکر اور گریہ ہونا چاہیے ، ورنہ یہ فتنہ ہے ۔ سماع کے دوران میں سامع با وضو رہے ۔ وہ محفل سماع میں گوش و ہوش کے ساتھ بیٹھے اور پانی پینے یا پان کھانے سے احتراز کرے ۔۲

حضرت فرماتے ہیں کہ بے نیت ہاتھ اٹھانے والا درویش سماع نہ سنے ۔

حضرت نے ایک دن اپنی مجلس میں فرمایا کہ ایک بار سلطان جی کے ہاں سماع جاری تھی اور ان کے مریدوں پر وجد طاری ہو رہا تھا ۔ اسی حالت میں حضرت مطبخ میں تشریف لے گئے ۔ انہیں اس وقت بڑی سخت پیاس لگی ہوئی تھی ۔ مطبخ میں موجود کسی شخص نے شربت کا گلاس پیش کیا تو حضرت نے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرید تو محفل سماع میں اپنا خون پیئں اور وہ شربت نوش کریں ۔۳

حماد کاشانی اس پر شاہد ہے کہ ایک بار سخت گرمی کے موسم میں حضرت برہان الدین کے ہاں محفل سماع جاری تھی اور لوگوں کو وجد آ رہا تھا ۔ حضرت نے دیکھا کہ محمود ترک ایک حوض کے کنارے کھڑا ہوا کھا رہا ہے ۔ حضرت نے اسے مخاطب کرکے فرمایا "اے بے ذوق درویشان درخونناہہ اند تو باد میخوری ۔"۴

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ سماع میں شیخ پہلے کھڑا نہ ہو ۔ اسے چاہیے کہ جب تک حاضرین میں سے کسی کو وجد نہ آئے ، وہ خود پر وجدطاری نہ کرے ۔ ایک روز محفل سماع میں حضرت برہان الدین کی حالت غیر ہو گئی اس کے باوجود انہوں نے آداب محفل کا خیال رکھا

۱- احسن الاقوال ، ورق ۶۰ الف تا ۶۳ ب ۔
۲- ایضاً ، ورق ۷۰ ب ۔
۳- ایضاً ، ورق ۷۱ الف ۔
۴- ایضاً ،

اور اپنے ایک ساتھی خواجہ مبارک معروف سے کہا کہ وہ پہلے اٹھے۔ جب وہ اٹھا تو حضرت بھی اٹھ کر وجد کرنے لگے۔[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ جب بابا فرید الدین گنج شکرؒ کو حال آتا تو موصوف اپنے ایک مرید محمود سے کہتے ''کیا تو زندہ ہے؟'' محمود کھڑا ہو جاتا تو پھر بابا صاحب بھی کھڑے ہو جاتے۔[2] حضرت فرماتے ہیں کہ دوران وجد شیخ کو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ اس کی دستار نہ کھلنے پائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ فوراً اسے درست کر لے ورنہ شہر پر آفت آ جائے گی۔ ایک بار دوران وجد سلطان جی کی دستار کھل گئی تو انہوں نے فوراً اسے درست کر لیا۔ ان کے کسی مخالف نے کہا کہ اگر ان پر حالت طاری تھی تو پھر انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ان کی دستار کھل گئی ہے، اور اگر انہیں معلوم ہو گیا تھا تو پھر حالت کیسی تھی؟ سلطان جی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ انہیں شہر کی پریشانی پسند نہ تھی، اس لیے انہوں نے حال چھوڑ کر اپنی دستار سنبھال لی۔[3]

حضرت فرماتے ہیں کہ سماع کے دوران میں علیک سلیک نہ کی جائے اور شور و شغب سے بھی اجتناب کیا جائے اس لیے سماع کے لیے کوئی دن مقرر کرنا چاہیے، ورنہ وہ جگہ تباہ ہو جائے گی۔[4]

حضرت برہان الدین کے ملفوظات میں کل ۹۲ اقوال ہیں۔ میں نے ان سب کا ذکر نہیں کیا اور بعض اقوال کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ جو اقوال میں نے چھوڑے ہیں ان میں فضیلت تجرید از خلایق، فضیلت اصحاب قناعت، مذمت طمع، علو ہمت، لقمہ حرام، مذلت حرص و شہوت، فضیلت صدقہ، وضو و نماز، قبول فتوحات از مردمان اور کرامات مخدوم شامل ہیں۔

۱۔ احسن الاقوال،

۲۔ ایضاً،

۳۔ ایضاً، ورق ۲۷ الف۔

۴۔ ایضاً، ورق ۲۷ ب۔

اردو کی ابتدا

حضرت برہان الدین کے ملفوظات میں کھٹ ، ڈولہ ، کچھڑی اور چھجہ جیسے ہندوی الفاظ ملتے ہیں جو روزمرہ کی گفتگو میں شامل تھے ۔ ایک جگہ انہوں نے ایک شعر بھی نقل فرمایا ہے ۔

ایک علمی انکشاف

حضرت برہان الدین کے ملفوظات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ جامع ملفوظات کے بھائی خواجہ مجدالدین کاشانی نے حضرت برہان‌الدین کے حالات میں ۔ غرایب الکرامات و عجائب المکاشفات ۔ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی ۔[1]

پنجاب اور دہلی میں امن و امان کی غیر تسلی بخش صورت حال

حضرت کے ملفوظات میں جانور یا سامان گم ہونے کے کئی واقعات ملتے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ پنجاب میں امن و امان کی صورت تسلی بخش نہ تھی ۔ پنجاب تو خیر ایک دور افتادہ علاقہ تھا ، خود دارالحکومت دہلی کی یہ حالت تھی کہ شہر اور غیاث پور کے درمیان مسافر لٹ جاتے تھے ۔ حضرت گیسودراز کے ملفوظات اس کے بعد قلمبند ہوئے ہیں ۔ ان میں یہ مرقوم ہے کہ میواتی لوٹ مار کرتے ہوئے دہلی کی فصیل تک آ جاتے تھے اور ان کے خوف سے لوگ نماز عصر کے فوراً بعد شہر میں آ جاتے تھے ۔[2] سلطان غیاث‌الدین بلبن نے میواتیوں کی روک تھام کے لیے جو اقدامات کیے تھے ، اس کے جانشین انہیں برقرار نہ رکھ سکے ۔

۱۔ احسن الاقوال ، ورق ۷۶ الف ۔

۲۔ محمد اکبر حسینی ، جوامع الکلم ، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ ، ص ۲۰۹ — دران ایام میوان می آیند میزنند میبردند ۔ نماز دیگر بالای حوض سلطان کسی نمی باشد ہمہ درون شہرمی آیند ۔

علامہ اقبال کی اردو غزل
اور انسانی عظمت کا تصور

سعد اللہ کلیم

بشر کو اس کی فردیت کے حوالے سے اکائی تسلیم کرنے کے باوجود اس کے مرتبے کا تعین تب ہی ہو سکتا ہے جب ہم اسے کسی اجتماعی تہذیبی و معاشرتی سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھیں ، کسی نظریاتی اساس کی نسبت سے اسے شناخت کریں اور اس کے عروج یا زوال پر حکم لگائیں ۔ تہذیبی اور نظریاتی خلاء میں انسان کی صحیح پہچان بڑی حد تک نا ممکن ہے ۔ اس اعتبار سے شروع ہی میں ہمیں پیش نظر رکھنا چاہیے کہ علامہ اقبال جس تہذیبی کل میں رکھ کر انسان کے مقام اور مرتبے کا تعین کرتے ہیں وہ بنیادی طور پر اسلامی تعلیمات سے تشکیل پاتا ہے ۔ اس کے بعد یہ دیکھنا مناسب ہو گا کہ علامہ کو عظمتِ بشر کے موضوع سے کس قدر لگاؤ رہا ہے ۔ اس سوال کا جواب ہمیں ان داخلی و خارجی محرکات تک لے جاتا ہے جو علامہ کے اس موضوع سے لگاؤ کا سبب بنے ۔ اس بات کا اندازہ کہ علامہ کو اس موضوع سے کس قدر لگاؤ تھا اول تو اس بات سے ہو جاتا ہے کہ ان کے جملہ افکار کا مرکزی حوالہ خودی ہے اور خودی انسان ہی کے وجود میں جاری و ساری جملہ توانائیوں کا مرکزی نقطہ بھی ہے اور سر چشمہ بھی ۔ دوسرے جب ہم ان کی اردو غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو کم و بیش ستر یا اس سے زیادہ اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں انسانی عظمت کے واضح اشارات موجود ہیں ۔ اشعار کی یہ تعداد دیگر گوناگوں موضوعات کے تناسب سے خاصی بڑی تعداد ہے بالخصوص اس صورت میں کہ ستر یا اس سے زاید اشعار کا یہ انداز علامہ کی صرف اردو غزل تک محدود ہے جس کی مقدار ان کے مجموعی ، جملہ اصناف پر مشتمل اردو فارسی کلام کی نسبت سے کچھ زیادہ نہیں ۔

تیسرے اس موضوع کے ساتھ علامہ کے لگاؤ کا اندازہ اس طرح بھی کرنا چاہیے کہ یہ اگر واحد نہیں تو ان چند گنے چنے موضوعات میں سے ایک ہے جو ایک نہ ٹوٹنے والے تسلسل کے ساتھ بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک برابر موجود رہے ہیں ۔ اس خصوصی لگاؤ کے جو خارجی محرکات علامہ کے آس پاس پھیلی ہوئی زندگی میں نظر آتے ہیں ان کا مشاہدہ ہم بر صغیر کے نسبتاً محدود دائرے سے شروع کرتے ہیں ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جس طرح ہندی مسلمان انگریزوں سے مرعوب ہو کر ہر شعبۂ حیات میں ان کی پیروی کی طرف تیزی سے مائل ہو رہا تھا اور جس طرح اپنی تہذیب ، اپنی تاریخ اور اس کے نتیجے میں خود اپنے آپ سے اس کا اعتماد اٹھتا جا رہا تھا اس کے پیش نظر لازم تھا کہ اگر ہندی مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت میں زندہ رہنا ہے تو اس کے اعتماد کو بحال کیا جائے ۔ برصغیر کے اس محدود مکانی دائرے سے آگے گزریں تو پورے عالم اسلام کے وسیع تر دائرے میں بھی اغیار سے ذہنی طور پر مرعوب ہو کر اپنے آپ سے اعتماد اٹھ جانے کی بیماری پھیل چکی تھی اس سطح پر مسلمانوں کو ملی حیثیت میں زندہ رکھنے کے لیے اسلام کی صداقتوں اپنی تہذیب و تاریخ اور اقدار و روایات پر ان کے اعتماد کو بحال کرنے کی اشد ضرورت تھی ۔ تیسرا بڑا دائرہ پوری دنیا اور پورے عالم انسانیت کو محیط ہے ۔ علامہ کو اپنے آس پاس دور دور تک انسان عدم اعتماد اور عدم تحفظ کا شکار نظر آتا تھا ۔ جنگ عظیم نے انسانیت کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا ۔ انسان کے بالمقابل اگر ایک طرف طاقتور انسان تھا تو دوسری طرف فطرت کی مہیب قوتیں تھیں ۔ تیسری طرف انسان کی اپنی ایجاد کردہ مشینیں تھیں جن کا دباؤ اس کے اعصاب پر آئے دن بڑھتا جا رہا تھا ۔ اس دباؤ سے نجات دلا کر مجموعی انسانیت کو کسی اعلیٰ تر نصب العین کی جہت میں متحرک رکھنا خود انسانیت کی بقا کے لیے ناگزیر تھا ۔ ورنہ اندیشہ موجود تھا کہ ڈارون جیسے مفکرین کے زیر اثر انسان صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر حیوانیت کی سطح پر سانس لینے لگے اور یہ منزل بہت دور نہیں رہ گئی تھی ۔

علامہ کو اسلامی تعلیمات اور تہذیب و تاریخ کی برتری کا شعور ورثے میں ملا تھا جس پر ان کا خاندان اسلام قبول کرکے عملی شہادت بہم پہنچا چکا تھا ۔ علامہ کے والد اپنے وقت کے ایک قابل احترام بزرگ

تھے اور لوگ دعا و برکت کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ گھر کا پورا ماحول مذہبی صوفیانہ ماحول تھا جس میں تلاوت کلام پاک کی گونج ہر وقت سنائی دیتی تھی۔ یہ تمام فضا اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی تھی کہ علامہ کے خیالات میں انسان کامل کے تصور کو راسخ کر دے۔ جس تصور کی پرورش آفتاب نبوت کی ضیا پاشیوں کا صدقہ تھی۔ (علامہ کی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اور محبوب، محب کے تصورات کو جس طرح اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے وہ ایک مسلمہ نفسیاتی کلیہ ہے) چنانچہ یہ جملہ داخلی و خارجی محرکات اس بات کا تقاضا کرتے تھے کہ (١) انسان کی برتری کو دیگر جملہ مخلوقات کے مقابلے میں فکری سطح پر ثابت کیا جائے۔ (٢) انسان میں فطری طور پر موجود جذبۂ افتخار کو ٹھیک سمت میں آگے بڑھایا جائے۔ پھر جس طرح علامہ کے کوائف کا تقاضا تھا کہ ان کا تصور انسان کامل قرآن پاک کی تعلیمات سے ابھرنے والی خلیفۃ اللہ فی الارض کی بشارت اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روشنی اکتساب کرے۔ اس طرح گھر کی فضا کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ علامہ تصوف میں پہلے سے موجود و متشکل تصور انسان کامل سے، جو شیخ محی الدین ابن العربی کے ہاں "حقیقت محمدیہ" کی اصطلاح سے موسوم ہوا، اپنے ذہن میں بننے والے مرد کامل کے ہیولے کی فکری سطح پر تصدیق حاصل کرے۔ اس کا ثبوت علامہ کا وہ مقالہ ہے جو ستائیس صفحات پر مشتمل ہے اور ١٩٠٠ء میں چھپ چکا ہے۔ اس مقالے کا عنوان تھا:

"The Doctrine of Absolute unity as expounded by Abdul Karim Al-Jili"

عبدالکریم الجیلی کا تصور انسان کامل شیخ محی الدین ابن العربی کے حقیقت محمدیہ کے تصور ہی کا عکس ہے۔ علامہ اقبال کے اپنے بقول یہی مقالہ ان کے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کی بنیاد بنا۔ علامہ کا ڈاکٹریٹ کا یہ مقالہ جب انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپا تو اس ابتدائیہ میں پروفیسر ایم۔ ایم۔ شریف نے یہ لکھ کر کہ: "اگر علامہ اقبال کو اپنے اس مقالے میں ترمیم کا موقع ملتا تو وہ شاید مختلف انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے"۔ شائقین اقبال سے اس مقالے تک پہنچنے کی گویا

خواہش چھین لی ۔ اس میں شک نہیں کہ خود علامہ نے بھی جب ان سے اس کا اردو ترجمہ چھاپنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ۔ کچھ اسی قسم کا تاثر دیا تھا مگر جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے علامہ کے بعض تصورات بانگ درا سے ارمغان حجاز کے دور تک مستحکم رہے اور انہی میں سے ایک ان کا عظمت بشر کا تصور تھا ۔ اس تصور میں موجود بہت سے عناصر کو اس مقالے میں شناخت کیا جا سکتا ہے ۔

علامہ کے تصور انسان کامل کے ماخذات کی تلاش میں ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ خود علامہ اقبال کی گواہی پیش کی جا سکتی ہے ۔ مثلاً میک ٹیگرٹ پر لکھے گئے مقالے میں انہوں نے یہ کہہ کر بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دیا ہے کہ ان کا تصور مرد کامل نطشے کی جگہ صوفیائے اسلام سے ماخوذ ہے اور اس سلسلے میں الجیلی پر لکھے گئے مقالے کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے ۔ میک ٹیگرٹ کے فلسفے پر علامہ کا یہ مقالہ جون ۱۹۳۶ء میں چھپا ۔ اسی طرح ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں آپ نے اسی الجیلی پر لکھے گئے مقالے کا حوالہ دیا ہے اور اسے اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ ان کا تصور مرد کامل صوفیائے اسلام سے ماخوذ ہے نہ کہ نطشے کے "سپر مین" سے ۔ یہ خط ۲۳ جنوری ۱۹۲۱ء کو لکھا گیا ۔[۱]

علامہ کے تصور عظمت بشر کی مزید بہتر تفہیم کے لیے بعض دیگر اقتباسات کو بھی سامنے رکھنا مفید رہے گا ۔ مثلاً light of relativity "Self in the" کے عنوان سے علامہ نے جو مقالہ لکھا اس میں "Pattison Pringle" کے حوالے سے کہا ہے کہ انگریزی زبان میں دنیا اور انسان دونوں کی تخلیق اور اللہ تعالیٰ سے انسانی انا کا رشتہ واضح کرنے کے لیے صرف ایک لفظ "Creation" ہے جبکہ عربی زبان اس سلسلے میں زیادہ خوش قسمت واقع ہوئی ہے کیونکہ اس کے پاس اس مفہوم کے اظہار کے لیے دو لفظ ہیں : "خلق" اور "امر" ۔ پہلا لفظ قرآن پاک میں مادی کائنات کی اللہ تعالیٰ سے نسبت کو واضح کرتا ہے جبکہ دوسرا یعنی

۱- "Thoughts and Reflections of Iqbal" by Syed Abdul Vahid Printed by Sh. M, Ashraf Lahore 1964— P. 93

''امر'' انسانی انا[1] کا اللہ تعالیٰ سے واضح کرتا ہے۔ اس تعلق کی صحیح نوعیت کی وضاحت کرنا بہت مشکل ہے اور اس مشکل کو مولانا رومی سے بڑھ کر کوئی حل نہیں کر سکتا۔

(اس کے بعد علامہ نے مولانا رومی کا یہ شعر دیا ہے)

ہست رب الناس را با جانی ناس[2] اتصال بے تخیل بے قیاس

اس تمام بحث میں علامہ نے بندے اور خدا کے باہمی رشتے کی نوعیت کو بیان کرنے کی مشکلات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ خدا اور بندے کے تعلق کی سطح بہر طور وہ نہیں جو خدا اور مادی کائنات کے تعلق کی ہے۔ اس طرح گویا کائنات اور اس کی ہر شے پر انسان کی فضیلت طے ہو جاتی ہے۔

اس فضیلت کی اساس اس عقیدے پر قائم ہے کہ تمام فضیلتوں کا مالک و خالق اپنی ذات میں صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ ہر وہ شے جو اس سے جتنی قریب ہے اتنی اعلیٰ و برتر ہے اور اسی طرح ہر وہ شے جو اس کی ذات پاک سے جتنی دور ہے اتنی اسفل اور کمتر ہے۔ اگر تو انسان محض جسم سے عبارت ہے تو وہ بھی کائنات کی ان گنت اشیاء میں سے صرف ایک ''شے'' ہے۔ انسان کو ''خلق'' کے معنوی دائرے سے نکال کر ''امر'' کی حدود میں داخل کر دینے والی چیز ''روح'' ہے۔ جس کو ''روحی'' کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنے ساتھ قائم کر دی ہے[3]۔ بعض اوقات خیال گزرتا ہے کہ علامہ نے جس شے کو ''خودی'' کہا ہے وہ بھی کہیں اسی لفظ کی معنوی حدود میں تو داخل نہیں؟ علامہ بحث کے دوران انسانی برتری کی بنیاد اسی الوہی عنصر پر اٹھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک بار پھر مولانا رومی کی گواہی پیش کی ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ اصل چیز پیکر یا خارجی وجود نہیں بلکہ اس کے بطون میں موجود وہ نورانی حقیقت ہے جس سے خارجی پیکر ''ہست'' کی صفت سے موصوف ہوتا ہے۔

۱۔ قرآن پاک ۱۷-۸۵

۲۔ "Thoughts and Reflections"—صفحہ ۱۱۳ - ۱۱۴

۳۔ قرآن پاک ۱۵ : ۲۹ ۳۸ : ۷۲

پیکر از ما ہست شد نے ما از و   بادہ از ماست شد نے ما از و

یہ تمام بحث تیسرے خطبے میں ہے ۔ اسی خطبہ کے صفحہ ۱۱۰ پر مزید لکھا ہے :-

''بزم ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے اور ذات انسان میں اپنی معراج کمال تک پہنچ جاتا ہے ۔ قرآن مجید نے بھی اسی لیے حقیقت مطلقہ کو انسان کی رگ جاں سے قریب تر ٹھہرایا ہے[1] ۔ کیونکہ یہ حیات الٰہیہ ہی کا سیل ہے جو ہمارے وجود کا سر چشمہ ہے اور جس میں ہم موتیوں کی طرح پیدا ہوتے اور زندگی بسر کرتے ہیں'' خطبۂ اول بعنوان ''علم اور مذہبی مشاہدات'' کے صفحہ ۱۷ پر علامہ لقد خلقناء الانسان فی احسن تقویم ، ثم رد دنا اسفل سافلین[2] ، کے حوالے سے انسان کی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کے آس پاس مخالف قوتوں کے حصار کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

''جس کو اپنی سب خامیوں کے باوجود فطرت پر تفوق حاصل ہے کیونکہ اس کی ذات ایک زبردست امانت کی حامل ہے ۔ وہ امانت جس کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ اسے آسمانوں ، زمین اور پہاڑوں تک نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا[3]''

اس کے بعد اس خطبے کے آغاز ہی میں ، جس کا موضوع ''خودی ، جبر و قدر ، حیات بعد الموت'' ہے ، علامہ فرماتے ہیں :

''چنانچہ تین باتیں از روئے قرآن ہمارے سامنے آتی ہیں اول یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ ہے[4] ۔ ثانیاً یہ کہ باوجود اپنی خامیوں کے وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے[5] ۔ ثالثاً یہ کہ وہ ایک آزاد شخصیت کا امین ہے ۔ جس کو اس نے خود اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر قبول کیا''

۱- قرآن پاک ۵۰ : ۱۶   ۲ : ۱۸۶

۲- ایضاً ۹۵ : ۴ ، ۵   ۳- ایضاً ۳۳ : ۷۲

۴- ایضاً ۲۰ : ۱۲۲   ۵- ایضاً ۲ : ۳۰

ہبوط آدم کا وہ تصور جو عہد نامہ عتیق کے اثر سے اسلامی روایات میں در آیا ہے ، انسان کی تنقیص کرتا ہے (علامہ اس سے انکار کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک) ''اس کا اشارہ اس تغیر کی طرف ہے جو شعور کی صاف اور سادہ حالت میں شعور ذات کی اولیں جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا ۔ وہ خواب فطرت سے بیدار ہوا اور اس نے سمجھا کہ اس کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ پر ایک سبب (علت) کی ہے''[۱] ۔

یوں تو علامہ اقبال کے خطبات اور دیگر شعری و نثری تصانیف میں عظمت بشر سے متعلق جگہ جگہ اشارات موجود ہیں لیکن ہمارا یہ مطالعہ چونکہ اردو غزل تک محدود ہے ، اردو غزل کے حوالے سے اس کے جو خدوخال سامنے آتے ہیں ان کی شناخت اور ان کے ماخذات کا اندازہ کرنے کے لیے اس قدر اقتباسات کافی ہیں ۔ اب ہم عظمت بشر کے سلسلے میں علامہ کی اُردو غزل کا براہ راست مطالعہ کرتے ہیں :

بانگ درا کے ابتدائی حصے میں علامہ کا انداز یہ رہا ہے :-

۱ وہ مشت خاک ہوں فیض پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی زمیں سے آسماں تک ہے[۲]

---

۲ وہ میکش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراق ساقیٔ نا مہرباں تک ہے[۳]

---

۳ حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں[۴]

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۔ ترجمہ و حواشی سید نذیر نیازی بزم اقبال لاہور ۱۹۵۸ء ۔ ص ۱۲۸

۲- کلیات اقبال اردو ، حصہ بانگ درا ص ۱۰۳

۳- ایضاً ص ۱۰۲ ۴- ایضاً ص ۱۰۳

۴ کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں ؟
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں[1]

---

۵ جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا ؟[2]

پہلے دونوں شعروں میں بظاہر کچھ نہ ہونے کے باوجود انسان کی وسعتوں کو زمین سے آسمان تک اور صحرا سے گلزار تک محسوس کیا گیا ہے ۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں سے تیسرے شعر میں انسانی شرف کو اس بات پر منحصر قرار دئے جانے کا اشارہ ہے کہ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کے جلوؤں کا امین ہے ۔ جبکہ چوتھے شعر میں وحدت الوجودی ذائقہ زیادہ نمایاں ہے ۔ شاعر نے عظمت بشر کو اس الوہی عنصر کے حوالے سے ادراک کیا ہے جو اس کے اندر ازل سے ودیعت کر دیا گیا تھا ۔ پانچویں شعر میں انسان کے موجودہ زوال کے باوجود اس کے اشرف المخلوقات ہونے پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے ۔

بانگ درا ہی کے دوسرے حصے میں جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہے ، عظمت بشر کے اعتراف کا انداز یہ ہے :-

کہاں کا آنا ، کہاں کا جانا ، فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ، ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے[3]

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں ، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا[4]

پہلے شعر میں شاعر نے وحدت الوجود کے نواح میں رہتے ہوئے انسان کے نوری جوہر کے حوالے سے ہر شے میں اس (انسان) کی نمود کا اعلان کرکے عقبیٰ اور بے وطنی کی تراکیب و اصطلاحات میں انسان کے زمان و مکان

۱۔ کلیات اقبال حصہ اردو بانگ درا ص : ۱۰۳
۲۔ ایضاً ص : ۱۰۰ ۳۔ ایضاً ص ۱۳۶
۴۔ ایضاً ص : ۱۰۱

سے ماوراء ہونے کے امکانات کو بیان کیا ہے ۔ جبکہ دوسرے شعر میں علامہ نے بندوں سے پیار کو (جو بالواسطہ طور پر خدا ہی سے پیار کی ایک صورت ہے) عبادت کا درجہ ہی نہیں دیا بلکہ افضل درجے کی عبادت قرار دیا ہے ۔ البتہ پیار کے قابل بندوں کی ایک شناخت بھی بتا دی ہے کہ وہ ''خدا کے بندے'' ہوں (عبدہ) نہ کہ صرف عبد ۔ خدا کی یہ بالواسطہ محبت ذہن کو غالب کے اس شعر کی طرف لے جاتی ہے جس میں ندیم دوست سے بوئے دوست کا نشان پا کر بندگئی بوتراب کو بمنزلہ بندگی حق قرار دیا گیا ہے ۔ علامہ خدا کے بندوں سے پیار کرنے والوں کی غلامی کا اعتراف کرتے ہوئے بیک وقت صعودی و نزولی دونوں جنہوں میں ذہنی تحرک کا اشارہ دیتے ہیں ۔ ایک بندے سے خدا کی طرف اور دوسری خدا سے بندے کی طرف ۔

بانگ درا کا تیسرا حصہ جو ١٩٠٨ء کے بعد کے کلام پر مشتمل ہے اس میں فکری و فنی پختگی نے علامتی انداز اختیار کر لیا ہے ۔ بے ساختگی کی صفت مزید ابھر آئی ہے ۔ اس حصے میں طور ۔ شعلۂ سینائی ۔ ساز ۔ لے ۔ نغمہ وغیرہ الفاظ علامتی مفہوم رکھتے ہیں ۔ اگر اسی علامتی اسلوب میں بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں علامہ کی سوچ ''پروانے'' سے ''جگنو'' تک کا سفر طے کر آئی ہے ۔ گویا اب علامہ اپنے آپ سے باہر کسی روشنی کی جانب لپکنے کی جگہ اسی روشنی کو اپنے اندر جذب کر کے انسان کو طالب اور محب کی بجائے مطلوب اور محبوب کی سطح پر محسوس کرنے لگے ہیں ۔

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم !
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر[1]

یہ شعر علامہ کے ذہنی سفر میں بہت اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اسی طرح جب وہ کہتے ہیں :

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے ، ہر گوش پہ عریاں ہو[2]

١- کلیات اقبال حصہ اردو بانگ درا ص : ٢٧٩

٢- ایضاً ص : ٢٨٠

تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ علامہ انسان کی عظمت کا شعور رکھنے کے مرحلے سے آگے گزر کر اس عظمت کی طرف اپنے دور کو متوجہ کر کے انسان اور بالخصوص ہندی مسلمان کو خود اعتمادی کی راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں ۔ یہ وہ دور ہے جس میں علامہ ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' سے ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' تک آ پہنچے تھے ۔

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی[1]

یہ علامہ کی اس غزل کا آخری شعر ہے جو انہوں نے سراج دکنی کی مشہور غزل :

''خبر تحیر عشق سن ۔ ۔ ۔'' کی زمین میں کہی ہے ۔ مگر سراج دکنی کی غزل اور علامہ کی غزل میں فرق سکر و صحو کا ہے ۔ سراج نے جس سکر اور جذب و مستی کو اپنی غزل میں محفوظ کیا ہے ، علامہ کی غزل میں اس کی جگہ صحو کی حالت ہے ، ہوشمندی ہے ۔ اور نفع نقصان کی اجتماعی سطح کا شعور ہے ۔ سراج ہی کی بحر میں علامہ کی ایک اور غزل بڑی مقبول ہے :

''کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں''

اگرچہ اس میں ردیف قافیہ مختلف ہے تاہم اس سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ سراج دکنی کی غزل اس عہد تک بلکہ اس کے بہت بعد تک بھی اپنے جذب و جنون کی وجہ سے علامہ کی شخصیت کے کسی ایک عنصر کو گرفت میں لے رہی ہے ۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علامہ کا رشتہ صوفیانہ انداز فکر سے قائم ہے ۔ بالخصوص ''انسان کامل'' کے حوالے سے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے ۔ اس دور تک علامہ کا تصور عظمت بشر خودی سے آگے بڑھ کر بے خودی تک آ پہنچا ہے ۔ عظمت بشر کا انفرادی سطح پر یقین اب اجتماعی سطح پر ملی اور قومی خودی تک اپنی حدود کو پھیلا رہا ہے ۔

۱۔ کلیات اقبال حصہ اردو بانگ درا ص : ۲۸۲

جہاں تک بال جبریل کی غزلوں کا تعلق ہے ان میں علامہ کے یہاں پہلے سے موجود عظمت بشر کے احساس میں مزید فکری بلوغت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں ۔ ساتھ ہی خود اعتمادی کا ایک ایسا لہجہ ابھر آیا ہے جیسے علامہ اس عہد تک اپنے افکار و خیالات کی مکمل تنظیم کر چکے ہوں ۔ بال جبریل میں انسان کا سینۂ اسرار حیات و کائنات کا صرف امین نہیں بلکہ خود ایک اسرار ہے جس کو سینۂ کائنات میں محفوظ کر دیا گیا ہو ۔ وہ اب اسے صرف ڈھونڈنے والا نہیں بلکہ ڈھونڈا جانے والا بھی ہے ۔ وہ منتظر بھی ہے ۔ اس کی رسائی عالم جذب و مستی میں صفات بُت کدے سے آگے حریم ذات تک بھی ممکن ہو گئی ہے ۔ جب وہ عاشقانہ حوصلہ مندی کو کام میں لاتا ہے تو دل وجود کو چیر کر آگے گزر جاتا ہے یہ حوصلہ مندی بال جبریل کی پہلی غزل ہی میں ہمیں متوجہ کر لیتی ہے ۔ علامہ کی لے کاری میں جمال پر بتدریج جلال غالب نظر آتا ہے ۔ انفعالیت بتدریج فعالیت کو جگہ دے رہی ہے ۔ ان کے لہجے میں غلامانہ شائستگی کی جگہ آزاد فرد کا اعتماد جھلکنے لگا ہے ۔ یوں تو یہ شعور اسلامی تعلیمات اور بالخصوص صوفیانہ مابعدالطبیعات کے حوالے سے پہلے بھی ان کی غزل میں موجود رہا ہے کہ عالم وجود کی تمام گہما گہمی اور ساری رونقیں انسان ہی کے دم قدم سے ہیں لیکن اس مرحلے میں یقین کی یہ سطح پختہ تر اور بلند تر ہو گئی ہے ۔

کچھ نمونے ملاحظہ ہوں :

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں !

میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں !

میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں[1]

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا ؟[2]

۱۔ کلیات اقبال حصہ اردو بال جبریل ص ۲۹۷/۵

۲۔ ایضاً ص ۲۹۸/۶

عالم آب و خاک و باد! سرّ عیاں ہے تو کہ میں؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟[۱]

قصور وار، غریب الدیار ہوں، لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد![۲]

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد![۳]

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ![۴]

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ![۵]

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں[۶]

علامہ کے پیش نظر اب عظمت بشر کے تین زاویے ہیں۔ ایک تو انسان کی یہ حیثیت و اہمیت کہ اسی کے دم سے سلسلۂ تخلیق میں آب و تاب اور رونق ہے۔ دوسرے یہ کہ عالم خارج یا علامہ کی اصطلاح میں عالم رنگ و بُو انسان کے بالمقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ ایک ایسا

۱- کلیات اقبال حصہ اردو بال جبریل ص ۳۲۰/۲۸
۲- ایضاً ص ۳۰۰/۸
۳- ایضاً ص ۳۰۰/۸
۴- ایضاً ص ۳۱۵/۲۳
۵- ایضاً ص ۳۰۷/۱۵
۶- ایضاً ص ۳۱۰/۱۸

جسد ہے جس میں انسان روح کی طرح کار فرما ہے۔ تیسرے یہ کہ نہ صرف ''عالم آب و خاک و باد'' سے انسان برتر ہے بلکہ ملائکہ پر بھی اسے برتری حاصل ہے۔

اگرچہ اس قسم کے تمام کلام میں بظاہر اللہ تعالیٰ کے حضور لہجے میں شوخی کا گمان گزرتا ہے۔ شاید اسی سے دھوکہ کھا کر بعض لوگوں نے یہ فرض کر لیا ہے یا اپنے کسی مفروضے کی علامہ سے تصدیق حاصل کرنا چاہی ہے کہ وہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے بالمقابل کھڑا کرکے عظمت کا تاج انسان کے سر پر رکھ دیتے ہیں۔ لیکن جب ہم (جیسے کہ پہلے کہا گیا ہے) اپنے احساس افتخار کی گرفت سے نکل کر علامہ کے افکار کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کرتے ہیں اور ان کے افکار کو جزوی طور پر دیکھنے کی جگہ ان کی کلی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ علامہ کا عظمت بشر کا تصور قرب و حضوری باری تعالیٰ کی اساس پر قائم ہے۔ انسان کے پیکر خاکی میں قابل توجہ صرف ''ایک شے'' ہے جو خدا کی ہے اور جس کی نگہبانی انسان کو انسان بناتی ہے اگرچہ یہ کام بہت مشکل بھی ہے۔

اس پیکر خاکی میں اک شے ہے، سو وہ تیری
میرے لیے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی![1]

انسانی برتری کی یہ اساس اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم علامہ کے اس قسم کے اشعار سامنے رکھتے ہیں:-

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ[2]

یہاں انسان کی بڑائی کو علامہ نے واضح طور پر اس کے ''بندۂ خدا'' ہونے پر منحصر کر دیا ہے۔

اسی سلسلے کے کچھ اور اشعار دیکھیے:

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے![3]

۱- کلیات اقبال حصہ اردو بال جبریل ص ۱۹/۳۱۱
۲- ایضاً ص ۵۲/۳۴۶
۳- ایضاً ص ۳۳/۳۲۵

تو اے اسیر مکاں! لا مکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں[۱]

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک![۲]

بعض جگہ جہاں انہوں نے انسانی ارتقاء کی جہت کو واضح کرنا چاہا ہے۔ اسے افقی نہیں بلکہ صعودی دکھایا ہے۔ اس راہ میں آنے والے مراتب کی ترتیب یہ ہے:-

(الف) عالم رنگ بو۔ (ب) ملائکہ (ج) انسان (د) خدا

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب![۳]

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی![۴]

اگر سمت درست نہ رہے تو تمام کوششیں منفی اثرات مرتب کرنے لگتی ہیں بلکہ جدوجہد کی رفتار کو جس قدر تیز کیا جائے اسی قدر انسان اپنی منزل سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ علامہ نے جب اہل وطن کو یورپ کی سمت میں رواں دواں دیکھا تو انہیں یاد دلانا پڑا اور بار بار یاد دلانا پڑا کہ یورپ کے مقابلے میں ستارے ان کے نشیمن سے قریب تر ہیں۔ یہ بال جبریل کی آخری غزل کا شعر ہے۔ بال جبریل کے بعد اسی عنوان سے متعلق ضرب کلیم کی غزلوں میں سے ایک دو شعروں کا اور ان کے تصور عظمت آدم کے خدو خال کو مزید نکھارنے کے لیے ارمغان حجاز سے دو تین فارسی کے اشعار کا حوالہ مفید رہے گا۔

۱- کلیات اقبال حصہ اردو بال جبریل ص ۳۴۲/۵۰
۲- ایضاً ص ۳۵۹/۶۷
۳- ایضاً ص ۳۷۱/۷۹
۴- ایضاً ص ۳۶۳/۷۱

تیرا زمانہ، تاثیر تیری ! نادان ! نہیں یہ تاثیر افلاک

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک[۱]

اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے ؟
مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے ؟[۲]

ہنگامہ ہائے نو بنو کسی طلب کی دلیل ہے جو حصول کی منزل تک نہ پہنچی ہو ۔ اگر انسان اپنا مقصود آپ ہی ہوتا تو لازم تھا کہ خود کو پا کر پُر سکون ہو جاتا لیکن اگر اس کے باوجود انسان کو اطمینان میسر نہیں تو ثابت ہے کہ اس سے آگے بھی کوئی منزل ہے ۔ اور وہ منزل سوائے ذات و صفات باری تعالٰی کے اور کون سی ہو سکتی ہے ؟ مختصر طور پر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمام سلسلۂ کن فکاں کا مقصود ''انسان'' ہے مگر خود انسان کا مطلوب و مقصود اللہ تعالٰی ہے ۔ بشر کی عظمت کا اللہ تعالٰی سے کٹ کر علامہ کے ہاں کوئی تصور نہیں ملتا ۔

''نہ مارا در فراق او عیارے''

انسان اُس ذات پاک سے دور ہو کر اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی علامہ فراموش نہیں کرتے کہ :

''نہ او را بے وصال ما قرارے''

اگر صورت احوال یہ ہے کہ نہ انسان بغیر خدا کے رہ سکتا ہے اور نہ خدا کو انسان کے بغیر قرار ملتا تو پھر فراق اور وصال کی نوعیت کیا ہے ؟؟

۱۔ کلیات اقبال حصہ اردو ضرب کلیم ص ۵۷۵/۱۱۳
۲۔ کلیات اقبال حصہ اردو ارمغان حجاز ص ۶۹۲/۵۰

نہ او بے ما نہ ما بے او ! چہ حال است
فراق ما فراق اندر وصال است[1]

''نہ او بے نہ ما بے او''

یہی وہ مقام فضیلت بشر ہے جس کو ذہن میں رکھ کر علامہ نے ہمیں خبردار کیا ہے کہ :

آدمیت احترام آدمی   با خبر شو از مقام آدمی ![2]

۱۔ کلیات اقبال حصہ فارسی زبور عجم ص ۵۴۹/۱۵۷
۲۔ کلیات اقبال حصہ فارسی جاوید نامہ ص ۷۹۳/۲۰۵

علامہ اقبال ـ تاریخ ساز فرد

محمد منور

ولیم جیمز نے ایک مقالے میں جس کا عنوان ہے ''عظیم شخصیتیں اور ان کا ماحول'' اس امر پر سیر حاصل بحث کی ہے کہ معاشرتی زندگی میں حرکت افراد پیدا کرتے ہیں، کوئی گروہ یا پارٹی اصلاح کے درپے ہو تو وہ کامیابی سے ہمکنار ہو ہی جائے گی لیکن اگر اس پارٹی یا گروہ کو کوئی قائد میسر آ جائے تو رفتار اقدام یقیناً تیز تر ہو جاتی ہے، اسی ضمن میں ولیم جیمز نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ترقی کی راہ روکنے کے معاملے میں بھی افراد کی اہمیت بہت کام کرتی ہے، بعض اشخاص کا دباؤ پوری سوسائٹی کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے[1]، وعلی ہذا القیاس۔

ہیگل اپنی کتاب فلسفہ تاریخ میں اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ کوئی مشیت' انسانی کاروبار حیات کو متحرک اور متغیر اور پھر ترقی یاب دیکھنے کے لیے کسی نہ کسی فرد کو آلہ بنا لیتی ہے، وہ افراد گویا اپنے دور میں کوئی مشیت کی روح یا نمائندے یا پرتو ہوتے ہیں، ہیگل نے سیزر، سکندر اعظم اور نپولین وغیرہ کی مثال دی ہے، اور پھر جب کوئی مشیت ان افراد سے مطلوبہ کام لے لیتی ہے تو انہیں اٹھا کر پھینک دیتی ہے جیسے پھل کا گودا نکال لینے کے بعد چھلکے یا خول کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ افراد عموماً زیادہ عمر بھی نہیں پاتے، سکندر کی طرح مرتے ہیں یا سیزر کی طرح قتل ہوتے ہیں یا نپولین کی طرح جزیرہ سینٹ ہلینا میں تشریف لے جاتے ہیں۔[2]

---

1. Selected Papers on Philosophy, J. M. Dent and Sons Ltd. N. York P. 188.

2. Philosophy of History, Dover Publications Inc N. York (1956) P. 31.

ہیگل کے نزدیک ایسے انقلابی ہیرو خصوصاً سیاسی اور جنگی افراد ہوتے ہیں ، اس کے مقابل ولیم جیمز کے یہاں عمومیت پائی جاتی ہے ۔ انقلاب بپا کرنے والا شخص سیاسی ہیرو بھی ہو سکتا ہے اور عام معاشرتی مصلح بھی ، وہ مبلغ دین بھی ہو سکتا ہے ، وہ شاعر بھی ہو سکتا ہے ، ظاہر ہے کہ جو جس قدر انقلاب خیز ہے وہ اتنا ہی زیادہ تاریخ ساز ہے ۔ بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں تاریخ سازی افراد کرتے ہیں ، جماعتیں یا گروہ یا معاشرے نہیں کرتے ، البتہ یہ امر فیصلہ طلب رہ جاتا ہے کہ آیا وہ افراد جو اقوام کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں آیا انہیں خدا بناتا ہی اسی کام کے لیے ہے ؟ اور کیا وہ اپنی خودی تعمیر کرنے کے بجائے محض مامور من اللہ ہونے کے باعث کار ہائے نمایاں انجام دیتے ہیں ؟ اسی طرح وہ قارونی ، ابوجہلی اور ہامانی روحیں جو کسی سوسائٹی کی ترقی کے سدرہ بن جاتی ہیں کیا ان کی اس منفی کارگزاری کی ذمہ داری بھی عالم بالا پر عائد ہوتی ہے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ پیغمبروں کو اور فقط پیغمبروں کو خدا نے خاص فرض کی آرائی کے لیے مبعوث فرمایا ، باقی خیر و شر کا انتساب اولاد آدم خود اپنی ہمت یا کم ہمتی ، اپنے ارادے کی راستی یا کجی کے مطابق کرتے ہیں ، پھر جو جس قدر موثر ہو ، منفی ہو یا مثبت ، اسی قدر وجود محسوس و ملموس ہوگا ، باقی بنی بینی طبقہ ، خواہ وہ خیر کی جانب ہے خواہ شر کی جانب ، معاشرے یا جماعت کے مثبت یا منفی انقلاب کے باب میں کسی اہمیت کا مالک نہیں ہوتا ۔

علامہ اقبال برعظیم پاک و ہند یا آج کی اصطلاح میں جنوبی ایشیا کے علمی ، ادبی ، فکری اور سیاسی ہیرو تھے ، ان کی شخصیت بڑی تدریج کے ساتھ ارتقا یاب ہوئی ، ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی کسی بھی زبان میں کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا جس کی شاعری نے استقلال کے ساتھ درجہ بدرجہ مربوط انداز میں ، عروج حاصل کیا ہو جس طرح حضرت علامہ کی شاعری نے کیا ، یہاں ہر قدم واضح ہے ، ادوار روشن ہیں ۔ نقوش عیاں ، ۔ ۔ ۔ ۔ ساتھ ہی ہم شاید یہ بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کسی بھی قوم میں کوئی شاعر ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اپنی شعری ، فنکاری اور فکری تابداری سے اپنی قوم ، معاشرے کے اذہان و قلوب کو اس قدر متاثر کیا ہو کہ افراد معاشرہ کی بیش قرار تعداد براہِ راست

ولولہ انقلاب سے سرمایہ دار ہوگئی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ شیکسپیئر کا ادبی اور فنی اثر پوری انسانی دنیا میں بے مثال ہے ، مگر اس کے فن میں کوئی انقلابی پیغام نہ تھا جو دلوں کو کسی فکری یا نظریاتی نہج پر ڈال دیتا اور دلوں میں کسی منزل کے حصول کا شوق بے پناہ اور ولولہ وافر پیدا کر دیتا ، شیکسپیئر کا عہد انگلستان کی فتح اور عشرت کی سرشاری کا دور تھا ، دانتے کے یہاں بھی ولولہ و انقلاب کی لے نہیں ، یہی حال گوئٹے کا ہے ، یہی حال قدیم عہد کے شاعر لوکریشس کا ہے ، عربی شاعری میں آغاز اسلام سے لے کر آج تک اور اسی طرح فارسی شاعری میں از آغاز تا ایندم کسی شاعر نے انقلابی ولولہ پیدا نہ کیا ، فردوسی نے ایرانی قومیت کے شعور کو ضرور اجاگر کیا مگر فردوسی کے ایک ہزار سال بعد جب ایک حقیقی انقلاب کے لیے روحوں میں اضطراب پیدا ہوا تو فردوسی یا نظامی ، یا بہار یا صادق سرمد وغیرہ کوئی بھی مدد کو نہ پہنچا ، ایرانی روح انقلاب کو زبان فصاحت کلام اقبال نے مہیا کی ، زیادہ دور نہ جائیے ، علامہ شریعتی ہی کے فرمودات دیکھ لیجیے ۔ ۔ ۔ ۔ ہم علامہ اقبال کو بھی تاریخ ساز ہیرو قرار دے سکتے ہیں ۔

ہیرو کی شخصیت اور ماحول کے مابین جس قدر شدید اور دیرپا آویزش کارفرما رہتی ہے اتنا ہی ہیرو کا ولولہ ایک سرشاری کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے ، اگر ہیرو شاعر ہو تو اس کا جہاد اس کے میدان شاعری میں جلوہ گر ہوتا ہے ، ایک عام شاعر جو کسی مخصوص مقصد یا نظریئے سے وابستہ نہ ہو اپنی پسند و ناپسند ، خوشگواری و ناگواری ، ناکامی و کامگاری ، امید و بیم ، اثر افزائی اور مقبولیت بے اثری اور نامقبولیت کے تصادمات سے دوچار رہتا ہے ، وہ ہر رنگ میں شعر کہتا ہے ، لیکن شخصیت کسی بلند مقصد اور نظریئے سے وابستہ نہ ہونے کے باعث وہ رنگا رنگی کا مالک تو ہو جاتا ہے مگر ہم آہنگی و ربط کی قوت سے محروم رہتا ہے ، ڈیوڈ ڈیشے (David Daiches) کچھ یوں لکھتا ہے کہ ہمارا مجادلہ جب دوسروں سے ہوتا ہے تو خطابت جنم لیتی ہے اور جب ہمارا مجادلہ اپنی ذات سے ہوتا ہے تو شاعری وجود میں آتی ہے ، وہ اسی ضمن میں کسی صاحب فن پر دینی روایت کے اثر کا ذکر بھی کرتا ہے ۔ نیز یہ کہ جب وہ دینی روایت منتشر ہو جاتی ہے تو پھر شاعر من میں ڈوب کر نوحے سے ہمکنار ہوتا ہے ، اس کا اندرونی درد ایک نئی لے پیدا

کر لیتا ہے ، لیکن کچھ شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کی تخلیقات حقیقی اندرونی کشمکش یا درد و غم کے بجائے محض تخیل پر مبنی ہوتی ہیں ، ایسے شعرا کی حیثیت ان باکسروں کی سی ہوتی ہے جو کسی حقیقی مد مقابل کے بجائے ہوا میں مُکّے چلاتے ہیں ، یا بھوسہ بھری کسی بوری یا مشک کی پٹائی کرتے رہتے ہیں ۔[1]

اب ظاہر ہے کہ حضرت علامہ کی شخصیت جن تعلیمات پر پروان چڑھی تھی وہ ایک مضبوط و مربوط تاریخی و تہذیبی روایت پر استوار تھیں اور پھر وہ تعلیمات علامہ اقبال کے لیے محض معلومات نہ تھیں ، وہ تعلیمات ان کی واردات بن گئی تھیں بلکہ علامات حیات ، ان واردات کا چھن جانا حیات کا چھن جانا تھا بقول مومن :

جائے خون درد ہے اب ہر رگ و پے میں ساری !
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہو گا !

چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ علامہ کی خود آگہی اور ماحول کی مخالفت دونوں کا شعور بڑھتا چلا گیا ، نتیجہ یہ کہ آویزش ، کھنچاؤ اور کشمکش کی کیفیت بھی زور پکڑتی گئی ، اور یہی کھنچاؤ ان کی شاعری کے بقاء کی ضمانت تھا ، وہ محض کوئی وقتی ہیجان نہ تھا کہ شدت کم ہو جاتی اور پھر شاعر پوچھتا کہ اب کیا ارشاد کریں : مولانا حالی نے کیا خوب کہا تھا :

اب غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر !
نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی !

خود حضرت علامہ کو بھی اس امر کا شعور تھا کہ شخصیت تکمیل یاب کسی زوال آویزش ہی سے ہوتی ہے - وہ پروفیسر نکلسن کے نام لکھتے ہیں :

”جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس کے وجود کا نکتہ مرکزی شخصیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ، (اور یہی ایغو ہے) شخصیت (در اصل)

---

1. Perspectives in contemporary Criticism, Harper and Row, New York, London, (1958) P. 59.

جوش یا ولولے کی ایک کیفیت ہے (Tension) ، شخصیت کا وجود اسی وقت تک قائم ہے ، جب تک اس جوش یا ولولے کی کیفیت انسانیت کی سب سے بیش قیمت متاع ہے اور انسان کا فرض ہے کہ اس بات کا اہتمام کرے کہ جوش یا ولولے کی اس کیفیت میں کبھی کمی پیدا نہ ہو ، جو چیز اس جوش یا ولولے کی کیفیت کو برقرار رکھ سکتی ہے ، وہی ہمیں بقائے دوام بخش سکتی ہے ، مختصر یہ کہ شخصیت کے تصور کی بدولت ہمیں ایک معیار قدر حاصل ہوتا ہے جسے کسوٹی بنا کر خیر و شر کو پرکھا جا سکتا ہے ، جو چیز شخصیت کو مستحکم کرے ، ولولے کو برقرار رکھے وہ خیر ہے ، جو چیز اس کیفیت کو کمزور کرے ، (انسان کو سست رفتاری پر مائل کرے وہ شر ہے) - - - شخصی بقا اسی کو حاصل ہوگی جو اپنی زندگی میں فکر و عمل کے ایسے طریقے اختیار کرے کہ جوش اور ولولے کی کیفیت قائم رہے ، بالفاظ دیگر شخصیت برقرار رہے ، - - - اگر ہمارے عمل کا مقصد یہ ہو کہ شخصیت کے جوش اور ولولے کی حالت برقرار رہے تو موت کا صدمہ بھی اسے متاثر نہ کر سکے گا ، موت کے بعد ایک وقفہ البتہ ممکن ہے جسے قرآن مجید برزخ کہتا ہے - - - - یہ وقفہ موت اور حشر اجسام کے درمیان واقع ہوتا ہے اور اس وقفے میں وہی انا اور ایغو باقی رہتے ہیں جو زندگی میں یہ اہتمام کر لیتے ہیں کہ برزخ کے وقفے میں اس کی شخصیت برقرار رہے'' -[1]

اب ظاہر ہے کہ وہ شخص جس کے مقاصد بلند ، نصب العین پاکیزہ اور منزلیں دور نشین ہوں گی اس کے عزم محکم کے پیدا کردہ ولولے میں ضعف آ ہی نہیں سکتا ، اس کی آرزوؤں کے میدان بھی اس کے اقدام کی نسبت سے پھیلتے چلے جاتے ہیں ، بقول غالب :

مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ایسے تاریخ ساز افراد اپنی پختہ اور نصرت پسند فطرت کی بدولت اپنے ماحول کے ہر ناموافق عنصر اور مظہر سے ٹکرا جاتے ہیں ، ان کی جدوجہد حیات ، مضمون تسخیر کی تفسیر ہوتی ہے ، وہ ماحول کے ساتھ

۱۔ شعر اقبال ، از سید عابد علی عابد ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ص ۵۰۱ - ۵۰۲ -

عاجزانہ مصالحت نہیں کرتے ، اگر ماحول ناملائم ہے تو وہ ماحول کے مطابق ڈھل جانے کے بجائے ماحول کو اپنی مرضی کے موافق ڈھالنے کے درپے رہتے ہیں ۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسے افراد از آدم تا ایندم لاکھوں کروڑوں میں ایک آدہ کی نسبت سے رونما ہوتے ہیں اور وہی ہیں جو ولیم جیمز کے بقول معاشرے میں کچھ ہلچل پیدا کرتے ہیں "انسان کامل" کے بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں :

''انسان کامل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اعجاز عمل سے تجدید حیات کرتا ہے ، اس کی فکر زندگی کے خواب پریشان کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے ، وہ پرانی اصطلاحوں کو نئے معنی پہناتا اور حقائق کی نئی توجیہ پیش کرتا ہے ، وہ تاریخ کی تخلیقی رو کو اپنے اپنے حسب منشا جدھر چاہتا ہے موڑ لیتا ہے ، اس کے ذریعے انسانی صفات عالیہ کا اظہار تاریخ میں اعلیٰ سیرت کی شکل میں ہوتا ہے اگرچہ وہ تاریخ کے امکانات اور تعینات سے ماورا ہوتا ہے لیکن اس کی جد و جہد اس سے ہم آہنگ ہوتی ہے ، وہ جان عالم اور جمیع موجودات کا خلاصہ ہے ، اقبال نے اس کی ذات کو ''سوار اشہب دوراں'' اور ''فروغ دیدہ امکان'' سے تشبیہہ دی ہے اور اس کی ذات سے ایجاد و تسخیر کی بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں''۔[1]

ہم حضرت علامہ کو انسان کامل تو قرار دینے کی جسارت نہ کریں گے ، ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ وہ اپنے دور میں اس نصب العینی انسان کامل کا پرتو سا ضرور تھے ، وہ نصب العینی انسان جو اپنے ماحول کو تابع فرمان کر لیتا ہے علامہ اقبال نے "سوار اشہب دوراں" کہا علامہ اقبال کی شخصیت کی غذا روح اسلام تھی ، وہ روح اسلام جو نور ہے لہٰذا ظلمت سے مغلوب نہیں ہوتی ، جو حریت ہے اور بندگی و غلامی کو قبول نہیں کرتی ، جو حق ہے اور باطل سے مصالحت نہیں کرتی ۔ جو فقر پسند ہے چنانچہ شکار ہوس نہیں ہوتی ، جو بلند نظر ہے لہٰذا تملّق کے سائے سے بھی دور رہتی ہے ، جو بے باک ہے اس لیے روباہی اس کا شیوہ ہو ہی نہیں سکتی ، جو شاہین کی طرح بلند پرواز ہے لہٰذا خاک بازی کی اس سے توقع نہیں کی جا سکتی ، جو خار اشگاف ہے اس وجہ سے کاروبار

۱- روح اقبال ، آئینہ ادب ، لاہور ، ص ۲۰۶ ۔

شیشہ سازی اس کے مزاج ہی کے خلاف ہے ، وغیرہ ، چنانچہ روح اسلام کا پر تو جہاں بھی ہوگا وہاں باطل سے ، ظلمت سے ، بزدلی سے ، ہوس سے، غلامی سے دروغ و تملق سے غرض اس عنصر ، وصف اور جوہر سے دوری ، نفرت اور عداوت ہوگی جو انسانی خودی کو کمزور کرنے کا باعث ہو ، اور اس کے برعکس ہر اس وصف ، عنصر اور جوہر سے قرب ، مروت اور دوستی ہوگی جو انسانی خودی کی تقویت کا سبب ہو ، ہر مثبت شے خیر لہٰذا روح اسلام ، اور منفی شے شر لہٰذا مخالف روح اسلام ، ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت علامہ وہ تاریخ ساز فرد تھے جو روح اسلام سے پرتو پذیر ہونے کے باعث اسلامی قدروں کے زبردست حامی اور ترجمان تھے ، اور برعکس کے دشمن ۔

حضرت علامہ کی شخصیت میں اسلامی تعلیمات راسخ تھیں ، ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام حق ہے اور حق مغلوب نہیں ہو سکتا ، مگر جب چشم ہوش سے دیکھا تو فقط یہی نہیں کہ وہ جس وطن میں نشو و نما پا رہے تھے وہی غیر مسلموں کا غلام تھا بلکہ تقریباً پورا عالم اسلام غیروں کے پنجہ استبداد میں صیدزبوں تھا ، جنگ عظیم اول کے خاتمے پر آخری جھنڈا جو ترکوں نے اپنے کمزور اور بیمار ہاتھوں میں تھام رکھا تھا وہ بھی سرنگوں ہو گیا ، برعظیم کی مسلم آبادی دوہری مصیبت میں مبتلا تھی ایک طرف انگریزی استعمار تھا اور دوسری طرف ہندو اکثریت کا معاشی تسلط ، ہندو قوم کا تہذیبی تسلط بھی انگریز کے تہذیبی تسلط کے ساتھ ساتھ کارفرما تھا ، اس دور میں دنیا کے اندر جمہوری آوازے بلند ہونے لگے ، ہندو قوم کے لیے یہ آوازے بڑے خوش آئیندہ تھے ، مراد یہ کہ ہندوؤں کو جمہوری نغموں میں اپنی فتح کا میٹھا رس محسوس ہو رہا تھا ۔ مسلمان پورے برعظیم میں چوتھائی کے قریب بھی بمشکل تھے ۔

حضرت علامہ جیسا صاحب نظر و بصر آدمی جانتا تھا کہ غلام اقوام معاصر دور کی غالب اقوام کے نظریہ حیات اور فلسفے کے حضور میں گردن ڈال دیتی ہیں ، یہی عالم پورے مشرق کا ہوا ۔ یہی عالم پورے معاشرے کا ، حضرت علامہ کے معاصر دور کا فلسفہ سر تا سر مادی تھا اس سے مخصوص مغربی تصور وطنیت و قومیت ابھرا جو اسلامی روح سے متصادم تھا ۔ اقوام غالب کا یہی مخصوص فلسفہ تھا ، چنانچہ پوری دنیائے آدم ہوس کی افراتفری میں مبتلا ہو گئی ، انسانیت گوئی بامعنی کلمہ ہی نہ رہا ، مراد یہ ہے کہ انسانی اقدار پائمال زر و مال اور خراب قمار و شراب

ہونے لگیں ، اور یہی عام چلن بن گیا ، اس لیے کہ یہی شاہی سکہ رواں تھا ، پھر امت مسلمہ میں ہزاروں کوتاہ نظر وہ بھی تھے جو اقوام غالب کی اس روش کے اندھے نقال بن گئے اور بنتے جا رہے تھے ، جب مادہ پرستی ہی دین بن جائے اور روحانی معیارات ناپید ہو جائیں تو دہریت لازماً ظہور میں آتی ہے ، حواس خمسہ سے آگے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا اور حواس خمسہ بھی لذت کی حدود کے قیدی ہو کر رہ جاتے ہیں ، غرض حضرت علامہ کو غلامی ، بزدلی ، بے بصر نقالی ، دہریت اور ہوس کے خلاف آوازہ بلند کرنا پڑا ، انہیں حریت کے گیت گانے پڑے ، انہیں اخوت اور شجاعت کا درس دینا پڑا ، انہیں فقر و استغنیٰ کی مستی روحوں میں راسخ کرنی پڑی ، انہیں دنیا داری کو جھنجھوڑنا پڑا ، انہیں دینداروں کو جھٹکانا پڑا - - - - گویا ان کے اندر کی دنیا ان کے باہر کی دنیا سے متصادم ہوئی اور یہ تصادم ان کے دم آخر تک جاری رہا ، وہ جانتے تھے کہ نور و ظلمت اور خیر و شر کی یہ جنگ بے پایاں ہے ، اسے تا ابد رہنا ہے :

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی کے شرار بولہبی !۱

قومیت و وطنیت کا معاصر فلسفہ اسلام کے عطا کردہ نظریہ آخوت آدم سے صریحاً متصادم تھا - برعظیم پاک و ہند کے اندر بھی اور باہر بھی مسلمان اقوام اور معاشرے اس کی زد میں آ رہے تھے - جہاں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں اس نظریے سے انہیں اپنے وطن کے اندر کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچتا تھا لیکن تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ''امت'' کا تصور دھندلا رہا تھا ، برعظم کے اندر جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور اسی طرح دنیا کے بعض دیگر ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اس قومیت و وطنیت کے جدید موقف کے باعث اپنی حیثیت اور اپنے تشخص کی پامالی کے خوف سے دوچار تھے - - - - اسلوب احمد انصاری حضرت علامہ کے کلمات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱- بانگ درا ، ص ۲۷۹ ، فیروز سنز ۱۹۶۲ء -

"جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا اس کی روح سے اسلام محض انسان کی اخلاق اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی گہرا احساس انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے" ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ وطنیت و قومیت کو یہ سبب اس کے کہ یہ جغرافیائی حد بندیوں کی طرف لے جاتا ہے اور مرکزی اقدار حیات کی نفی کرتا ہے ، اپنے برہان قاطع سے یکسر مسترد کر دیا" ۔۱

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علامہ کی شخصیت جن اقدار اور نظریات پر ترتیب یاب ہوتی تھی وہ اتنے راسخ اور مستحکم ہو گئے تھے کہ جملہ وہ عصری عناصر جو ان اقدار اور نظریات کے مخالف تھے گویا حضرت علامہ کو دعوت مبارزت دے رہے تھے ، ایک عام اور معمولی شخص جو اپنے عقائد و تصورات کو معاشرے یا ماحول کے عقائد و مراسم سے مختلف دیکھتا ہے تو یا وہ اردگرد کا اثر قبول کر لیتا ہے یا پھر یہ کہ اپنا ایمان بچانے کے درپے رہتا ہے ، لیکن بعض وہ افراد ہوتے ہیں جو اپنا ایمان بچانے یا اپنی ہی روش کا دفاع کرنے کو کافی نہیں جانتے بلکہ وہ مخالف ماحول کو مسخر کرنے کے درپے ہوتے ہیں لہذا اپنے معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کی خاطر مصروف جہاد ہو جاتے ہیں اور پھر اپنے عزم صمیم اور ایمان محکم کی بدولت اس جہاد میں کمی تا دم آخر نہیں آنے دیتے ، یہی فرق ہے ایک عام صاحبِ ایمان میں اور ایک خاص صاحبِ ایمان میں جو مرد میدان بھی ہو ۔ پروفیسر محمد مجیب رقم طراز ہیں :

"ڈاکٹر اقبال کا دل چھوٹے کاموں میں لگ ہی نہ سکتا تھا اور کوئی مانے یا نہ مانے اُن کا دل اپنا بڑا کام کر بھی گیا ۔ جس شخصیت کا وہ خواب دیکھتے تھے اس کے اور ان کے درمیان موقع کا فرق تھا ، جس عمل کو وہ سچا سمجھتے تھے وہ غور کیجیے تو ان کے اپنے کارناموں کا بس دوسرا رخ ہے ۔ انہوں نے اپنے اندر وہ یقین پیدا کر لیا تھا جو دنیا میں ایمان پھیلاتا ہے اور زندگی کا سارا بوجھ سنبھالتا ہے ، ۔ ۔ ۔ ۔

۱۔ نقش اقبال ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی ، ص ۱۸۳ ، ۱۸۴ ۔

انہوں نے بہتیرے بھید پا لیے تھے جو یقین کی جان اور انسانیت کی آبرو ہیں اور ان میں وہ صفت پائی جاتی تھی جو سچے یقین ، سچی انسانیت اور سچے علم کی پہچان ہے یعنی ایک پوری ملت کے تمام گہرے اور مستقل اور زندگی کو شکل و صورت دینے والے جذبات سمٹ کر ان کے دل میں آ گئے تھے اور اسے ایک ایسا نمونہ بنا دیا تھا کہ جسے دیکھ کر تاریخ کہتی ہے ہاں صحیح ہے ، مذہب کہتا ہے کہ ہاں یہی چاہیے اور ہر زمانے کے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری آرزو ہے کہ ہم بھی ایسے ہو جائیں'' ۔۱

اپنے لیے تو زندہ رہنے والے کروڑوں اور اربوں گزرے ہیں ۔ مگر دوسروں کے گہرے اور مستقل اور زندگی کو شکل و صورت دینے والے جذبات سمیٹ کر ''اپنے دل میں ڈال لینے والے ۔ ۔ ۔ ۔ مراد ہے دوسروں کی خاطر ، معاشرے اور انسانیت کی خاطر ۔ ۔ ۔ ۔ زندہ رہنے والے کتنے لوگ ہوتے ہیں ؟ خود اپنی غرض کی خاطر اور تکمیل آرزو اور تحصیل ہوس میں بھی افراد میدان میں اترتے ہیں ۔ فتوحات و تسخیرات کا شوق پورا کرتے ہیں ، لیکن ظاہر ہے کہ وہ عمل دوسروں کے درد کی ترجمانی نہیں ، دوسروں کو ذوق طلب اور شوق ترقی سے ہمکنار نہیں کرتا ، افراد اپنی ہوس کو نافذ کرکے بعض اوقات اپنی ہی سوسائٹی کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں ، تماشا دکھاتے ہیں اور مداری چلے جاتے ہیں ، خون بہاتے ہیں بسملوں کا تماشا دیکھ کر چنگیز صفت درندے روانہ ہو جاتے ہیں ، ان کا بھی ایک رول ہے ، وہ بھی تاریخ کے دھارے کو متاثر کرتے ہیں ، مگر ان میں اور ایک درد مند اصلاح آموز مجاہد میں زمین و آسمان کا فرق ہے ، چنگیزی فتوحات اور معاملہ ہے ، روحانی نصرتیں اور مسئلہ ہے ، روحانی نصرتیں بھی تاریخ کا دھارا موڑ دیتی ہیں اور ان نصرتوں سے ہمکنار ہونے والے افراد بعض ممالک و اقوام کی تسخیر اور تہذیب کا ذوق پورا کرنے والے ہوش کنندگان کے مقابل کم اہمیت کے مالک نہیں ہوتے ۔

یہ تو عیاں ہے کہ کوئی فرد اولاد آدم اس وقت تک واقعی فرد مفید کے طور پر تربیت یاب نہیں ہوتا جب تک وہ کسی معاشرے میں

۱۔ اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں ، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی ، ص ۳۰ ، ۳۱ ۔

زندگی کے تجربات کی بھٹی میں سے نہ گزرے ، اگر کوئی فرد حق گو ہے تو اس کی حق گوئی لوگوں کے ساتھ لین دین اور ربط و معاملہ ہی کے باعث ہو گی ، ورنہ حق گوئی شخص کی خود اپنے حق میں محض ایک خوش گمانی کے درجے سے آگے نہ بڑھے گی ، اس طرح صبر ، استقلال ، برد باری ، ایثار ، شفقت ، غیرت اور حمیت وغیرہ اوصاف معاشرتی زندگی ہی میں پیدا ہو سکتے اور اُبھر سکتے ہیں ۔ تارک الدنیا شخص کوئی اخلاقی فرد معاشرہ نہیں لہذا وہ معاشرے کے لیے مفید نہیں ہو سکتا ہے ، لیکن یہ امر بہر حال اپنی جگہ واضح ہے کہ اعلیٰ اوصاف کے نمونے یا ترقی کے رویے افراد ہی پیدا کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی اس باب میں رائے یہ ہے :

"تاریخ بتاتی ہے کہ سوسائٹی کی ساری ترقی کا دار و مدار انفرادی شعور اور فرد کی سعی و عمل کا مرہونِ منت رہا ہے ، اکثر اوقات خود جماعتوں کی سعی و جہد انفرادی جدت اور حوصلے پر منحصر ہوتی ہے ، اپج اور جدت طرازی خالص انفرادی صلاحیت ہے ، جماعت تخلیق نہیں کر سکتی ، وہ زیادہ سے زیادہ استفادہ اور تقلید کر سکتی ہے ، بالعموم انفرادی جدت طرازی کے نتائج اجتماعی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں ، سائنٹیفک ایجاد پہلے ایک شخص کرتا ہے ، بعد میں یہ ایجاد اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے اجتماعی حیثیت اختیار کر لیتی ہے ، اسی طرح تمدنی قدروں کی تخلیق بھی افراد کرتے ہیں جن کی اشاعت پوری جماعت میں ہو جاتی ہے ، مجرد اور غیر مشخص معاشرے نے جو افراد کا مجموعہ آج تک نہ کوئی سائنٹیفک چیز ایجاد کی اور نہ کسی تمدنی قدر کی تخلیق کی ، انفرادیت پسندی کے نزدیک فرد ہر چیز کا پیمانہ اور معیار ہے اور زندگی کی قدروں کا تعین اسی کی ذات سے ہے ، افراد جس طرح اپنے تعلقات کو مربوط و مرتب کریں گے انہی کے تحت سوسائٹی کی شکل پیدا ہو گی — افراد ہی وہ معین مرکز ہوتے ہیں ، جن کے ارد گرد اجتماعی تصورات و جذبات جمع ہوتے ہیں ۔ بقول بودلیئر" حقیقی ترقی جو اخلاقی ترقی سے عبارت ہے فرد کی ذات میں اور فرد کے ذریعے ہی ممکن ہے ۔[1]

برعظیم کے مسلمان انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنی ہمہ جہتی

۱- روح اقبال ، ۲۱۶ ، ۲۱۷ -

شکست سے دو چار تھے ، ان میں روح تازہ پیدا کرنے کے لیے سرسید کی ہمت ، حوصلے ، تدبّر اور جوش ایمانی کو داد دینا پڑتی ہے ۔ ایک باحوصلہ فرد نے ایک لشکر کا کام کیا ، پھر اس ایک فرد نے کئی افراد پیدا کیے ، خود اپنی جگہ ایک نظام شمسی بن گئے ، حضرت علامہ نے جب ہوش سنبھالا تو برعظم کے مسلمانوں کی حالت خستہ و خراب تھی ، دلوں میں بے تابی تھی ، دلوں کی اس بے تابی کو مایوسی ختم کر کے سرسید نے پیدا کیا تھا ۔ اکبر الہ آبادی نے پیدا کیا تھا ، مولانا حالی نے پیدا کیا تھا ، علامہ شبلی نے پیدا کیا تھا ، پھر حضرت علامہ نے حالات کا چیلنج قبول کیا اور وہ راستہ اختیار کیا جو پیغمبروں کی انتھک روح نے اختیار کیا تھا ، مراد ہے اللہ کے پیغمبر اللہ کی راہ میں کبھی مایوس نہیں ہوئے ، وہ کامیاب ہوئے یا ناکام رہے مگر اللہ کی عطا کردہ نوری ہدایات بنو آدم کی بہتری کی خاطر بنو آدم تک پہنچانے کی خاطر ہر دم سرگرم عمل رہے ، قرآن گواہ ہے کہ بارہا پیغمبر ناکام رہے ، قرآن گواہ ہے کہ بارہا پیغمبروں کو قتل کر دیا گیا ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ، جنہیں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اولاد آدم کی راہ میں ایثار کرنا اور کڑیال جھیلنا ہوں وہ نہ مایوس ہوتے ہیں اور نہ ادائے فرض کے احساس سے دست کش ہوتے ہیں ، نہ غم کھاتے ہیں اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ ذاتی فتح و کامرانی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ فقط خدا کی خوشنودی کے لیے ہوتا ہے ، پھر مایوسی کیسی ؟ پھر غم کیوں ؟ علامہ اقبال نے جو جو چیلنج قبول کیے تھے جن کا ذکر آغاز مقالہ میں آ چکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بڑے زور دار چیلنج تھے ، ان سب کا مقابلہ بہت سے مطالب کے حصول کے لیے تھا مگر وہ سب مطالب جس آخری نقطے کے گرد گھومتے تھے وہ یہ تھا کہ آدمی صحیح معنوں میں خود شناس ہو — اپنا مقام پہچانے ، اور یہ جبھی ممکن تھا کہ اسے یقین ہو جائے کہ خدا کے بعد پوری کائنات آدم ہی کے لیے مسخر ہے ، وہ کائنات میں مغلوب نہیں ، وہ غالب ہے ، بقول حضرت علامہ :

زندگی مضمون تسخیر است و بس !
آرزو افسون تسخیر است و بس ![1]

۱- اسرار خودی ، ص ۵۳ ، ۳۵ -

حضرت علامہ نے مولانا شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا قول نقل کیا ہے کہ :

''محمدؐ عربی بر فلک الافلاک رفت و باز آمد ، و اللہ اگر من رفتے ہرگز باز نیا دزے'' ۔ ۔ ۔ ۔ (محمدؐ عربی فلک الافلاک پر تشریف لے گئے اور پھر لوٹ بھی آئے ، خدا کی قسم اگر میں جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا)

اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت علامہ کہتے ہیں :

''شیخ موصوف کے اس ایک جملے سے ہم اس فرق کا ادراک نہایت خوبی سے کر لیتے ہیں جو شعور ولایت اور شعور نبوت میں پایا جاتا ہے صوفی نہیں چاہتا واردات اتحاد میں اسے جو لذت اور سکون حاصل ہوتا ہے اسے چھوڑ کر واپس آئے ، لیکن اگر آئے بھی ، جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے ، تو اس سے نوع انسانی کے لیے کوئی خاص نتیجہ مرتب نہیں ہوتا ، برعکس اس کے نبی کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے ۔ وہ ان واردات سے واپس آتا ہے تو اس لیے کہ زمانے کی رو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ و تصرف سے جو عالم تاریخ کی صورت گر ہیں مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے ، صوفی کے لیے تو لذت اتحاد ہی آخری چیز ہے ، لیکن انبیاء کے لیے اس کا مطلب ہے ان کی اپنی ذات کے اندر کچھ اس قسم کی نفسیاتی قوتوں کی بیداری جو دنیا کو زیر و زبر کرسکتی ہیں اور جن سے کام لیا جائے تو جہان انسانی دگرگوں ہو جاتا ہے'' ۔[1]

عیاں ہے کہ حضرت علامہ نے بھی ''اتحاد کے لذت چشیدہ'' صوفیہ کے بجائے انبیاء کی روش کو پیش نظر رکھا اور جہان آدم کو دگرگوں کرنے کے لیے اپنی جملہ اہلیتیں صرف کر دیں اور انہیں بھرپور توقع تھی کہ ایک وقت آئے گا کہ ان کی اس انقلاب انگیزی کا اعتراف کیا جائے گا ۔

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کردیک مرد خود آگا ہے[2]

۱۔ تشکیل جدید ، ص ۱۸۸ ، ۱۸۹ ۔
۲۔ زبور عجم (کلیات اقبال فارسی) ، ص ۳۹۲/۱۰۰ ۔

- علامہ اقبال کے جملہ شعری اور نثری مجموعوں کے بارے میں بنیادی معلومات (پس منظر، ترتیب و تیاری، کتابت و طباعت، طبع اول کی تواریخِ اشاعت کا تعین، مابعد اشاعتوں کی تفصیل)
- نظم و نثر اقبال کے متن کی تحقیق (ترامیم، محذوفات، ترتیب اشعار میں تقدیم و تاخیر، اغلاطِ کتابت و املا)
- بعض نثری تحریروں کے بارے میں غلط فہمیوں کی تصحیح
- بعض غیر مطبوعہ تحریروں کی دریافت

پر مبنی

تصانیفِ اقبال

کا

تحقیقی و توضیحی مطالعہ

''یہ ایک اہم اور ناقابلِ فراموش کتاب ہے۔ اقبالیات میں اس کی حیثیت حوالہ جاتی کتاب کی ہے۔ اس سے استفادہ کیے بغیر اقبال کی نثر و نظم کے صحیح متن کا مطالعہ ممکن نہ ہوگا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے اقبال پر بہت بڑا کام کر دکھایا ہے۔''

ڈاکٹر ابنِ فرید (''الفاظ''، علی گڑھ)

صفحات: ۵۰۴ + ۴۳ - قیمت: مجلد ۷۰ روپے

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ، لاہور

اقبال اور ابن خلدون

حسن اختر

ابن خلدون کا شمار دنیا کی اہم ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے ۔ وہ ایک عظیم مورخ ہی نہیں بلکہ اپنے زمانے کے متداولہ علوم کے ماہر بھی تھے ۔ مقدمہ ابن خلدون ان کی ضخیم تاریخ کا مقدمہ ہی نہیں بلکہ اسے تمام علوم کا مقدمہ کہا جا سکتا ہے ۔ انہوں نے اس مقدمے میں ایک زندہ معاشرے کا تجزیہ کیا ہے اور اس کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ۔ وہ بقول اقبال ''تاریخ جدید کے علمی مطالعہ کا موسس ہے وہ پہلا شخص تھا جس نے نفسیات کے اس پہلو میں نہایت گہرے غور و فکر سے کام لیتے ہوئے وہ تصور قائم کیا ہے جسے آج کل نفس تحت الشعور سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔''[۱]

ابن خلدون کا نام عبدالرحمن تھا ۔ والد اور دادا کا نام محمد تھا ۔ ان کے پڑدادا کا نام خلدون تھا ۔ ابن خلدون تونس میں ۷۳۲ھ میں پیدا ہوئے ۔ وہیں پرورش پائی اور علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد ابن بطوطہ کی طرح مختلف ممالک کی سیر کی ۔ حکام نے ان کی قدردانی کی اور انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا مگر ایسا بھی ہوا کہ بادشاہوں نے ناراض ہو کر ان کو قید کر دیا ۔ ۷۷۶ھ میں ابن خلدون تلمستان میں بنی سلامہ کے قلعے میں اقامت پذیر ہوئے اور یہیں اپنا مشہور مقدمہ مکمل کیا اور تاریخ لکھنا شروع کی ۔ چار سال یہاں قیام کرنے کے بعد وہ اپنے وطن پہنچے اور تاریخ کی تکمیل میں مصروف ہو گئے مگر دربار میں ان کی شکائتیں ہونے لگیں تو وہ مصر چلے گئے ۔ وہاں سلطان مصر

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ترجمہ سید نذیر نیازی ۱۹۸۳ء ص ۲۹۵ ۔

نے ان کو ۷۸۶ھ میں قاضی مقرر کر دیا - یہیں انہوں نے اپنی تاریخ ۷۹۷ء میں مکمل کی - ابن خلدون نے مصر میں ۸۰۸ھ میں وفات پائی -

علامہ اقبال ابن خلدون کو ایک عظیم مورخ اور نفسیات انسانی کا ماہر خیال کرتے ہیں - انہوں نے اپنے خطبات میں جا بجا ان کی تعریف کی ہے اور ان کے خیالات سے استفادہ کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ ابن خلدون نے قرآن کی روح کو سمجھتے ہوئے تاریخ کا ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو آئندہ قوموں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا - وہ اپنے خطبے اسلامی ثقافت کی روح میں رقم طراز ہیں -

''بہ نگاہ حقیقت دیکھا جائے تو ابن خلدون کا مقدمہ سر تا سر اس روح سے معمور ہے جو قرآن مجید کی بدولت اس میں پیدا ہوئی - وہ اقوام و امم کے عادات و خصائل پر حکم لگاتا ہے تو اس میں بھی زیادہ تر قرآن پاک ہی سے استفادہ کرتا ہے - چنانچہ اس نے بہ حیثیت قوم عربوں کی سیرت اور کردار کی بحث میں جو لکھا ہے قرآن پاک ہی کی اس آیت کی تفصیل مزید ہے -

''اور وہ عرب سخت منکر ہیں اور منافق اور اسی لائق کہ نہ سیکھیں قاعدے جو اللہ نے نازل کئے اپنے رسول پر اور اللہ سب جانتا ہے اور بعضے عرب وہ ہیں کہ ٹھہراتے ہیں اپنا خرچ کرنا جرمانہ اور تاکتے ہیں تم پر زمانے کی گردشیں انہیں پر آوے زمانے کی گردش بری اللہ سب سنتا اور جانتا ہے (۹ : ۹۷، ۹۸)''[۱]

اس آیت میں عربوں کی خودسری کی طرف اشارہ ہے اور ابن خلدون نے بھی عربوں کی فطرت سے بحث کرتے ہوئے کچھ ایسی ہی باتیں کہی ہیں وہ لکھتا ہے -

''عرب ایک وحشی قوم ہے جس میں وحشیانہ عادات و خصائل ایسی جڑ پکڑ گئے ہیں کہ ان کے جبلی و فطری عادات و خصائل شمار ہونے لگے ہیں اور یہ وحشت عربوں کی اس لیے ہے چوں کہ اس میں ان کو دوسروں

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ترجمہ سید نذیر نیازی ۱۹۵۸ء ص ۲۰۳ - علامہ اقبال نے قرآن کی عربی عبارت نقل کی ہے ہم نے اس کی بجائے ترجمہ لکھ دیا ہے -

کی تابعداری سے چھٹکارا ملتا ہے اور کسی کی سیاست کے سامنے وہ سر نہیں جھکاتے ۔ ان کا یہ رجحان طبع ظاہر ہے کہ آبادی اور تمدن کے سخت خلاف ہے پھر یہ بھی ہے کہ ادھر ادھر چلتے پھرنے اور لوٹ مار کے عادی ہیں ۔ بہت دفعہ لوگوں پر جرمانے عائد کرتے ہیں صرف لالچ سے کہ اس راستہ سے ان کو مالی فائدہ پہنچے ، آمدنی کی ایک شکل ہو اور بکثرت دولت جمع ہو سکے کیونکہ یہ زر طلبی کے دلدادہ تو پہلے ہی سے ہیں چنانچہ ان کے طرز عمل سے بجائے اس کے کہ فساد رکے ، ظالم کا ہاتھ روکا جائے ، فساد کی آگ اور بھڑکتی ہے ۔ ۔ ۔ ان میں خودسری پرلے درجے کی ہے یہ دوسروں کی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے اگرچہ وہ دوسرا باپ بھائی یا قبیلہ کا مکھیا کیوں نہ ہو ۔ ہاں کبھی وہ شرم و حیا سے بالکل نخواستہ دب جاتے ہیں ۔ اسی لئے ان میں سے ہر ایک رعایا کو خوب نچوڑتا ہے اور ان پر حکومت کے ارمان نکالتا ہے''[۱]

علامہ اقبال نے دو سورتیں نقل کی ہیں ۔ ان سے اگلی سورت میں ان عربوں کا ذکر بھی آیا ہے جو اللہ پر ایمان لے آتے ہیں ۔ ان کی خصلت بہتر ہو جاتی ہے اور وہ نیک انسان بن جاتے ہیں ۔ اس سورت کا ترجمہ درج ذیل ہے :

''اور وہ عرب جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا خرچ کرنا اور رسول ؐ کی دعا لینا انہیں اللہ کے قریب لاتا ہے تو یقیناً وہ انہیں اللہ کے قریب لاتے ہیں ۔ اللہ ان پر اپنی رحمت نازل کرے گا ۔ یقیناً اللہ غفورالرحیم ہے ۔" (۹ : ۹۹)

ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں عربوں کے اس دوسرے طبقے کا بھی ذکر کیا ہے ۔

''ہاں دین و مذہب کی جلا سے جب عرب طبائع کا رنگ پلٹتا ہے تو پھر سیاست ملکی کی قابلیت ان میں پیدا ہوتی ہے ۔ مذہب ان میں ظلم و تشدد کی جڑ کاٹ کر محبت و پیار پیدا کرتا ہے اور ایک دوسرے

۱۔ مقدمہ ابن جلدون ترجمہ مولانا سعد اللہ خان یوسفی ص ۱۵۶—۱۵۷

کی طرف دست درازیوں سے روکتا ہے چنانچہ جب عرب قوم میں حکومت کی بنیاد پڑی اور دین نے شرعی قوانین کے ماتحت سیاسی امور کو پختگی سے ملک میں رائج کیا اور وہ احکام بھی رائج و نافذ کئے جو آبادی کی ظاہری اور باطنی مصالح کی رو سے از بس ضروری تھے اور اسی نہج پر خلافتوں کا سلسلہ چلا تو عربوں کی حکومت نے زور پکڑ لیا اور ان کی سلطنت میں ایک شان پیدا ہو گئی - چنانچہ رستم ایرانی فوج کا سپہ سالار جب مسلمانوں کو جماعت کی صف بندی میں اکٹھا دیکھتا تو کہتا عمرؓ واقعی کرشمہ ساز انسان ہے کہ عرب کے کتوں کو کیسے آداب سکھا رہا ہے پھر جب مسلمان قبائل نے دین کو چھوڑا تو سلطنت بھی ان کے ہاتھ سے نکلی اور سیاست کو بھی انہوں نے بھلا دیا اور پھر ریگستانوں کی طرف چل دیئے -"[۱]

قرآن حکیم میں کسی روایت کو پرکھنے کا یہ ذریعہ بتایا گیا ہے کہ اس کے راوی کے متعلق معلوم کرو کہ اس کا کردار کیسا ہے - چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے -

"اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لے کر آوے تو تحقیق کرو -" (۴۹ : ٦)

علامہ اقبال نے سورۂ حجرات کی اس آیت کو غلط اور صحیح کے پرکھنے کا معیار قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اسی کو سامنے رکھ کر مسلمانوں نے قانون شہادت کو وضع کیا اور احادیث کے متعلق چھان پھٹک کی - اسی اصول کے پیش نظر علامہ ابن خلدون نے امام مہدی کے متعلق کہی گئی احادیث کو پرکھا اور ان میں سے ہر ایک کو ناقص پایا -

"پس یہی وہ سب احادیث ہیں جن کو آئمہ حدیث مہدی آخر الزمان کے بارے میں لائے ہیں - آپ دیکھ چکے کہ ان روایات میں مشکل ہی سے کوئی روایت سقم سے خالی ہے -"[۲]

۱- مقدمہ ابن خلدون ص ۱۵۹

۲- ایضاً ص ۳۱۸-۳۱۹

علامہ اقبال بھی اس سلسلے میں ابن خلدون سے متفق ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ مسلسل انتظار کا یہ نظریہ مجوسیت کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنے خطبے اسلامی ثقافت کی روح میں لکھتے ہیں۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ امید اور توقع مجوسی تہذیب و ثقافت کی ایک مستقل روش ہے یعنی زرتشت کے نوزائیدہ بیٹوں کے ظہور کا انتظار، خواہ کوئی مسیح ہو یا انجیل چہارم کا فارقلیط۔ لیکن جو طالب علم یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ اسلام کے اصول خاتمیت کے معنی تہذیب و ثقافت کے لئے کیا ہیں تو اس کو چاہیے اس سمت کا رخ کرے جس کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ اصول مسلسل انتظار کی اس مجوسی روشن کے خلاف جس سے تاریخ کا ایک غلط نظریہ قائم ہو جاتا ہے ایک نفسیاتی روک بھی ہے۔ دراصل ابن خلدون نے تاریخ کا جو نظریہ قائم کیا وہ اس کی حقیقی روح کو خوب سمجھ گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اس نوع کے ایک اسلامی عقیدے کی تنقید سے جس نے مسلمانوں میں گویا مجوسی خیالات کے زیر اثر سر اٹھایا تھا ہمیشہ کے لئے ثابت کر دیا کہ اور نہیں تو کم از کم ان نتائج ہی کے اعتبار سے جو بلحاظ نفسیات اس سے مرتب ہوتے ہیں اسلام میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔''[1]

مہدویت کے انتظار میں ایک نفسیاتی خطرہ پوشیدہ ہے کہ اس سے عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور لوگ اس بات پر تکیہ کر کے بیٹھے رہتے ہیں کہ آخر کار ان کی مشکلات کا مداوا ہو جائے گا اور ایک شخص آ کر انہیں مصائب سے نجات دلائے گا اور اسلام کا بول بالا کرے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ خود جب تک ہاتھ پاؤں نہیں ماریں گے ان کی تقدیر نہیں بدل سکتی اور یوں مہدویت کا تصور عمل کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوتا ہے جو اسلامی تہذیب کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ علامہ اقبال اور ابن خلدون دونوں نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا تھا اور اس کے سدباب کی کوشش کی تھی۔ وہ دونوں زمانہ کو ایک مسلسل حرکت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک عمل اور قوت ہی کسی قوم کو عروج کی

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۲۱-۲۲۲

منازل سے آشنا کر سکتے ہیں ۔ علامہ اقبال اپنے اسی خطبہ میں ابن خلدون کے نظریہ تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں ۔

''اس امر کا ایک نہایت گہرا احساس کہ زمانہ ایک حقیقت ہے اور زندگی کا یہ تصور کہ وہ عبارت ہے ایک مسلسل اور مستقل حرکت سے زمانے کا یہی تصور ہے جو ابن خلدون کے نظریہ تاریخ میں ہماری دلچسپی کا خاص مرکز بن جاتا ہے اور اس لئے فلنٹ بجا طور پر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے ۔ وہ کہتا ہے افلاطون ہو یا ارسطو یا آگسٹائن ، ان میں کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے ۔ رہے دوسرے تو ان کا ذکر ہی کیا ہے ، ان کا تو اس کے ساتھ نام بھی نہیں لیا جا سکتا لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہمیں ابن خلدون کی بداعت فکر سے انکار ہے ۔ ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن نے اپنے اظہار کے لئے جو راستہ اختیار کیا اس پر نظر رکھیے تو یہ کسی مسلمان ہی کا کام ہو سکتا تھا کہ تاریخ کا تصور بطور ایک مسلسل اور مجموعی حرکت کے کرتا یعنی زماناً ایک ایسے نشو و نما کی حیثیت سے جس کا ظہور ناگزیر ہے ۔ گویا ہمیں ابن خلدون کے نظریۂ تاریخ سے دلچسپی ہے تو اس کی وجہ بھی ابن خلدون کا وہ تصور ہے جو اس نے تعبیر کے باب میں قائم کیا ۔ یہ تصور بڑا اہم ہے ۔ کیونکہ اس کے معنی یہ نہیں کہ تاریخ چونکہ ایک مسلسل حرکت ہے زمانے کے اندر ، لہذا یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اس کی نوعیت فی الواقع تخلیقی ہے ۔ بہ الفاظ دیگر یہ وہ حرکت نہیں جس کا راستہ پہلے سے متعین ہو ۔ اب اگرچہ ابن خلدون کو مابعدالطبیعات سے مطلق دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ در حقیقت اس کا مخالف تھا ۔ با ایں ہم اس نے زمانے کا تصور جس رنگ میں پیش کیا ہم اس کے پیش نظر اس کا شمار برگساں کے پیشروؤں میں کریں گے ۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اس تصور کے ذہنی سوابق کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں ۔ قرآن مجید کا یہ اشارہ کہ اختلاف لیل و نہار کو حقیقت مطلقہ کی جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے ایک آیت تصور کرنا چاہیے ، اسلامی مابعدالطبیعات کا یہ رحجان کہ زمانہ خارجی حقیقت ہے ، ابن مسکویہ کا یہ نظریہ کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے ، آخرالامر بیرونی کا یہ صاف و صریح اور واضح اقدام کہ کائنات کا تصور بطور ایک تکوین

کے کرے ، یہ سب باتیں ابن خلدون کو ذہناً ورثے میں ملیں ۔ لہذا اس کا سب سے بڑا کارنامہ بھی یہ ہے کہ وہ اس تہذیب و تمدن کی روح کو خوب سمجھ گیا تھا جس کا وہ خود سب سے زیادہ روشن اور تاب ناک مظہر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اس کی ترجمانی بھی بڑی باقاعدہ اور مرتب شکل میں کی چنانچہ یہ اسی کی ذہانت اور فطانت تھی کہ قرآن مجید کی روح جو سر تا سر یونانیت کے منافی ہے حکمت یونان پر ہمیشہ کے لئے غالب آ گئی ۔''[۱]

علامہ اقبال نے اپنے اس بیان میں لکھا ہے کہ ابن خلدون مابعدالطبیعات کا مخالف تھا ۔ مقدمہ کا چھٹا باب علم کے متعلق ہے ۔ اس کی اکیسویں فصل کا عنوان الٰہیات ہے اسی کا دوسرا نام ابن خلدون نے مابعدالطبیعات یا ماورالطبیہ رکھا ہے ۔ ابن خلدون کے خیالات کی وضاحت کے لئے ہم وہاں سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں ۔

''علم الٰہی میں وجود مطلق سے بحث ہوتی ہے اور جسمانیات اور روحانیات کے امور عامہ مثلاً ماہیات ، وحدت ، کثرت ، وجوب ، امکان وغیرہ پر تفصیلی کام کیا جاتا ہے ۔ مبادی موجودات روحانیات اور ان سے صدور موجودات کی کیفیت بھی زیر بیان آتی ہے ۔ ہر نفس کے وہ حالات بھی بحث میں آتے ہیں جو اس کو بعد مفارقت جسم پیش آتے ہیں ۔ فلاسفہ کی نظر میں اس علم کی بہت وقعت ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ موجودات کا صحیح اور نفس الامری علم بخشتا ہے اور اس کا حصول عین سعادت اور نیک بختی ہے اس خیال کی ہم تردید کریں گے علوم کی ترتیب میں علم الٰہی کا مرتبہ طبیعات میں دوسرا ہے اسی لئے اس کا نام ماورالطبیہ رکھتے ہیں ۔''[۲]

دراصل علامہ ابن خلدون کو فلسفہ سے بیر ہے جیسا کہ آگے چل کر انہوں نے اسی فصل میں ظاہر کیا ہے اور باب ششم کی فصل ۲۵ کا تو عنوان ہی یہ رکھا ہے ''علم فلسفہ کی خرابیاں اور ان کا بطلان'' مگر علامہ ابن خلدون فلسفہ کو بُرا سمجھنے کے باوجود اس کو بالکل

۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۶—۲۱۷

۲۔ ایضاً ص ۴۶۷

ہی رد نہیں کرتے ۔ ان کے خیال میں اگر کوئی شخص شرعی امور پر عبور حاصل کر لے تو پھر اس کا فلسفیانہ امور کی طرف رجوع جائز ہے کیونکہ اس صورت میں وہ فلسفہ کے نقصانات سے اپنے دامن کو بچا سکتا ہے چنانچہ علامہ اقبال ان کے نظریہ پر پورے اترتے ہیں کہ انہوں نے فلسفہ کو دین کی حفاظت کے لئے استعمال کیا ۔ ابن خلدون لکھتے ہیں ۔

" ۔ ۔ ۔ لیکن علوم فلسفہ کا مطالعہ کرنے والا ان کے نقصانات اور مضار سے اپنا دامن ضرور بالضرور بچائے رکھے بلکہ ہمارا تو ہمدردانہ مشورہ یہ ہے کہ فلسفہ کو اسی وقت چھوئے کہ وہ علوم شرعیہ کا ماہر ہو چکا ہو اور تفسیر و فقہ پر اس کو پورا پورا عبور ہو ورنہ اگر کوئی علوم دینیہ سے کورا ہو کر فلسفہ میں لگ پڑے تو وہ اس کے خطرہ سے مشکل سے اپنا دامن بچا سکتا ہے ۔"[۱]

علامہ ابن خلدون علامہ اقبال کی طرح عقل کی اہمیت کے قائل ہونے کے باوجود اس کو سب کچھ سمجھ لینے کو درست نہیں سمجھتے ۔ ان کے خیال میں "عقل اول ہی کو منزل آخر بنا کر ٹھہر جانا سرا سر کوتاہ فہمی ہے ۔"[۲]

کیونکہ عقل ایک حد تک ہی ہماری مددگار ہوتی ہے مگر اس کے بعد وہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی ۔ علامہ ابن خلدون نے عقل کو ایک ترازو قرار دیا ہے جو بعض چیزوں کو تول سکتا ہے مگر بعض اشیا جسامت میں بڑی ہونے کے سبب اس کے اندر رکھی ہی نہیں جا سکتیں وہ فرماتے ہیں ۔

"پھر عقل کی طاقت کی کوتاہی عقل کی ذات پر حرف نہیں لاتی ۔ عقل تو بمنزلہ ایک ٹھیک ترازو کے سمجھ لیجیے جو اپنا کام صحیح صحیح انجام دیتی ہے لیکن اگر آپ چاہیں کہ اسی عقل کے ترازو سے امور توحید و آخرت ، حقیقت نبوت اور حقائق صفات الٰہی تولنے اور جانچنے لگیں تو یہ ایک محال طمع ہے اور خیال خام ۔ اس کی بالکل مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے کانٹے سے سونا تلتے دیکھا تو لگا اس خیال میں کہ چلو اس سے پہاڑ بھی تولیں تو کیا اس کا یہ خیال عقل کے دائرہ میں ہے ۔ کانٹا

۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۵۰۴

۲۔ ایضاً ص ۵۰۱

تو بہر حال اپنا کام کر سکتا ہے مگر اپنی طاقت کے اندر اندر اسی طرح عقل بھی اپنی قوت کے دائرہ کے اندر ٹھیک ٹھیک کام دیتی ہے ۔"[۱]

یہی خیال علامہ اقبال کا بھی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل چراغ راہ تو ہے مگر منزل نہیں ہے ۔ وہ ایک حد تک ہی ہماری رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتی ہے ۔ ان کے اس خیال کی وضاحت کے لئے یہ شعر ملاحظہ ہوں ۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے ، منزل نہیں ہے ![۲]

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے ؟ چراغ رہگزر ہے[۳]
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغ رہگزر کو کیا خبر ہے !

مگر عقل سے آگے کی منزل علامہ اقبال نے عشق کو قرار دیا ہے تو ابن خلدون اسے کشف کہتے ہیں ۔ ابن خلدون کے ہاں عشق کا ذکر نہیں ملتا جبکہ علامہ اقبال نے عشق کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے بلکہ ان کی ساری شاعری اسی کے گرد گھومتی ہے ۔ اس کے باوجود دونوں کا نقطۂ نظر ایک ہے ۔ دونوں نے کشف اور عشق کو اسلاف کے ہاں پایا ہے ۔ ابن خلدون بھی علامہ کے اس شعر کے ہم خیال ہیں ۔

عطا اسلاف کا جذب دروں کر ! شریک زمرۂ ، لا یحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر ![۴]

ابن خلدون شاید جنوں کے لفظ کو پسند نہ کرتے لیکن علامہ نے یہاں جنون سے مراد عشق لیا ہے اور عشق کی وہ تعریف جو علامہ اقبال نے کی ہے وہ ابن خلدون کو بھی یقیناً پسند آتی ۔

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق[۵]

۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۰
۲۔ کلیات اقبال (اردو) ص ۳۷۶
۳۔ ایضاً ص ۳۷۷ ۴ ، ۵۔ ایضاً ص ۳۷۹

کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش کبھی عریاں و بے تیغ وسناں عشق!
کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرور انجمن عشق!
کبھی سرمایۂ محراب و منبر کبھی مولا علی خیبر شکن عشق!!

علامہ اقبال عشق کے ذریعے خودی کی تعمیر کرتے ہیں اور خودی کو بلند کر کے انسان خدا کا نائب بن جاتا ہے جو عناصر پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا ہاتھ خدا کے ہاتھ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ علامہ ابن خلدون بھی صاحب کشف لوگوں میں ایسی ہی صفات دیکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''اس کشف کا راز دراصل یہ ہے کہ روح جب حس ظاہر کو چھوڑ کر حس باطن کی طرف رجوع کرتی ہے تو ظاہر حس کمزور پڑ جاتی اور روح قوت پکڑ جاتی ہے اور روح میں جان سی پڑ کر اس کی قوت دوبالا ہو جاتی ہے۔ جب اس میں بیداری آتی ہے تو وہ ذکر و شغل میں مدد دیتی ہے کیونکہ پھر بھی ذکر اس کے لیے غذا کا کام دیتا ہے جس سے اس کا نشو و نما ہوتا ہے اور وہ روز بڑھتی اور پلتی رہتی ہے تاآنکہ وہ درجہ نصیب ہوتا ہے کہ علم شہود کے درجہ میں آ جاتا ہے جو کچھ پہلے جانا جاتا تھا وہ اب نظر آنے لگتا ہے جس سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور نفس مکمل ہو کر عین ادراک بن جاتا ہے۔ مذاہب ربانیہ اور علوم الدینیہ اور مدنت الٰہی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس وقت نفس عالم بالا و عالم ملائک میں پہنچ کر ذات الٰہی کی طرف قدم بڑھانے لگتا ہے چنانچہ اس طرح کا کشف صوفیا کو مجاہدہ اور مراقبہ سے اکثر و پیشتر حاصل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ عالم وجود کے ان حقائق تک رسائی پا لیتے ہیں جن کا پتہ دوسروں کو نہیں لگ سکتا اور قبل از وقوع واقعات کا پتہ چلا لیتے ہیں اور اپنے نفوس کی طاقت اور ہمت کے مطابق موجودات سفلیہ میں تصرف کرنے لگتے ہیں مگر اولیائے کرام اس قسم کے کشف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور وہ تصرف فی الموجودات

۱۔ کلیات اقبال (اردو) ص ۳۷۹

سے بھی دشت کش رہتے ہیں اور جب تک ذات باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو اشارہ نہ مل جائے کسی چیز کی حقیقت کے بارے میں زبان نہیں کھولتے ۔"[۱]

علامہ ابن خلدون نے کشف کو تنقید کا موضوع بنایا ہے اور اس کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ یہ نفسیاتی نکتہ سمجھتے ہیں کہ انسان ریاضت اور مشاہدہ سے اپنے اندر بڑی قوت پیدا کر لیتا ہے ۔ یہ قوت ہر شخص حاصل کر سکتا ہے ۔مگر مرد مومن وہ ہے جو اس کو اچھائی اور نیکی کے لئے استعمال میں لائے چنانچہ وہ سحر اور معجزہ کا فرق بیان کرتے ہوئے رقم طرز ہیں ۔

"یہ بھی واضح رہے کہ کشف اسی وقت صحیح اور کامل متصور ہوتا ہے کہ وہ استقامت سے پیدا ہو ورنہ یوں تو بھوک اور خلوت سے بھی کشف ہو جاتا ہے جیسے کہ ساحر اور نصاریٰ مرتاض کہ اس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ۔"[۲]

آگے چل کر وہ اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں ۔

"معجزہ ایسے مقدس اشخاص سے صادر ہوتا ہے جن کے نفوس خیرو بھلائی سے متصف ہوں ، جو صاحب خیر و نفع اور جن کے مقاصد خیر سگالی اور خیر اندیشی پر مبنی ہوتے ہیں اور دعویٰ نبوت کے ثبوت میں وہ معجزہ کو کام میں لاتے ہیں ۔ سحر اس کے برخلاف ہوتا ہے کہ وہ بد انسان سے سرزد ہوتا ہے اور اکثر بدی کے کاموں میں کام آتا ہے"[۳]

علامہ اقبال نے ابن خلدون کو اس بات پر خراج تحسین پیش کیا ہے کہ انہوں نے صوفیانہ واردات کو تحلیل و تجزیہ کا موضوع بنایا ہے ۔ وہ اپنے پانچویں خطبے میں کہتے ہیں ۔

"لہذا مسلمانوں کو چاہیے کہ صوفیانہ واردات کی خواہ ان کی حیثیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں جیسے اپنی دوسری واردات اور اس لئے ان کا مطالعہ بھی

۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۸

۲۔ ایضاً ص ۴۴۹ ۳۔ ایضاً ص ۴۷۲

تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں ۔ آنحضرت صلعم کا طرز عمل بھی یہی تھا چنانچہ ابن صیاد کے احوال نفسی کو دیکھتے ہوئے آپ نے جو روش اختیار کی وہ اس کا بین ثبوت ہے ۔ اسلامی تصوف بھی دراصل صوفیانہ مشاہدات کے نظم و ارتباط کی ایک کوشش ہے گو یہ صرف ابن خلدون تھا جس نے اس سلسلے میں علمی نہج پر قدم اٹھایا،،[۱]

علامہ اقبال پہلے خطبے میں بھی ابن صیاد کا ذکر کرتے ہوئے ابن خلدون کو یوں داد دیتے ہیں ۔

''یہ ابن خلدون تھا جس نے عالم اسلام میں سب سے پہلے یہ سمجھا کہ حضور صلعم کے اس طرز عمل کے معنی فی الحقیقت کیا ہیں اور پھر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے بڑی حد تک وہ مفروضہ قائم کر لیا جس کو آج کل نفوس تحت الشعور سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ پروفیسر میکڈانلڈ لکھتے ہیں ابن خلدون کے بعض نفسیاتی افکار بڑے دلچسپ ہیں ۔ وہ اگر آج زندہ ہوتا تو مسٹر ولیم جیمز کی کتاب ''مشاہدات مذہب،،[۲] کی گونا گونی کو بہ نظر استحسان دیکھتا ۔ جدید نفسیات نے حال ہی میں محسوس کیا ہے کہ شعور ولایت کے مشمولات کا بغور جائزہ نہایت ضروری ہے ۔ بایں ہمہ ایسا کوئی موثر علمی منہاج ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا جس کے تحت ہم ان مشمولات کا تجزیہ کر سکیں جن کا تعلق شعور کے ورائے عقل تعینات سے ہے''[۳]

اور حسین بن منصور حلاج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

''حلاج کا گزر جن احوال سے ہوا ان میں ابتدآ تو اگرچہ کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جسے غیر طبعی کہا جائے لیکن جب یہی احوال پختگی کو پہنچ جائیں تو خیال ہونے لگتا ہے کہ ہمارے شعور کے بعض مراتب ایسے بھی ہیں جن سے ہم قطعی بے خبر ہیں ۔ ابن خلدون نے مدت ہوئی محسوس کر لیا تھا کہ ان مراتب کی تحقیق کے لئے کسی ایسے منہاج علم کی ضرورت ہے جو فی الواقع موثر ہو ۔ جدید نفسیات کو بھی اگرچہ اس قسم

۱- تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ص ۱۹۵—۱۹۶

۲- Variety of Religious Experiences ۔

۳- تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ص ۲۵—۲۶

کے منہاج کی ضرورت کا اعتراف ہے لیکن اس کا قدم بھی اس اکتشاف سے آگے نہیں بڑھا کہ صوفیانہ مراتب شعور کی خصوصیات کیا ہیں ۔ حاصل کلام یہ کہ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے اس قسم کے احوال اور مشاہدات کی تحقیق عملی پہنچ پر کی جائے''[1]

علامہ ابن خلدون نے حلاج کے اناالحق کو ابتدا کی حالت کہا ہے ان کے نزدیک صوفیا پر ایک حالت جمع طاری ہوتی ہے جب وہ ہر چیز کو خدا کے مقابلے میں غائب سمجھتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر وہ حالت تفریق پر آتے ہیں جب سب چیزیں اپنا وجود الگ الگ برقرار رکھتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ اس طرح انہوں نے حضرت مجددالف ثانی کی طرح وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا ہے مگر انہوں نے وحدت الشہود کی اصطلاح استعمال نہیں کی لیکن ستاروں والی مثال سے اپنی بات کی وضاحت امام ربانی ہی کی طرح کی ہے ۔

''اس کی مثال نائم سونے والے سے دیتے ہیں کہ جب وہ سو جاتا ہے تو اس کے حواس معطل ہو جاتے ہیں ۔ ان کے تعطل سے سارے محسوسات مع تفصیل اس کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں ۔ ہاں جب خیال بروئے کار آتا ہے تو محسوسات میں پھر تفصیل پیدا کر لیتا ہے اب جاگنے پر مدرکات پھر بحال ہو جاتے ہیں تو محسوسات مع تفصیل پھر لوٹ آتے ہیں یہی معنی صوفیا کے اس قول کے ہیں کہ موجودات و ہمیہ اور موہوم ہیں ۔ غرض ابن دہقان کے کلام کا جو کچھ خلاصہ ہے وہ یہی ہے لیکن ہمارے نزدیک ابن دہقان کا تخیل عقل و قیاس سے گرا ہوا ہے اس لئے کہ ہم سفر میں ایک شہر کو چھوڑ جاتے ہیں اور وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے مگر پھر بھی ہم کو اس کے وجود پر یقین کامل ہوتا ہے اس طرح آسمان یا ستارے یا اشیا جو ہم سے غائب ہیں ہم کو ان کے وجود کا یقین ہے تو پھر اس کا نظریہ کہاں صحیح رہا ۔ قطع نظر اس کے متاخرین صوفیا میں سے محققین اس کے قائل ہیں کہ سالک اپنے مقامات سے ایک مقام جمع پر بھی پہنچتا ہے وہاں پہنچ کر اس کو وحدت مطلقہ کا خیال پیدا ہوتا ہے پھر یہاں سے ترقی کر کے آگے بڑھتا ہے تو مقام فرق

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۴۴—۱۴۵

پر پہنچتا ہے جہاں وہ موجودات میں تمیز کرتا ہے اور عارف محقق کا یہی مقام ہے پھر ہر مرید کو مقام جمع پر ضرور پہنچتا ہوتا ہے اور یہ اس کے لئے سخت گھاٹی ہے کیونکہ اکثر و بیشتر تو وہیں ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں اور آگے بڑھنے کی ان میں توفیق نہیں ہوتی کہ عرفان حقیقی کا درجہ پائیں اور یہ اس مقام میں وحدت مطلقہ کے سمندر میں غواصی کرتے رہتے ہیں۔"[1]

ابن خلدون کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ وہ بات جو شیخ احمد سرہندی حضرت مجددالف ثانی کے فلسفہ کی بنیاد ہے انہوں نے اسے ان سے بہت پہلے بیان کر دیا تھا۔ بعد میں حضرت مجددالف ثانی نے انہیں خیالات کو زیادہ تفصیل اور شرح سے بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال اس سلسلے میں ابن خلدون اور امام ربانی سے متفق ہیں اور حالت جمع کی بجائے حالت تفویق کے قائل ہیں۔

علامہ ابن خلدون کے نزدیک حکمران کو خلیفہ یا امام کہا جا سکتا ہے اس کے لئے انہوں نے چار شرطیں ضروری قرار دی ہیں یعنی علم عدالت، کفایت اور سلامتی حواس و اعضا۔ وہ امام کے لئے قریشی النسب ہونا ضروری خیال نہیں کرتے"[2]

اس طرح مختلف ممالک میں خلافتیں قائم ہو سکتی ہیں مگر ان سب کا ایک ہی مرکز کی طرف رحجان ہو گا کیونکہ سب کی بنیاد اسلام ہی ہو گا۔ ترکوں نے ابن خلدون کے اسی نظریہ کے تحت مرکزی خلافت سے انکار کیا تھا۔ علامہ اقبال نے ابن خلدون کے اس نظریہ کو اپنے خطبے الاجتہاد فی الاسلام میں موضوع بحث بنایا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''بہر حال ترکی نقطہ نظر کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے ہمیں ابن خلدون یعنی عالم اسلام کے سب سے پہلے فلسفی مورخ سے رجوع کرنا چاہیے۔ ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''مقدمہ'' میں خلافت اسلامیہ کے تین نظریے قائم کئے ہیں:

۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۶۵۰

۲۔ ایضاً ص ۱۹۸

(الف) یہ کہ خلافت ایک امر شرعی ہے لہذا اس کا قیام واجب ہے۔

(ب) یہ کہ اس کا تعلق ضرورت اور مصلحت سے ہے۔

(ج) یہ کہ اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔

آخری نظریہ خوارج کا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جدید ترکی کا رجحان دوسرے نظریے کی طرف ہے یعنی وہ اس معاملے میں معتزلہ کے ہم خیال ہیں جن کی رائے یہ تھی کہ عالمگیر خلافت کا تعلق صرف ضرورت اور مصلحت وقت سے ہے۔۔۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ قاضی ابوبکر باقلانی نے جب اپنے زمانے کے احوال و ظروف کو دیکھا تو خلیفہ کے لیے قرشیت کی شرط ضروری نہیں ٹھہرائی ؟ باقلانی کہتا ہے قریش کے ہاتھ میں اب کوئی طاقت نہیں لہذا بجز اس کے چارہ کار نہیں کہ جہاں کہیں جس کسی کو طاقت حاصل ہے وہاں اسی کو امام تسلیم کر لیا جائے۔ بعینہ ابن خلدون نے بھی واقعات کی منطق سے لاجواب ہو کر کچھ ایسا ہی نظریہ قائم کیا جسے بین الاقوامی اسلام کا گو ایک دھندلا سا مگر پہلا تصور ٹھہرانا چاہیے اور جواب ایک حقیقت بنتا نظر آ رہا ہے۔"

باقلانی کے حوالے سے علامہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ ابن خلدون سے ہی لیا ہے۔ ابن خلدون نے خلیفہ کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اسے عوام کی حمایت حاصل ہو لہذا اس نے جمہوریت کے لئے بھی سنگ بنیاد رکھ دیا تھا۔ علامہ اقبال بھی اس نظریہ سے اتفاق کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے خلیفہ کے لئے جو دوسری شرائط بیان کی ہیں علامہ اقبال کو ان سے بھی اتفاق ہے اور یہ تمام خصوصیات ان کے مرد مومن میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ابن خلدون نے حکمران کے لئے شجاع اور بہادر ہونا بھی لازمی قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمت اور دلیری کے بغیر کاروبار خسروی چلایا ہی نہیں جا سکتا۔ علامہ اقبال نے اس شعر میں ان خصوصیات کا ذکر بطور خاص کیا ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا[1]

۱- کلیات اقبال (اردو) ص ۲۷۰

بہادری اور سخت کوشی قوموں کی ترقی کا باعث ہے جہاں ان میں عیاشی اور آرام پسندی پیدا ہوئی وہ زوال کا شکار ہو گئیں :

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر[۱]

یہ شعر ابن خلدون کے افکار کا عکاس ہے ۔ ابن خلدون کے مقدمہ سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو ۔

''بدویت شجاعت کا سبب ہے ۔ اس حقیقت کے بموجب وحشی اقوام شجاعت و بہادری کی دہنی ہوتی ہیں اور ان میں زبردست غلبہ کی طاقت ہوتی ہے جس کے ذریعے جب چاہتی ہیں غیر اقوام سے اقتدار کی باگ چھین لیتی ہیں بلکہ ان میں بھی مرور و ایام سے فرق آتا رہتا ہے ۔ جب کبھی یہ سر سبز و شاداب مقامات میں جا بستے ہیں اور ناز و نعمت میں دن گزارنے لگتے ہیں تو تبدیلی مقام سے جس قدر ان کی وحشت میں کمی آتی ہے اسی قدر ان کی شجاعت گھٹتی ہے اور بدویت میں کمی آتی ہے ۔ ۔ ۔ یہی حال عرب کے تمام قبائل کا رہا ہے کہ وہ جس قدر ناز و نعمت اور عیش و عشرت سے قریب تر ہوگئے اسی قدر دوسروں سے ہٹتے چلے گئے''[۲]

ابن خلدون نے یہ بھی بتایا ہے کہ عیش و عشرت کے لوازمات میں گانا یعنی طاؤس و رباب بھی شامل ہے جب کوئی ملک انتہائی ترقی کے بعد تنزل کی طرف رخ کرتا ہے تو اس وقت اس کو فروغ حاصل ہوتا ہے[۳] اس طرح عیش پرستی کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہاتھ سے کام نہ کیا جائے اور کام کرنے کے لئے ملازم رکھ لئے جائیں یوں اپنا بوجھ دوسروں پر ڈال کر انسان عاجز اور کمزور ہو جاتا ہے[۴] اور کمزوری اس کو دوسروں کا دست نگر ہی نہیں بناتی بلکہ ایک دن آتا ہے کہ غلامی کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیتی ہے ۔ غلامی میں قوموں کی ہمت پست ہو جاتی ہے ۔ ابن خلدون نے ایک عجیب بات یہ لکھی ہے

۱- کلیات اقبال (اردو) ص ۴۴۴
۲- مقدمہ ابن خلدون ص ۱۳۵-۱۳۶
۳- ایضاً ص ۴۱۳
۴- ایضاً ص ۲۷۶

کہ جب لوگوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں تو توالد و تناسل کا سلسلہ بھی کم ہو جاتا ہے اور یہ بھی غلامی کی نشانیوں میں سے ہے[1]۔ غلامی کو پیدا کرنے میں شخصی حکومت کا بھی بڑا دخل ہے۔ جب تک سب مل کر حکومت کو قائم رکھنے میں کوشش کرتے ہیں وہ قائم رہتی ہے مگر جب کوئی آمر ظلم کرنے لگتا ہے تو لوگ اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور یوں وہ قوم غلامی کے گڑھے میں جا گرتی ہے[2]۔ غلامی کو علامہ اقبال بھی پسند نہیں کرتے اور ان تمام چیزوں سے بھی نفرت کرتے ہیں جو غلامی کو پیدا کرتی ہیں یا غلامی کی پیدا کردہ ہیں۔

اے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل
سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام[3]

نے نصیب مارو کژدم نے نصیب دام و دو
ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگ ابد![4]

بدن غلام کا سوز عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام![5]

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش[6]

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حر کے لئے جہاں میں فراغ![7]

۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۱۵۵
۲۔ ایضاً ص ۱۷۴
۳۔ کلیات اقبال (اردو) ص ۶۷۷
۴۔ ایضاً ص ۶۶۲
۵۔ ایضاً ص ۶۲۱
۶۔ ایضاً ص ۵۰۵
۷۔ ایضاً ص ۵۴۷

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر[۱]

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا![۲]

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کو آنکھ ہے بینا![۳]

چنانچہ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اسلام کے دو عظیم سپوت ایک دوسرے سے کتنی مماثلت رکھتے ہیں مگر ایک دوسرے کا چربہ نہیں ہے۔

۱- کلیات اقبال (اردو) ص ۸۷۸
۲- ایضاً ص ۳۱۶
۳- ایضاً ص ۳۱۶

کچھ یادیں

سلطان مقصود

کبھی کبھار جب ذہن زیادہ زنگ آلود ہو جاتا ہے تو اسے صیقل کرانے کے لیے حضور مرزا منور میں چلا جاتا ہوں۔ وہاں غالب ، بیدل ، علامہ کے علاوہ ہندو ازم ، پاکستان اور اسلام پر سیر حاصل گفتگو ہو جاتی ہے یا بقول مرزا صاحب پینتالیس منٹ کا پیریڈ ہو جاتا ہے۔

دقت یہ ہے کہ موصوف آج کل دو کشتیوں کے کھیون ہار ہیں ''غرقاب محبت کا اللہ نگہبان ہو''۔ انہیں ملنا ہو تو اتنے بجے سے اتنے بجے تک یہاں ہوتے ہیں اور پھر اتنے بجے سے اتنے بجے تک وہاں ہوتے ہیں اور اکثر ہوتے کہیں بھی نہیں۔ آپ محنت کر کے یہاں ، وہاں تک چلے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ابھی ابھی ریڈیو یا ٹیلی ویژن والے انہیں اغوا بالجبر یا بالرضا کر کے لے گئے ہیں۔

ایک دن ایک عزیز کی ضد پر بالآخر انہیں وہاں یعنی اقبال اکادمی میں ڈھونڈ ہی لیا۔ اکادمی کا دفتر اس گھر میں ہے جہاں کبھی علامہ سے مجھے شرف ملاقات ہوا تھا۔ ذکر کیا تو مرزا منور صاحب نے چند کتابیں عنایت کیں اور حکم دیا کہ اس ملاقات کی روئیداد لکھو۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جستہ جستہ جو یادیں بھی ماضی کے دھندلکے سے ابھرتی ہیں وہ لکھ دوں۔ تو سنیئے :

پہلی یاد : اس صدی کے تیسرے دہے کی بات ہے کہ مرحوم تاثیر نے ایک فرشی مشاعرے کے لیے علامہؒ سے ایرانی قالین مانگنے کے لیے مجھے اور مرحوم محمود نظامی کو بھیجا۔ اہل زبان کی تقلید میں ایسے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ قالین بچھ جاتے تھے۔ گاؤ تکیے لگ جاتے تھے۔ طشتری میں گلوریاں شعرائے کرام کو پیش ہوتی تھیں۔ کلام شمع کی روشنی میں پڑھا جاتا تھا۔ ایسے مشاعرے اکثر طرحی ہوتے تھے۔ تاثیر مرحوم

قلم برداشتہ غزلیں لکھ کر تین چار بناوٹی شعراء کے حوالے کر دیتے تھے جو عرض کیا ہے سے مقطع تک ایک ایک کر سنایا کرتے تھے اور بڑی بہادری سے جھک جھک کر اور کورنش بجا لا کر داد وصول کرتے تھے ۔ میں بھی ان ''دلاور دُرزوں'' میں سے ایک تھا اور مزید ستم یہ تھا کہ میں ہی ترنم سے مشاعرے کا اختتام کرتا تھا ۔ ہمارے ایک مرحوم دوست بلا کے سینہ زور تھے ۔ ایک ایسی ہی غزل میں شعر تھا ۔

تجھے وہم ہوا ہے مجھے کیوں اٹھا رہا ہے ۔ میری جانے سجدہ ہے یہ تیرا نقش پالین ہے ۔ اس شعر پر بہت داد ملی ۔ بعد میں ستم بالائے ستم یوں ہوتا کہ وہ اکثر ہم سے بھی اس شعر پر اپنا حق سمجھ کر داد وصول کرتے رہے ۔

یادوں کی بھول بھلیاں میں بات ذرا بڑھ گئی ہے ۔ ذکر قالین مانگنے کا تھا ۔ ان دنوں اس گھر کے آگے کشادہ دالان تھا ۔ سڑک سے گھر واضح نظر آتا تھا ۔ اب تو دور ایک کونے میں سہما ہوا اور دبکا ہوا ہے ۔ ہمیں فوراً شرف باریابی حاصل ہو گیا ۔ اس درگاہ میں کسی ''حاجب و درباں'' کی ضرورت نہ تھی ۔ طلباء کے لیے رسائی بہت پھیلی تھی ۔ مرحوم لُنگی اور بنیان پہنے حقہ پی رہے تھے ۔ قالین لپٹے ہوئے دیواروں کے ساتھ پڑے ہوئے تھے ۔ ہم نے للچائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا اور دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ چلو قالین بغیر کسی اکھاڑ بچھاڑ کے مل جائیں گے ۔ کافی دیر تک تو ہم اس ''دبدبۂ قلندری'' سے مبہوت رہے ۔ زبانیں گنگ تھیں حرف مدعا کیسے کہتے ۔ علامہؒ نے ایک دو دفعہ حقے کی گڑ گڑ کے ساتھ لانبی ہوں کی اور ہماری طرف متوجہ ہوئے ۔ مرحوم طلباء سے بے انتہا شفقت اور مروت سے پیش آتے تھے ۔ غالباً اسی بنا پر تاثیر صاحب نے حالانکہ وہ خود ''بیباک زبان و بیان'' کے مالک تھے ۔ ہمیں قالین مانگنے کے لیے بھیجا تھا ۔ اب پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ ان کی عظمت کے جلال و جمال سے آگاہ تھے ان کی محفل میں کیوں ''نفس گم کردہ'' ہو کر رہ جاتے تھے ۔ ہماری محبت اور عقیدت اس وقت تک ان کی لازوال اور بے کراں عظمت کو محیط نہ تھی ۔ اس لیے ہم ایک گونہ گستاخی کے مرتکب ہو سکتے تھے ۔ میں تو دیوار کی تصویر بنا بیٹھا رہا ۔ نظامی مرحوم نے رُک رُک کر عرض مدعا کر ہی دی اور استدعا کو موثر بنانے کے لیے یہ اضافہ

بھی کر دیا کہ شیخ عبدالقادر مرحوم میر مشاعرہ ہوں گے ۔ ایک طویل ''ہوں'' کے ساتھ ہماری سفارت کی ناکامی کا فیصلہ سنا دیا گیا ۔ ہم دونوں کو اس انکار سے ایک انجانی سی تسکین ہوئی ۔ کیا یہ خنک بختی کم تھی کہ یوں شرف ملاقات تو نصیب ہوا ۔ دامن جھاڑ کے خوش و خرم واپس آ گئے ۔ تاثیر صاحب کو اس انکار پر نہ کوئی اچنبا ہوا اور نہ دُکھ ۔

شیخ عبدالقادر مرحوم ادبی اور ثقافتی محفلوں کی صدارت بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر لیا کرتے تھے ۔ نظامی مرحوم تھوڑے سے شرارتی بھی تھے ۔ جب صدارت زیر غور آئی تو شک گزرا کہ شیخ صاحب مصروفیت کی وجہ سے کہیں انکار نہ کر دیں ۔ نظامی نے کہا یہ ناممکن ہے ۔ وہ تو یاروں کی توقع میں دعوت پر ہی گردن آگے کر دیتے ہیں ۔

مشاعرہ ہوا ۔ صدر اور شعرائے کرام قالینوں پر تکیوں کے سہارے براجمان تھے ۔ طارق مرحوم شمع بردار تھے ۔ گلوریاں پیش ہوئیں ۔ شعراء نے شمع کی مدہم روشنی میں ۔ پیکدانوں کو اکثر استعمال کرنے کے بعد مطلع سے مقطع تک ۔ ''سبحان اللہ'' ۔ ''مکرر ارشاد'' پر بار بار داد وصول کی ۔ نمایاں داد شیخ صاحب مرحوم کی تھی جو اظہار تحسین کے لیے ہاتھ بھی بلند کرتے تھے اور شعر دہراتے تھے ۔ ابتدا میں نے ترنم سے اسی مستعار غزل سے کی اور خوب داد وصول کی ۔ یہ تھی اس دور کے لاہور کی ایک جھلک جو اب ''زندہ باد'' اور ''مردہ باد'' کے نعروں میں کھو گیا ہے ۔

دوسری یاد : ایس ۔ پی ۔ ایس کے ہال جس کی موجودہ حالت پر کسی ادارے کا بے رحمی میں چالان ہونا چاہیے ، گاہے بگاہے مشاعروں اور جلسوں کے لیے چنا جاتا تھا ۔ علامہؒ ایک مشاعرے کے صدر تھے ۔ ڈھیلی ڈھالی سفید پگڑی کھلے گلے کا لانبا کوٹ سفید شلوار اور سیاہ گرگابی لباس میں شامل تھے ۔ غالباً ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء کا درمیانی دور تھا ۔ دھندلی سی یاد باقی ہے ۔ فرمایا میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ شاموں کو باہر آؤں لیکن منتظمین کے اصرار پر آنا پڑا ۔ مشاعرہ لاہور کے روایتی ہنگامہ پرور اسلوب کے برعکس وہ نہایت مہذبانہ طور پر ختم ہوا ۔ اصرار ہوا کہ علامہ بھی کچھ عطا فرمائیں ۔ ارشاد ہوا :

بآ دے نرسیدی خدا چہ لے جوئی
زخود گریختہ آشناچہ مے جوئی
دو قطرہ خون دل است آنچہ مشک می نامد
تو اے غزال حرم در ختطہ چہ مے جوئی

اب جب بھی اس خستہ و ریختہ عمارت کے قریب سے گزرتا ہوں تو یہ یاد لپک کر ذہن اور روح کو سیراب و سرشار کر دیتی ہے۔

تیسری یاد: اکبری دروازہ کے باہر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء کے درمیانی دور میں مسلم لیگ کا جلسہ تھا۔ علامہؒ صدر تھے۔ ڈھیلی ڈھالی سفید پگڑی۔ سفید ہی شلوار اور قمیض۔ کھلے گلے کا لانبا کوٹ اور کالی گرگابی۔ ڈائس پر مجھے واضح طور پر سید امجد علی اپنی طرہ دار پگڑی ور خوبصورت جوانی کی وجہ سے یاد ہیں۔ غالباً راجہ غضنفر علی مرحوم بھی طویل رنگ دار طرے اور اونچے کلاہ سے مزین موجود تھے۔ میں پنڈال میں دوستوں کے ہمراہ موجود تھا۔ تاثیر صاحب نے ڈھونڈ لیا اور اشارے سے بلایا۔ بدمزہ ہوگیا کہ شاید کوئی ایسا کام سپرد نہ کر دیں کہ باہر جانا پڑے۔ بات کچھ اور تھی۔ شومئے قسمت باز ہے نصیب علامہؒ کے پانچ چھ شعر گا کر جلسے کا اختتام کرنے کو کہا۔ پہلا شعر تھا۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستان میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

گھبرا گیا۔ علامہؒ کا کلام۔ وہ خود ہی صدر جلسہ اور اجتماع اتنا برگزیدہ۔ کیا کرتا۔ سب نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ روسٹرم کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ کہنیاں اس پر جما لیں۔ ٹانگوں کو روسٹرم کے پائیوں نے سنبھالا دیا۔ ادھ کھلی آنکھیں اشعار پر رکھیں۔ علامہؒ قریب ہی دائیں طرف کرسی پر تشریف فرما تھے۔ اشعار ترنم سے پڑھے۔ علامہؒ کی لانبی "ہوں" ایک دو دفعہ سنائی دی۔ پڑھ کر لڑکھڑاتا ہوا دوستوں کے پاس پہنچا۔ دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ پوچھا کہ کیسے رہا۔ پتہ چلا کہ بہت اچھا رہا یقین نہیں آتا تھا۔ شاید گھبراہٹ میں گلے میں غیر معمولی گھبرتا آ گئی ہو گی اب وہ تجربہ میری زندگی کا حسین اور معزز ترین کارنامہ ہے۔

چوتھی یاد : میں اور رشید طارق مرحوم جاوید منزل گئے ۔ علامہؒ آرام کرسی پر لنگی اور بنیان پہنے حقہ پی رہے تھے ۔ ہم قالین پر بیٹھ گئے کسی صاحب سے فرما رہے تھے کہ انفرادی ایغو جب اپنی صلاحیتوں اور ممکنات کو مکمل طور پر اجاگر کر لیتا ہے تو لافانی ہو جاتا ہے ۔ وہ سپر ایغو (Super Ego) میں جذب نہیں ہوتا بلکہ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی تقدیر کا معمار خود بن جاتا ہے ۔ بات پیچیدہ تھی ۔ کچھ پلے پڑی مگر زیادہ تر اوپر سے گزر گئی ۔ اکادمی کے موجودہ ناظم سے جو علامہؒ کے شیدائی ہیں ، اس کے مضمرات پر ایک لیکچر سن لیں گے ۔

پانچویں یاد : علامہؒ کے وصال کی خبر سن کر جاوید منزل پہنچا ۔ ''مومن کے لبوں پر تبسم دیکھا'' فقیر کے ''روزگار'' کے ''سر آمد'' ہونے اور دوسرے ''دانائے راز'' کے آنے یا نہ آنے کی الجھن لیے لاکھوں سوگواروں میں شامل ہو گیا ۔ اس یاد میں ایک اور واقعہ محفوظ ہے ۔ رشید طارق کے بڑے بھائی جو پریس برانچ میں ملازم تھے فرط غم سے نڈھال ہو کر پورچ میں بے سدھ ہو کر گر پڑے ، انہیں پانی پلایا ، سنبھالا دیا تو اٹھ کھڑے ہوئے ۔ جب علامہؒ کو آخری آرامگاہ کی طرف لے جا رہے تھے تو میرے بزرگ راجہ حسن اختر مرحوم نے مجھے کہا ''مقصود کیا تمہیں اس سانحے کی المناکی کا صحیح ادراک ہے ''تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کیا ہو گیا ہے''۔ کچھ یوں چاہتے تھے کہ زمین و آسمان شق ہو جائیں اور فطرت بھی اس مہیب واقعے پر نوحہ کناں نظر آئے ۔ حکیم احمد شجاع جو اپنی منفرد ذات میں ایک ادارہ بلکہ تحریک تھے ۔ بڑے ڈرامائی انداز میں ہزاروں سال کے بعد پیدا ہونے والے دیدہ ور کے وصال پر فصیح و بلیغ اردو میں یہ بتا رہے تھے کہ ''متاع عقل و دانش آج اللہ والوں کی لٹ گئی ہے'' ۔

یوں ہم نے حکیم الامت کو سطوت مغلیہ کے جلال و جمال کی مظہر اور ''خدنگ آخریں'' اورنگ زیب عالمگیر کی تعمیر کے دامن میں امت مسلمہ کے دوسرے ''هست قرآن در زبان پہلوی'' کے ''نے نواز'' کو نئے سفر پر روانہ کیا ۔ اور یہ سوچتے ہوئے لوٹے کہ :

عمر ہا بر خویش می پیچید وجود
تا یکے بے تاب جاں آید فرود

اقبال بحیثیت مفکر تعلیم

از

پروفیسر بختیار حسین صدیقی

زیر نظر کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے - ''مقاصدِ تعلیم ، طریقِ تعلیم'' ، مثالی دارالعلوم کا تصور'' اور روایت ، تغیر اور تعلیم کے بعد پانچویں باب میں اقبال کے نظریۂ تعلیم کا ابدیت ، اصولیت ، ترقی پسند تعلیم اور تعمیرِ نو کے مغربی نظریات سے مقابلہ کیا گیا ہے - چھٹے باب میں ۱۹۷۷ء میں مکہ معظمہ میں منعقد ہونے والی فرسٹ ورلڈ کانفرنس آن مسلم ایجوکیشن کو احیائے اسلام کی تحریک کے لیے ایک نیک شگون بتایا گیا ہے جس کا برصغیر پاک و ہند میں آغاز اقبال کے عالمی امن کے اس پیغام سے ہوا جو یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو ، لاہور سے نشر ہوا - ساتویں اور آخری باب میں نمو کے تصور کا کامینوس ، روسو ، پسٹالوزی اور فروبل کے تعلیمی افکار پر اثر سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد ''جسمانی اور روحانی نمو'' کی حیثیت سے اقبال کے تصور تعلیم کی وضاحت کی گئی ہے -

صفحات : ۴ + ۲۱۹ قیمت : ۳۲ روپے

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ ، لاہور

علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ رقعات

بنام پروین رقم

رفیع الدین ہاشمی

علامہ اقبال اپنے شعری مجموعوں کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں خاصے اہتمام سے کام لیتے تھے ۔ ''اسرارِ خودی'' (۱۲ ستمبر ۱۹۱۵ء) اور ''رموز بے خودی'' (۱۰ اپریل ۱۹۱۸ء) حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کی نگرانی اور اہتمام سے شائع ہوئیں ۔ ''بانگِ درا'' (ستمبر ۱۹۲۴ء) ، ''بالِ جبریل'' (جنوری ۱۹۳۵ء) اور ''ضربِ کلیم'' (جولائی ۱۹۳۶ء) کے پہلے ایڈیشنوں کے ناشر بھی علی الترتیب ممتاز علی اینڈ سنز لاہور ، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور اور کتب خانہ طلوعِ اسلام لاہور تھے ، مگر بعض تجربات کے پیش نظر انہوں نے ، بعد ازاں اپنی جملہ تصانیف کی طباعت و اشاعت کا کام لاہور کے معروف ناشر شیخ مبارک علی کے سپرد کر دیا تھا ۔ شعری مجموعوں کی کتابت بالالتزام وہ خود کراتے ، پھر کاپیوں کی تصحیح کے بعد انہیں ناشر کے سپرد کر دیتے ۔''اسرارِ خودی'' کے پہلے ایڈیشن کی کتابت منشی فضل الٰہی مرغوب رقم نے کی ، اس کے بعد اقبال نے شعری مجموعوں کی کتابت کے لیے عبدالمجید کاتب (بعد ازاں پروین رقم) کا انتخاب کیا ۔ اس وقت کاتب موصوف کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی ۔

منشی عبدالمجید کا تعلق ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ کے ایک خطاط گھرانے سے تھا ۔ ان کے والد مولوی عبدالعزیز اور دادا مولوی پیر بخش ایمن آبادی بھی معروف خوش نویس تھے ۔ عبدالمجید ۱۹۰۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی ، پھر فارسی کی بعض کتابیں پڑھیں ۔ خوشنویسی کی طرف فطری میلان دیکھ کر مولوی عبدالعزیز نے انہیں لاہور کے ایک نامور خطاطِ نستعلیق حافظ نور احمد کے سپرد کر دیا ۔

عبدالمجید خوش نویس نے اپنے فطری میلان طبع اور اپنی محنت و شوق کے سبب بہت جلد خطاطی سیکھ لی اور باقاعدہ کتابت کرنے لگے۔ انھوں نے میرزا امام ویردی (وفات : ۱۸۸۸ء) کے کتبوں اور قطعات کے تتبّع میں خطِ نستعلیق میں مہارت بہم پہنچائی۔ اپنے خاندانی اسلوبِ خط اور امام ویردی کے طرز نگارش کی آمیزش سے عبدالمجید نے ایک خاص اسلوب پیدا کیا، جسے اُس دور کے خوش نویسوں کے ہاں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق نوآموز، ان کے لکھے ہوئے اشتہار دیواروں سے اُتار لے جاتے اور انھیں سامنے رکھ کر خطاطی کی مشق کرتے۔ بقول سید انور حسین نفیس رقم: ''یہ حقیقت ہے کہ اس دور کا ہر چھوٹا بڑا خطاط، پروین رقم کے اسلوبِ نستعلیق سے کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہے''۔ اپنے دور کے اس بے مثل خطاط نے ۲ اپریل ۱۹۴۶ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ ''رموزِ بے خودی'' (طبع اول، ۱۰ اپریل ۱۹۱۸ء) علامہ اقبال کی وہ پہلی کتاب ہے، جسے پروین رقم نے کتابت کیا (اس وقت تک وہ ''پروین رقم'' نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے کتاب پر نام ''عبدالمجید'' لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ''پروین رقم'' لکھنا شروع کیا۔ ''بانگِ درا'' کے تیسرے ایڈیشن (مارچ ۱۹۳۰ء) پر پہلی بار عبدالمجید کے ساتھ ''پروین رقم'' نظر آتا ہے)۔ بعد ازاں ''پیامِ مشرق'' [مئی ۱۹۲۳ء] ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل''، ''مسافر'' (۱۹۳۴ء) اور ''ارمغانِ حجاز'' (نومبر ۱۹۳۸ء) کے پہلے ایڈیشنوں کی کتابت بھی پروین رقم نے کی، البتہ ''ضربِ کلیم''، ''زبورِ عجم'' (۱۹۲۷ء) اور ''جاوید نامہ'' (فروری ۱۹۳۲ء) کے اولین ایڈیشن بعض دوسرے خوش نویسوں کے قلم سے ہیں۔ غالباً پروین رقم کی علالت، یا ان ایام میں لاہور میں ان کی غیر موجودگی کے سبب ایسا ہوا، ورنہ علامہ اقبال کے نزدیک وہ لاہور کے سب سے بہتر کاتب تھے[1]۔ یہی

۱۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''عبدالمجید کاتب . . . میرے نزدیک لاہور میں سب سے بہتر ہے۔'' (خطوطِ اقبال بنام بیگم گرامی، ص ۱۶)۔ تاہم اقبال سے منسوب یہ قول بے بنیاد ہے کہ: ''پروین رقم میرے اشعار کی کتابت نہیں کریں گے، تو میں شاعری ترک کر دوں گا۔''
(''جنگ'' لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۸۱ء)

وجہ ہے کہ متذکرہ بالا تینوں مجموعوں کی دوسری اشاعتوں کی کتابت پروین رقم ہی سے کرائی گئی ۔ ان میں سے ''جاوید نامہ'' کی کتابت وہ مکمل نہ کر سکے ۔ طبع دوم (فروری ۱۹۴۷ء) کے دو سو صفحات ان کے قلم سے ہیں ۔ باقی صفحات غالباً ابن پروین رقم نے لکھے ۔

علامہ اقبال اپنے مجموعوں کی کتابت اپنی نگرانی میں خصوصی ہدایات کے تحت کراتے تھے ۔ ابتدا میں یہ ہدایات ناشر کے توسط سے دی جاتی تھیں[1] ۔ بعد ازاں براہِ راست خوش نویس کو ہدایات دیتے ۔ ذیل کے تین رقعات ، اقبال نے اسی سلسلے میں پروین رقم کے نام تحریر کیے ۔

یہ رقعات ''بالِ جبریل'' کے پہلے ایڈیشن کی کتابت کے موقع پر لکھے گئے ۔ ان پر سنہ درج نہیں ۔ تاریخ (۱۷ ستمبر) صرف دوسرے رقعے پر ہے ۔ ''بالِ جبریل'' کی کتابت ۹ ستمبر ۱۹۳۴ء کو شروع ہوئی تھی[2] اس اعتبار سے یہ تینوں رقعات ۱۹۳۴ء کے ہیں ۔ پہلا رقعہ ۱۴ ، ۱۵ ستمبر کا ہے ۔ دوسرا ۱۷ ستمبر کا اور تیسرا رقعہ اواخر ستمبر کا معلوم ہوتا ہے ــــ تینوں رقعات علامہ اقبال میوزیم ، جاوید منزل لاہور میں محفوظ ہیں ۔

(۱)

علامہ اقبال نے ''بالِ جبریل'' کے مسودے کے ساتھ کاتب کو بعض رباعیات بھی دی تھیں ، تاکہ جن غزلوں کے آخر میں جگہ بچ جائے وہاں رباعیات لکھ دی جائیں ۔ جب پہلی دو کاپیاں (۱۶ صفحات) کتابت ہو کر ان کے پاس آئیں ، تو غزل نمبر ۷ (دگرگوں ہے جہاں . . .) کے اختتام پر جگہ بچ گئی تھی ، چنانچہ انھوں نے ایک رباعی اس ہدایت کے

۱۔ ملاحظہ کیجیے اقبال کے تین رقعات بنام شیخ مبارک علی مشمولہ ''انوارِ اقبال'' ، ص ۱۷۱ - ۱۷۳ ۔

یہ رقعات ''پیامِ مشرق'' طبع دوم کی کتابت کے سلسلے میں لکھے گئے ۔ بشیر احمد ڈار کا یہ قیاس درست نہیں کہ یہ طبع اول کی کتابت سے متعلق ہیں ، کیونکہ ''خردہ'' طبع اول میں موجود نہیں ، دوسری اشاعت میں شامل کیا گیا ۔

۲۔ تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ، ص ۲۹ ۔

ساتھ ارسال کی کہ اسے صفحہ ۱۶ پر لکھ دیا جائے۔ یہ رقعہ اسی سلسلے میں ہے:

[ستمبر ۱۹۳۴ء]

جناب پروین رقم صاحب،

صفحہ ۱۶ پر جو جگہ رباعی کے لیے خالی ہے، وہاں مندرجہ ذیل رباعی لکھیے:

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

محمد اقبال

(۲)

''بالِ جبریل'' کی کتابت شدہ تیسری کاپی (صفحات ۱۷—۳۲) واپس کرتے ہوئے، اس رقعے کے ذریعے علامہ نے تین رباعیات ارسال کیں۔ غالباً اس وقت مزید کوئی رباعی موجود نہیں تھی، اور فوری طور پر موزوں بھی نہ ہو سکی۔ چوتھی رباعی (عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر) بعد میں بھیجی گئی ہوگی۔

۱۷ ستمبر [۱۹۳۴ء]

جنابِ کاتب،

امید ہے کہ جو رباعی میں نے آپ کو ارسال کی تھی، وہ آپ نے صفحہ ۱۶ پر لکھ دی ہوگی۔ اس کاپی میں (جو واپس کر رہا ہوں) چار جگہیں خالی ہیں، ان کو بھی پُر کرنا ہے، اس واسطے مندرجہ ذیل تین رباعیاں بھیجتا ہوں۔ ان کو بھی اس کاپی میں لکھ دیں۔ اس خط کا جواب لکھیں، جو جگہیں اور خالی رہ جائیں، اُن کے لیے اور رباعیاں بھیجوں گا، کیونکہ خالی جگہ بُری معلوم ہوتی ہے۔

(۱)

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے، کیا بتائے
اگر ماہی کہے، دریا کہاں ہے

(۲)

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریان و بے تیغ و سناں عشق

(۳)

کبھی تنہائیِ کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

محمد اقبال

(۳)

ذیل کا رقعہ چند یوم بعد کا ہے، اندازاً ۲۰، ۲۱ ستمبر کا — اس میں اُس چوتھی رباعی (عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر) کے علاوہ، جس کا وعدہ ۱۷ ستمبر کے رقعے میں کیا گیا تھا، مزید چار رباعیاں بھیجی گئیں، جو بالترتیب صفحہ ۲۶، ۲۸، ۳۲ اور ۱۲۵ پر درج کی گئیں۔

جنابِ کاتب،

میں اس سے پہلے شاید چار رباعیاں[۱] بھیج چکا ہوں۔ پانچ آج بھیجتا ہوں، کل نو رباعیاں ہوئیں، مگر ان میں سے آپ نے ابھی تک ایک بھی

۱۔ جو پہلے دو رقعات میں مذکور ہیں۔

درج نہیں کی - مہربانی کر کے جب پہلا حصہ ختم ہو جائے ، تو سب کا سب میرے پاس ارسال کریں ، تا کہ میں دیکھ لوں کہ رباعیاں کہاں کہاں درج ہوئی ہیں - آپ کے لکھنے کی رفتار بہت سست ہے - ۲۶ یا ۲۷ سطر یومیہ اوسط ہے - اگر یہ حال رہا تو کتاب مشکل سے ختم ہوگی - میرے خیال میں آپ کو کم از کم ایک کاپی روز لکھنی چاہیے ، یہ کوئی مشکل کام نہیں -[1]

محمدؐ اقبال

(۱)

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(۲)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

(۳)

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بیزار دل سے ، دل خرد سے

۱- ۲۶ ، ۲۷ سطر تقریباً پانچ صفحات بنتے ہیں - علامہ اقبال ، پروین رقم کی اس رفتارِ کار سے مطمئن نہ تھے ، اور چاہتے تھے کہ کم از کم آٹھ صفحات (ایک کاپی) روزانہ لکھے جائیں -

(۴)

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں ، نے خدا بیں ، نے جہاں بیں
یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا

(۵)

[1]دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

محمد اقبال

مندرجہ بالا رقعات کے حوالے سے یہاں دو باتوں کی طرف مختصراً اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا ۔ اول : علامہ اقبال نے اپنے جن اشعار کو ''رباعیات'' قرار دیا ہے ، وہ رباعی کے مخصوص اوزان میں نہیں ، اس لیے بعض اہلِ نقد کے نزدیک انھیں ''رباعیات'' کے بجائے قطعات کہنا چاہیے ۔ (دیکھیے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون : ''کچھ تحقیقات کے بارے میں'' در : ''تحقیق و تنقید'' ، ص ۱۵۲ - ۱۶۸)

دوم : ''کلیاتِ اقبال'' ، اردو (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ، ۱۹۷۳ء) کی کتابت کے موقع پر مذکورہ رباعیات یا قطعات کو غزلوں سے علیحدہ کرکے ایک الگ حصے میں ''رباعیات'' کے زیر عنوان جمع کر دیا گیا ہے ۔ مناسب ہوتا کہ غزلیات و رباعیات کی وہی ترتیب برقرار رکھی جاتی ، جو پروین رقم کے کتابت کردہ نسخوں میں ہے ، کیونکہ غزلیات و رباعیات (یا قطعات) کی یہ ترتیب علامہ اقبال کے حسبِ ہدایت تھی ، اور ان کی وفات کے بعد اسے نظرانداز کرکے متنِ اقبال کی ترتیب میں کسی طرح کی تبدیلی جائز نہیں ۔

۱۔ اس آخری رباعی کے لیے کسی غزل کے آخر میں جگہ نہ نکل سکی ، اس لیے یہ آگے چل کر نظم ''دعا'' کے اختتام پر بچ جانے والی جگہ (ص ۱۲۵) درج کی گئی ۔

کتابیات

(۱) اقبال - ارمغانِ حجاز - کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور - نومبر ۱۹۳۸ء

(۲) اقبال - اسرار خودی - شیخ مبارک علی لاہور - ۱۹۱۵ء

(۳) اقبال - بال جبریل - تاج کمپنی لمیٹڈ ، لاہور - جنوری ۱۹۳۵ء

(۴) اقبال - بانگِ درا - ممتاز علی اینڈ سنز لاہور - ستمبر ۱۹۲۴ء

(۵) اقبال - بانگِ درا - شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور - مارچ ۱۹۳۰ء

(۶) اقبال - پیام مشرق - شیخ مبارک علی لاہور - [مئی ۱۹۲۳ء]

(۷) اقبال - جاوید نامہ - شیخ طاہرالدین انارکلی لاہور ، فروری ۱۹۳۲ء

(۸) اقبال - جاوید نامہ - شیخ مبارک علی تاجر کتب ، لاہور ، فروری ۱۹۴۷ء

(۹) اقبال - رموزِ بے خودی - شیخ مبارک علی لاہور - ۱۹۱۸ء

(۱۰) اقبال - زبورِ عجم - شیخ مبارک علی لاہور - ۱۹۲۷ء

(۱۱) اقبال - ضربِ کلیم - کتاب خانہ طلوعِ اسلام لاہور - جولائی ۱۹۳۶ء

(۱۲) اقبال - کلیات اقبال ، اردو - شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ، ۱۹۷۳ء

(۱۳) اقبال - مسافر - کتاب خانہ طلوعِ اسلام لاہور - ۱۹۳۴ء

(۱۴) بشیر احمد ڈار (مرتب) - انوارِ اقبال — اقبال اکادمی پاکستان کراچی ، مارچ ۱۹۶۷ء

(۱۵) رفیع الدین ہاشمی ، ڈاکٹر - تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ — اقبال اکادمی پاکستان لاہور ، ۱۹۸۲ء

(۱۶) فرمان فتح پوری ، ڈاکٹر - تحقیق و تنقید - قمر کتاب گھر کراچی ، ۱۹۷۷ء

(۱۷) روزنامہ ''جنگ'' لاہور ، یکم اکتوبر ۱۹۸۱ء

تنقید غالب میں اقبال کا حصہ

صدیق جاوید

(۱)

غالب ان چند شخصیات میں سے ہیں جنھیں علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے ہر دور میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اقبال نے غالب کو پبلک طور پر سب سے پہلا خراج تحسین ۱۹۰۱ء میں ایک اردو نظم کی صورت میں ادا کیا۔ یہ نظم 'مرزا غالب' کے عنوان سے، رسالہ مخزن لاہور کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ بانگ درا کی ترتیب اور اشاعت کے وقت اس نظم کو مجموعہ میں شامل کیا گیا۔ اور یہ اقبال کے پہلے اُردو مجموعہ کلام کی چوتھی نظم قرار پائی۔ مولانا غلام رسول مہر مطالب بانگ درا میں اس نظم کے تمہیدی نوٹ میں لکھتے ہیں:

"..... اس کا کوئی بند حذف نہ کیا گیا لیکن نظر ثانی میں بعض جگہ ترمیم کر دی گئی۔ اقبال نے ابتدائی دور میں جن شاعروں کے کلام سے بہ طور خاص استفادہ کیا۔ ان میں غالب سب سے پہلے آتا ہے اور یہ نظم اس کی بارگاہ میں ایک ایسا گراں بہا خراج ہے جو کوئی دوسرا شاعر پیش نہ کر سکا"[۱]۔

مولانا مہر کی رائے اس نظم کے بندوں کے بارے میں پوری سچائی کی حامل نہیں ہے۔ مخزن میں اس نظم کی طباعت کے مطابق دوسرے بند کی شکل یہ ہے:

۱۔ مطالب بانگ درا، غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور، اشاعت اول ص ۸

معجزہ کلک تصور ہے و یا دیوان ہے یہ
یا کوئی تفسیر رمز فطرت انساں ہے یہ
نازش موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ
نور معنی سے دل افروز سخن داناں ہے یہ
نقش فریادی ہے تیری[1] شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

جب کہ بانگ درا کی اشاعت کے موقع پر مندرجہ بالا بند حذف کرکے درج ذیل نیا بند شامل کیا گیا ہے :

محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار
تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشت فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

اس نظم کے دو سال بعد، اقبال نے ایک مضمون میں غالب کو فارسی اور اُردو کے مستند اساتذۂ سخن کی صف میں شامل کیا ہے - اس مضمون کا پس منظر یہ ہے کہ اگست (۱۹۰۳ء) کے ''اُردوئے معلٰے'' میں ایک مضمون . . . . ''اردو زبان پنجاب میں'' کے عنوان کی ذیل میں ''تنقید ہمدرد'' کے قلم سے شائع ہوا[2] - اس میں اقبال اور ناظر کی

۱- یہ مصرعہ باقیات اقبال (بار دوم و سوم) اور سرود رفتہ (مرتبہ غلام رسول مہر و صادق دلاوری)، میں نقل کرتے وقت مرتبین سے غلطی سرزد ہو گئی ہے - باقیات (ص ۲۸۲) اور سرودِ رفتہ (ص ۹۵) کے مطابق مخزن میں زیر نظر مصرعہ یوں طبع ہوا تھا -

ع نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

مخزن کے مطابق رخت سفر (جنوری ۱۹۵۲ء، ص ۸) اور کلیات اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق، حیدر آباد دکن (۱۳۴۳ھ ہجری، ص ۵۴)، میں زیر نظر مصرعہ میں 'کس کی' کے بجائے 'تیری' ہے -

۲- رسالہ مخزن لاہور، شمارہ ستمبر ۱۹۰۳ء، ص ۱۷

کی زبان پر ''تنقید ہمدرد'' نے بعض اعتراضات کیے تھے - جن کا اسی عنوان کے تحت انبالہ سے پنجابی کے قلم سے مخزن ستمبر ۱۹۰۲ء میں جواب شائع ہوا - اقبال نے بھی ایک مضمون میں متذکرہ عنوان کے تحت (رسالہ مخزن لاہور کے شمارہ اکتوبر ۱۹۰۳ء) ''تنقید ہمدرد'' کے اعتراضات کا جواب لکھا[1] - اس مضمون میں لغت اور فن شعر کی کتابوں کے علاوہ

۱- اقبال کا محولہ بالا مضمون مندرجہ ذیل کتابوں میں مکرر شائع ہوا ہے مگر ان تینوں مجموعوں میں اس مضمون کی تاریخ اشاعت کا حوالہ یوں درج ہے ، (مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء) ، جو درست نہیں ہے -

۱- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ، ۱۹۴۳ء
۲- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ۱۹۶۳ء
۳- مقالات اقبال (مع اضافے) مرتبہ سید عبدالواحد معینی اور محمد عبداللہ قریشی - بار دوم ۱۹۸۲ء

اقبال پر کام کرنے والے اہل قلم کے پیش نظر عام طور پر پہلے دو مجموعے رہے ہیں - وہ بہ وجوہ مخزن کے بجائے ان مجموعوں سے استناد کرنے ، حوالہ دینے اور استفادہ کرنے پر مجبور ہیں لہذا وہ زیر نظر مضمون کا حوالہ دیتے وقت مقالات اقبال کے مرتبین کی غلطی کا اعادہ کر جاتے ہیں - مثال کے طور پر دیکھیے :

۱- سرگذشت اقبال مؤلفہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، ص ۵۵
۲- دانائے راز ، سوانح حیات حکیم الامت حضرت علامہ اقبال ، از سید نذیر نیازی ، ص ۲۸۳ - ۲۸۲
۳- اقبال کا ذہنی ارتقاء مؤلفہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ص ۱۵
۴- اقبال کی اُردو نثر از ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ص ۸۴
۵- کتابیات اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ، ص ۲۴
۶- تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ، ص ۳۳۲ - ہاشمی صاحب کی یہ تالیف ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے - اس کتاب میں مقالات اقبال کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے بھی زیر نظر غلطی ان کی گرفت میں نہیں آئی دیکھیے کتاب ہذا ، ص ۳۴۸ - ۳۴۰)

کم و بیش چھبیس فارسی اور اُردو کے اساتذہ کے اشعار بطور سند پیش کیے گئے ہیں ۔ ان اساتذہ میں غالب بھی شامل ہے اور ان کے درج ذیل دو شعر اقبال نے سند کے طور پر پیش کیے ہیں اور دونوں مقام پر شاعر کا نام مرزا غالب علیہ الرحمۃ لکھا ہے :

بے در فروغی کہ چوں بر دمد زسیائے بے خوارہ نیر دمد[1]

کہاں گرمئی سعئی تلاش دید نہ پوچھ
بسان خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ[2]

متذکرہ مضمون کے ڈیڑھ سال بعد رسالہ مخزن کا ''یادگار داغ'' نمبر اپریل ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا ۔ اس میں اقبال کی داغ پر نظم شامل ہے ۔ جس کا پہلا شعر درج ذیل ہے اور اس میں غالب کی عظمت کا ذکر ہے :

عظمت غالب ہے ، اک مدت سے پیوند زمیں
مہدیٔ مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں

○

اقبال کی مزار غالب پر حاضری ، ان کی زندگی کے مصدقہ اور ریکارڈ پر آنے والے واقعات میں سے ہے ۔ اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لیے عازم انگلستان ہوئے تو وہ بمبئی جاتے ہوئے ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو ایک دن کے لیے دہلی میں رکے اور اپنے احباب کے ہمراہ حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ پر گئے جہاں اقبال نے اپنی نظم ''التجائے مسافر'' حضرت محبوب الٰہی کے مزار مبارک کے سرہانے بیٹھ کر پڑھی[3] ۔ اقبال نے ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء

بہر حال اس مضمون کی مصدقہ تاریخ اشاعت بمطابق مخزن ، اکتوبر ۱۹۰۳ء ہے ۔ مخزن کے علاوہ دیکھیے ۔ ذکر اقبال مؤلفہ مولانا عبدالمجید سالک ، ص ۲۸ ، زندہ رود حیات اقبال کا تشکیلی دور از ڈاکٹر جاوید اقبال ص ۹۶ ۔ مفکر پاکستان مؤلفہ محمد حنیف شاہد ، ص ۱۰۱ ۔

۱-۲- رسالہ مخزن ، شمارہ اکتوبر ۱۹۰۳ء ، ص ۳۴ ، ص ۳۶

۳- مطالعہ اقبال ، مرتبہ گوہر نوشاہی ، بزم اقبال لاہور ص ۴۷۲

کو عدن سے ایڈیٹر اخبار وطن لاہور کے نام اپنے مکتوب میں سفر کی روداد لکھتے ہوئے ایک جگہ تحریر کیا ہے ۔

"۔۔۔ شام کے قریب ہم اس قبرستان (درگاہ) سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب (حسن نظامی) سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے ۔ خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنج معانی مدفون ہے ۔ جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی ۔ حسن اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام تھا ۔ اس ظالم نے مرزا کے مزار کے قریب بیٹھ کر :

ع دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی

کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی سب طبیعتیں متاثر ہو گئیں بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھا :

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ۔ آنکھیں پر نم ہو گئیں اور بے اختیار لوح مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا ۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے ۔[1]

○

بیسویں صدی کی پہلی دہائی اقبال کی علمی ، ذہنی اور فکری زندگی کا پختہ دور ہے ۔ ان سالوں میں اقبال ایک بلند پایہ علمی شخصیت کا مقام اور مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں ۔ اس دہائی کے آخری سال (۱۹۱۰ء) کی ۲۷ اپریل کو اقبال نے اپنے بعض منتشر اور گریزاں ، بلکہ گریزپا خیالات کو ایک نوٹ بک میں قلمبند کرنے کا سلسلہ شروع کیا جو چند

۱۔ مطالعہ اقبال ص ۳۷۴

مہینے جاری رہا ۔ ظاہر ہے یہ نوٹ بک[1] اقبال کے پرائیویٹ علمی اشاروں notes پر مشتمل ہے ۔ اس میں وہ ایک جگہ ہیگل ، گوئٹے ، ورڈز ورتھ اور بیدل کے ساتھ غالب سے استفادہ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل ، گوئٹے ، مرزا غالب ، عبدالقادر بیدل اور ورڈزورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے ۔ ۔ ۔ غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں ۔ ۔ ۔''[2]

اس کے بعد اقبال کی مختلف شعری تصانیف میں ، مختلف صورتوں میں غالب کے حوالے نظر آتے ہیں مثلاً رموز بیخودی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی ۔ اس کے درج ذیل شعر :

حرف چون طائر بہ پرواز آورد   نغمہ را بے زخمہ از ساز آورد

کے حاشیہ میں اقبال نے ''مرزا غالب بہ تغیر الفاظ''[3] کا جملہ لکھا ہے ۔

○

پیام مشرق ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی ، اس کی فصل نقش فرنگ کے ذیلی باب صحبت رفتگاں (در عالم بالا) میں دنیا کے مختلف مشہور فلسفیوں شاعروں اور سیاستدانوں کے مکالمات پیش کیے گئے ہیں ۔ شعرا کے عنوان کی ذیل میں براوننگ ، بائرن ، غالب اور رومی کی زبانی ایک ایک شعر میں ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

یہاں غالب کہتے ہیں :

۱۔ یہ نوٹ بک ڈاکٹر جاوید اقبال نے جون ۱۹۶۱ء میں Stray Reflections کے نام سے شائع کرا دی اور اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر افتخار صدیقی نے ''شذرات فکر اقبال'' کے نام سے دسمبر ۱۹۷۳ء میں شائع کیا ۔

۲۔ شذرات فکر اقبال ۔ مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال ، ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ۔ مجلس ترقی ادب لاہور ، طبع اول ۔ ص ، ۱۰۵

۳۔ اسرار و رموز ، بار پنجم ۱۹۵۹ء ، ص ۱۶۸

"تاباده تلخ تر شود و سینه ریش تر
بگدازم آبگینه و در ساغر افگنم"[1]

○

بانگ درا کی تاریخ اشاعت ۱۹۲۴ء ہے ۔ اس میں مخزن ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہونے والی غالب پر نظم بعض تبدیلیوں کے ساتھ شامل ہے ۔ داغ پر نظم بھی بانگ درا کے پہلے دور کا حصہ ہے اس کتاب کے آخر میں ظریفانہ کی سرخی کے تحت قطعات درج ہیں مندرجہ ذیل دو قطعات میں غالب کا تذکرہ دیکھیے :

"اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے"
غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکر غیر کیا ؟
کیوں اے جناب شیخ سنا آپ نے بھی کچھ
کہتے تھے کعبہ والوں سے کل اہل دیر کیا

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں
ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا ؟
میرزا غالب خدا بخشے ، بجا فرما گئے
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں ، کھائیں گے کیا ؟

○

اقبال کی معرکۃ الآرا تصنیف جاوید نامہ فروری ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی ۔ انہوں نے فلک مشتری پر ارواح جلیلہ 'حلاج و غالب و قرۃالعین طاہرہ کو سرگرم سیر دکھایا ہے یہاں زندہ رود کی غالب سے بھی ملاقات ہوتی ہے اور زندہ رود غالب بعض مسائل سے متعلق استفسار کرتا ہے اس جگہ ان مکالمات کی تشریح یا ان کا اندراج غیر ضروری ہے بہر حال اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری سالوں تک غالب کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرتے رہے ۔ علاوہ ازیں یہ بھی معلوم

۱- پیام مشرق طبع ہشتم ، ۱۹۵۴ ، ص ۲۵۲

ہوا ہے کہ اقبال سفر و حضر میں بالعموم دیوان غالب اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے ۔[1]

(۲)

کلام اقبال پر شعر غالب کے اثرات بڑے واضح اور نمایاں ہیں چنانچہ ۱۹۲۴ء میں بانگ درا شیخ عبدالقادر کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوئی ۔ اس دیباچہ کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے ۔

''کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادب اردو کے فروغ کا باعث ہوں گے ۔ مگر زبان اردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا ۔ ۔ ۔''[2]

شیخ صاحب غالب اور اقبال کے تعلق سے اتنے مسحور ہیں کہ اگلے پیرے میں بھی یہ ذکر جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں :

''غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں ۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا ۔ اس نے ان کی روح کو عدم میں

۱۔ علامہ اقبال ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال پہنچے ۔ علامہ اقبال کے قیام کا انتظام 'ریاض منزل' میں کیا گیا تھا ۔ سر راس مسعود کے پرسنل سیکرٹری ممنون حسین خاں بیان کرتے ہیں کہ : ''۔ ۔ ۔ (رات کے) کھانے کے بعد میں علامہ اقبال کا کمرہ دیکھنے گیا تو ۔ ۔ ۔ علامہ اقبال کے بستر پر دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں ۔ ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوان غالب ، ملازم نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سفر میں زیادہ تر ان کتابوں کو ساتھ رکھتے ہیں ۔''

''اقبال اور بھوپال'' مؤلفہ صہبا لکھنوی اقبال اکادمی پاکستان کراچی ۱۹۷۳ ص ۵۵ ۔

۲۔ دیباچہ بانگ درا شیخ عبدالقادر ، طبع ستمبر ۱۹۶۳ء ، ص ۵

جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی اس نظم سے بہتر کوئی اور منظوم خراج غالب کی نذر نہیں ہوا۔ یہ نظم صرف اقبال کی غالب سے عقیدت ہی کی مظہر نہیں ہے بلکہ اقبال کے تنقیدی شعور کی آئینہ دار بھی ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال اپنی شاعرانہ زندگی کے آغاز میں بھی نہایت بالغ نظر اور پختہ تنقیدی رائے کے مالک تھے اگرچہ مرزا غالب پر اس نظم میں تنقید و تبصرہ علامہ کا مقصود نہ تھا۔ مگر اقبال نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے غالب کے کلام کی جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ وہ اس نظم کے بعد پچھلے اسی برسوں میں شائع ہونے والے تحسین غالب پر مشتمل تنقیدی سرمائے کی بنیاد ہے۔ اس دعوے کے شواہد پیش کرنے سے بیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی اس نظم کی اشاعت ۱۹۰۱ء تک کلام غالب کی اشاعتی رفتار اور ان کے کلام کی شرحوں اور تبصرہ پر مبنی کتب کا ایک سرسری جائزہ لے لیا جائے۔

اقبال غالب پر زیر نظر نظم کی تخلیق سے کتنا عرصہ قبل مرزا سے متعارف ہو چکے تھے۔ اس بارے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اقبال کے سن شعور تک پہنچنے کے وقت تک غالب ہندوستان کے شعر و ادب میں ایک روایت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ غالب کی مقبولیت کا اندازہ ان کے کلام کی اشاعت کی رفتار کے مندرجہ ذیل جائزہ سے ہو سکتا ہے۔

غالب کی اولین مطبوعہ کتاب ان کا دیوان اردو ہے جو پہلی بار مطبع سیدالاخبار سیدالمطابع ، دہلی سے اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔[2]

۱۔ دیباچہ بانگ درا شیخ عبدالقادر ، طبع ستمبر ۱۹۶۳ء ، ص ۵

۲۔ اشاریہ غالب ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ، مطبوعات مجلس یادگار غالب ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ، ۱۹۶۹ء ، ص ۷۷ ، ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۰ ، ۸۱ (علی الترتیب)

طبع دوم : مطبع دارالسلام ، (مطبع صادق الاخبار) حوض قاضی ، دہلی ، مئی ۱۸۴۷ء -[1]

طبع سوم : مطبع احمدی ، واقع شاہدرہ دہلی ، ۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء -[2]

طبع چہارم : مطبع نظامی ، کانپور جون ۱۸۶۲ء -[3]

طبع پنجم : در ''نگارستانِ سخن'' (مرتبہ ظہیر دہلوی) ۱۳ اگست ۱۸۶۳ء -

(۱) مطبع العلوم ، سینٹ سٹیفنز ، کالج دہلی -
(۲) مطبع احمدی واقع شاہدرہ ، دہلی -[4]

طبع ششم : مطبع مفید خلائق ، آگرہ ، ۱۸۶۳ء -[5]

غالب کے دیوان اول طبع اول ۱۸۴۱ء کے چار برس بعد غالب کا فارسی دیوان مطبع دارالسلام ، حوض قاضی دہلی ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا -[6] کلیات غالب (فارسی) طبع اول مطع نول کشور لکھنؤ مئی ، جون ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا[7] - غالب کے انتقال کے بعد سے انیسویں صدی کے اختتام تک تیس برسوں میں بھی غالب کا اردو اور فارسی دیوان متعدد بار شائع ہوا دیوان حالی پہلی بار ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا جس میں ان کا مرثیہ غالب بھی شامل ہے - ''انیسویں صدی کی آخری دہائی میں غالب کے اردو دیوان کی دو شرحیں بھی شائع ہوئیں - مالک رام کے بقول :

''سب سے پہلی شرح ''وثوق صراحت'' کے نام سے ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں - - - چھپی تھی - یہ دراصل ان یاداشتوں پر مشتمل ہے جو مولوی عبدالعلی والہ دکنی نے اپنے تدریسی فرائض کے لیے اپنے نسخے پر لکھ رکھی تھیں - وہ نظام کالج میں بی - اے طلبہ کو غالب کا اردو دیوان پڑھاتے تھے - انہوں نے جن مقامات کو شرح طلب خیال کیا - اپنے نسخہ

---

۱ تا ۴- اشاریہ غالب ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ، مطبوعات مجلس یادگار غالب ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ، ۱۹۶۹ء ص ۷۷ ، ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۰ ، ۸۱ (علی الترتیب)

۵- ایضاً ص ۸۳ ۶-۷- ایضاً ص ۳۴ ، ۳۵

دیوان میں وہاں ان کے معنی اور اشارے درج کر دئے ۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ بعد کو ان اشارات کو بڑھا کر شرح و بسط سے قلمبند کر لیں گے لیکن موت نے فرصت نہ دی اور ۱۳۱۱ھ یعنی ۱۸۹۳ء میں بعارضہ تپ دق ان کا انتقال ہو گیا ۔ اس کے بعد ان کے صاحبزادے محمد عبدالواحد نے یہی مختصر اشارات جمع کر کے "وثوق صراحت" کے تاریخی نام سے شائع کرا دیئے ۔ ۔ ۔ "[1]

مالک رام مزید لکھتے ہیں کہ :

"صحیح معنوں میں سب سے پہلی شرح مولوی احمد حسن شوکت میرٹھی کی تھی جو اپنے آپ کو مجدد السنہ شرقیہ کہا کرتے تھے ۔ ۔ ۔"[2] یہ شرح حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی کے نام سے ۱۸۹۹ء میں شوکت المطابع ، میرٹھ سے شائع ہوئی بہرحال مطالعہ غالب کے سلسلہ کی قابل ذکر کتاب حالی کی یادگار غالب ہے جو ۱۸۹۷ء میں مطبع نامی کان پور سے شائع ہوئی ۔

(۳)

غالب کے حوالے سے یہ وہ پس منظر تھا جس میں اقبال نے ولادت سے لے کر بلوغت تک کے مراحل طے کیے ۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم اور شعری و ادبی تربیت میں مولوی میر حسن کا بڑا ہاتھ ہے بقول سید عابد علی عابد ۔ ۔ ۔ "اس زمانے کے معمول کے مطابق شاہ صاحب (مولوی میر حسن) نے اقبال کو گلستان ، بوستان ، سکندر نامہ ، انوار سہیلی اور تصانیف ظہوری کا درس دینا شروع کیا[3] ۔ ۔ میر حسن شاہ نے ۔ ۔ ۔ رسمی انداز تدریس سے قطع نظر کر کے یہ کوشش کی کہ اقبال کے دل میں فارسی ادب کا احترام پیدا ہو جائے اور نتیجتاً اس ذوق سلیم کی تربیت ہو جس کے بغیر مطالعہ بالکل بیکار اور بے اثر ہوتا ہے[4] ۔ ۔ ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید میر حسن نے اقبال کو نثر ، نظم کے یہ شاہکار اس طرح

۱،۲۔ عیار غالب ، مالک رام ،دہلی ، ۱۹۶۹ء ص ۲۶۵

۳۔ شعر اقبال ، عابد علی عابد ، بزم اقبال لاہور ، ۱۹۵۹ء ، ص ۶۵

۴۔ ایضاً ص ۶۶

پڑھانے کہ ذہین طالب علم فارسی ادبیات کی عظمت کا معترف ہو گیا اور مزید مطالعہ کا شائق ۔ ۔ ۔ اس زمانے میں میر حسن نے نہ صرف اقبال کو فارسی ادبیات سے آگاہ کیا بلکہ عربی بھی پڑھائی اور ساتھ ہی مشرقی حکمت، تصوف اور فلسفہ کے رموز اس طرح ذہن نشین کیے کہ اسی زمانے میں اقبال کو اس سلسلے میں مزید جستجو اور تفحص کی چیٹک لگ گئی[1] عابد صاحب کے اس بیان سے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ علامہ میر حسن نے اقبال کو فارسی نظم و نثر کے شاہکار کس عمر میں شروع کرائے اور کب یہ سلسلہ ختم ہوا ۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ عابد صاحب کی اس رائے کا ماخذ مستند ہے یا وہ اس زمانے کے عام طرز تدریس کے پیش نظر محض قیاس سے کام لے رہے ہیں ۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اقبال میر حسن کے مشورے پر باقاعدہ سکاچ مشن سکول میں داخل ہوئے تھے ۔ اور مختلف مدارج طے کرتے ہوئے اقبال نے مڈل کا امتحان ۱۸۹۱ء میں پاس کیا ۔[2] بہرحال اقبال کی اس ذہنی استعداد اور علمی و ادبی شوق اور غالب کی عام مقبولیت کے پیش نظر باور کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کو اسی زمانے میں کلام غالب سے واقفیت ہو چکی ہو گی ۔ اقبال کے سکول کے دنوں میں جو نصاب مروج تھا ۔ اس کا سراغ نہیں لگ سکا ۔ البتہ اقبال جب مڈل کے درجہ میں تھے تو اردو کی جو کتاب مڈل کے طلباء کی ضرورت کے پیش نظر مرتب کی گئی تھی اور قیاس ہے کہ عام سکولوں میں تجویز کی جاتی ہوگی ۔ اس میں دیگر اساتذہ کے ساتھ غالب کا کلام بھی شامل تھا ۔ پیسہ اخبار گوجرانوالہ کی ۲۱ فروری ۱۸۹۰ء کی اشاعت میں ہفتہ وار ڈاک کے کالم میں ''مڈل کورس اردو'' کے عنوان سے ایک مراسلہ نگار لکھتا ہے :

''اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ امتحان مڈل میں اردو کا مضمون دندان شکن آتا ہے اور سر رشتہ کی طرف سے کوئی کورس مقرر نہیں ۔ اس ضرورت کے رفع کرنے کے لیے مولوی محمد فیروز الدین صاحب فیروز ڈسکوی مدرس اول فارسی ایم بی ہائی سکول سیالکوٹ نے ایک ایسا مڈل کورس دو حصوں نظم و نثر میں تیار کیا ہے جو زبان دانی

۱- شعر اقبال ، عابد علی عابد ، بزم اقبال لاہور ، ۱۹۵۹ء ، ص ۶۵
۲- روزگار فقیر ، فقیر سید وحید الدین ، حصہ اول ، ص ۲۴۴

کے واسطے بھی اکسیر ہے اور تہذیب اخلاق کے لیے بھی کامل استاد (استاد)۔ صرف اخلاقی یا طبعی یا علمی مضامین منتخب ہوئے ہیں۔ ہر ایک حصہ ۲۰۰ صفحے پر ہے قیمت فی جلد -/۸ روپے، بیس جلدوں سے زیادہ کے خریدار کو ۲۵ فیصدی رعایت ہے۔ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں اس کورس کے ہوتے اور کسی اردو کتاب کی ضرورت نہیں ہے چنانچہ اس دفعہ مضمون سرما وغیرہ جو امتحان مڈل میں آئے اس میں موجود ہیں میں سر رشتہ تعلیم کی خدمت میں گذارش کرتا ہوں کہ وہ اس کورس کو مڈل کی پڑھائی میں داخل کر دے۔

حصہ نظم: سودا۔ میر۔ درد۔ سوز۔ انشا۔ ناسخ۔ آتش۔ مومن۔ ذوق۔ غالب۔ امیر۔ امانت۔ نسیم۔ ظفر۔ آزاد۔ حالی۔ مرزا فیروز کے مؤلفات سے منتخب ہوا ہے۔ شروع میں شعرا کا تذکرہ بھی ہے۔ ماسٹر پیارے لال انسپکٹر حلقہ جالندھر اس حصے کی نسبت لکھتے ہیں کہ جس قدر میری نظر سے آج تک نظم کے کورس گزر چکے ہیں۔ یہ ان سب میں عمدہ ہے۔

حصہ نثر: آب حیات۔ نیرنگ خیال۔ آرائش محفل۔ بہار بیخزاں۔ صحیفہ فطرت۔ مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ محصنات۔ تہذیب الاخلاق۔ فسانہ آزاد۔ رسالہ دلگداز۔ عام معلومن کو اس کا پڑھانا ضروری ہے۔ راقم طالب علموں کا خیر خواہ۔''[1]

مندرجہ بالا طویل اقتباس زمانہ طالب علمی میں اقبال کی غالب سے واقفیت کی سند کے طور پر پیش نہیں کیا گیا۔ بہر حال اس سے قیاس کرنا غلط نہ ہو گا کہ اقبال سکول میں مڈل کے درجہ میں تھے تو وہ غالب سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ بعد کے شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کے متقدمین و متاخرین اساتذہ میں غالب نے ہی اقبال کو متاثر کیا۔ اقبال کے تعارف اور سوانح کے سلسلے میں اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلا مضمون اقبال کے دوست شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن کا ہے جو رسالہ خدنگ نظر لکھنؤ کے شمارہ مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا اور عتیق صدیقی صاحب کی تلاش و جستجو کے نتیجہ میں دریافت ہوا ہے۔

۱۔ گوجرانوالہ، پیسہ اخبار، بابت ۲۱ فروری ۱۸۹۰ء ص ۵

جسے انہوں نے اپنی کتاب ''اقبال جادوگر ہندی نژاد'' شائع کردہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی میں بطور ضمیمہ شامل کیا ہے۔[1] اس میں ایک جگہ مولوی میر حسن اور اقبال کے حوالے سے شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے :

''۔۔۔ مولوی صاحب کی یہ عادت ہے کہ اگر کسی شاگرد کو ہونہار دیکھیں تو اسے معمولی درس تعلیم تک محدود نہیں رہنے دیتے بلکہ خارج از وقت مدرسہ اسے بعض دلچسپ اور مفید کتابوں پر عبور کرا دیتے ہیں۔ پس جب سید میر حسن جیسے استاد کو اقبال سا شاگرد مل گیا تو انہوں نے کوئی دقیقہ ان جوہروں کو جلا دینے میں جو قدرت نے طبیعت میں امانت رکھے تھے اٹھا نہیں رکھا ۔۔۔ سید صاحب کو بے شمار اچھے اچھے شعر اساتذہ کے زبانی یاد ہیں۔ جو شعر وہ پڑھتے اقبال اسے لکھ لیتا اور یاد کر لیتا۔ دیوان غالب سبقاً ان سے پڑھا اور ناصر علی سرہندی کے دلآویز فارسی شعر بھی اس زمانے میں نظر سے گزرے۔''[2]

شیخ صاحب کے مضمون سے مولوی میر حسن سے اقبال کے سبقاً دیوان غالب پڑھنے کے زمانے کا قطعی تعین تو نہیں ہوتا۔ تاہم اسے قیاساً اقبال کے انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے گرد و پیش کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ شیخ عبدالقادر کے بیان کو اقبال کی بالواسطہ تائید حاصل ہے۔ کیونکہ یہ مضمون یقیناً اقبال کی نظر سے گزرا ہو گا۔

اقبال سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ اقبال، کالج ہوسٹل میں مقیم رہے۔ یہاں ان کی غلام بھیک نیرنگ سے ملاقات ہوئی جو آخر دم تک قائم رہی۔ نیرنگ بورڈنگ

۱۔ اس مضمون کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اوریئنٹل کالج میگزین لاہور شمارہ مسلسل ۲۲۵ (اقبال نمبر) میں زیر نظر مضمون کی مکرر اشاعت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۲۔ اقبال جادو گر ہندی نژاد، عتیق صدیقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ ۱۹۸۰ء ص ۱۲۹، ۱۳۰

ہاؤس میں علامہ اقبال کے اشغال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ۔ ۔ ۔ میں اس بورڈنگ ہاؤس میں چار سال رہا ۔ ان میں سے تین سال ایسے تھے کہ اقبال بھی اس بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھے ۔ ۔ ۔ ان سہ سالہ صحبتوں میں خاص بات کیا تھی ؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم کو اس وقت اتنا شعور ہی نہ تھا کہ اس زمانے کے اقبال میں زمانۂ مابعد کے اقبال کو دیکھ لیتے ۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ایک ذہین طالب علم جس نے شاعرانہ طبیعت پائی ہے ، اس کو مرزا غالب کی شاعری سے خاص ذوق بھی ہے اور غالب کے اسلوب بیان کی تقلید کا شوق بھی ۔ وہ اگر شعر کا شغل کرتا رہا تو غالب کا سا لکھنے لگے گا ۔ اور بہر حال اسی قسم اور اسی معیار کا ایک بن جائے گا ۔ جیسے ہمارے یہاں کے شاعر ہوتے ہیں"[1]

(۴)

اقبال کی غالب سے اس دلچسپی کے پیش نظر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے حالی کی یادگار غالب (جو ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی) کا ، اس کتاب کی تاریخ اشاعت کے قریبی زمانے میں مطالعہ بھی ضرور کیا ہو گا ۔ مولانا حالی کی تحسین غالب سے اقبال نے کیا اثرات قبول کئے ۔ اس کے مفصل ٹھوس اور خارجی شواہد تو موجود نہیں ہیں ۔ البتہ ان کا سراغ اقبال کی غالب پر لکھی گئی نظم سے لگایا جا سکتا ہے ۔

مولانا حالی نے یادگار غالب میں "مرزا غالب کے کلام پر ریویو" کے باب میں جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے ۔ انہیں اجمالاً تخیل کی بلند پروازی ، ظرافت ، اخلاق ، تصوف ، عاشقانہ مضامین ، شوخی ، حسن بیان اور جدت و ندرت سے موسوم کیا جا سکتا ہے ۔ اس ضمن میں یادگار غالب کے درج ذیل اقتباسات توجہ طلب ہیں ۔

"مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تابہ مقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اس لیے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز خیال اور طرز بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے ۔

۱۔ مطالعہ اقبال ، مرتبہ گوہر نوشاہی ، بزم اقبال لاہور ، ۱۹۷۱ء ص ۲۳ ، ۲۴

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو ، مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی ارجنیلسٹی اور معمولی اپچ کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے ۔[1]

"گو ان کا ابتدائی کلام جس کو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سر انجام کرتے تھے ، مقبول نہ ہوا ، مگر چونکہ قوت متخیلہ سے بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اس لیے اس میں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی ، جب قوت ممیزہ نے اس کی باگ اپنے قبضے میں لی تو اس نے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے ۔[2]

وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے ، نہایت کاوش سے لکھتے تھے ۔[3]

" ۔ ۔ ۔ اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ[4] ۔ دیکھئے اقبال نے بھی زیر تبصرہ نظم میں غالب کے تخیل کی بلند پروازی کا مضمون باندھا ہے ۔

فکر انسان پر تیری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مخزن میں اس شعر کا دوسرا مصرعہ حسب ذیل لفظوں میں شائع ہوا تھا :

ع ہے پر مرغ تصور کی رسائی تا کجا

اگرچہ لفظ تصور کو تخیل سے بدلنے کے باوجود اصل مضمون برقرار رہتا ہے مگر اس سے حسن بیان میں اضافہ ہو گیا ہے جس سے محسوس ہوتا کہ شعر کی معنوی سطح متاثر ہوئی ہے ۔

۱۔ یادگار غالب ، حالی ، مجلس ترقی ادب لاہور ۔ ص ۱۶۳
۲۔ ایضاً ص ۱۶۶ ؛ ۳۔ ایضاً ص ۲۴۷
۴۔ ایضاً ص ۲۵۰

"چونکہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہو گئی ہے اس لیے (ہم سے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ) جہاں ضرورت دیکھیں ، مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں ۔ اس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوت متخیلہ میں جو غیر معمولی اچک اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی ، سمجھ دار آدمی اس کا کسی قدر اندازہ کر سکیں لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جس کے نقاد اور جوہری ملک میں کمیاب بلکہ نایاب ہیں ، اس کی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھ دینا کافی معلوم ہوتا ہے :

بیاورید گر این جا بود زبان دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد[1]

"ہم اس مقام پر ان کی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کریں گے جن کے بغیر مرزا کی طرز تخیل اور ان کے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی" ۔[2]

"میر و سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عام اہل زبان کی معمولی بول چال اور روز مرہ میں ادا کئے جائیں ، چنانچہ میر سے لے کر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرے ہیں ، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں ۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضامین (مضمون) پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے ، وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے ۔ بر خلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں جو سب سے نرالا

۱۔ یادگار غالب ، حالی ، مجلس ترقی ادب لاہور ۔ ص ۲۷۹
۲۔ ایضاً ص ۲۸۷

ہے اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے''[1] -

''تنقید غالب کے سو سال'' کے دیباچہ میں سید فیاض محمود لکھتے ہیں :

'' . . . . اس کتاب کے مرتب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان سینکڑوں کتب اور مقالات میں سے ایسی نگارشات کا انتخاب کیا جائے ، جن سے قارئین کو یہ معلوم ہو سکے کہ غالب شناسی کن کن مدارج سے گذری . . .

جب اس وسیع مواد کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ پہلی مقتدر کتاب جس میں مرزا کے کلام سے ناقدانہ انداز میں بحث کی گئی ہے - آب حیات ہے جو ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی - مگر مولانا محمد حسین آزاد کا انداز نقد و نظر تعصب سے خالی نہ تھا اور جو طنز آمیز اسلوب انہوں نے مرزا کے متعلق اختیار کیا اس سے نہ تو مرزا کی شخصیت اور نہ ہی ان کی شاعری کی خصوصیات اجاگر ہوئیں - اس کے سترہ سال بعد یعنی ۱۸۹۷ء میں یادگار غالب طبع ہوئی - اس میں مرزا کی شخصیت اور شاعری پر سیر حاصل بحث موجود ہے - اس کے پندرہ سال بعد یعنی ۱۹۱۲ء میں صلاح الدین خدا بخش کا مضمون انگریزی زبان میں شائع ہوا - محاسن کلام غالب کا سال اشاعت ۱۹۲۱ء ہے اور ڈاکٹر عبداللطیف کی انگریزی میں غالب پر کتاب ۱۹۲۸ء میں چھپی - مگر غالب شناسی کا نیا دور در اصل شیخ محمد اکرام صاحب کی کتاب ''غالب نامہ'' مطبوعہ ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے - اس کے بعد تنقیدات غالب میں تیزی سے اضافہ ہوا - جو اب تک جاری ہے - اگر ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۷ء تک کی مدت کو پہلا دور تصور کیا جائے تو ۱۹۲۵ء کو دوسرے دور کی حد فاصل قرار دینا مناسب ہو گا - تیسرا دور ۱۹۳۶ء تا حال کا ہے - اس میں غالب شناسی بہت سے مراحل سے گزری ہے اور غالب کے کلام اور فن پر بہت سے تنقیدی زاویوں سے بڑے بڑے فضلا نے بحث کی ہے[2] -

---

۱- یادگار غالب ، حالی ، مجلس ترقی ادب لاہور - ص ۱۶۸ ، ۱۶۹

۲- دیباچہ ، تنقید غالب کے سو سال ، سید فیاض محمود ، مطبوعات یادگار غالب ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء ص ۱۸ ، ۱۹

(۵)

سید فیاض محمود کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ یادگار غالب (۱۸۹۷ء) کے بعد ۱۹۱۲ء تک کلام غالب پر کوئی تنقیدی کتاب یا مضمون معرض تحریر میں نہیں آیا ۔ علامہ اقبال کی نظم ستمبر ۱۹۰۱ء کے مخزن میں پہلی بار شائع ہوئی تھی ۔ غالب اور اقبال کے سلسلے میں بعض ناقدین نے اقبال پر غالب کے فیضان اور ادبی اثرات کا جائزہ لیا ہے لیکن یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اقبال غالب سے نفس مضمون اور زبان و بیان کے کن اسالیب اور پہلوؤں سے متاثر ہوئے اور غالب کو ایک معیار قرار دے کر اپنے شعری اسلوب کی تخلیق میں کیا مدد لی ؟ البتہ اس مضمون میں راقم الحروف کا موقف یہ ہے کہ اقبال نے مرزا غالب پر نظم لکھ کر غالب کی جن شعری خصوصیات کی نشاندہی کی ہے وہ غالب کے کلام کی تحسین اور تنقید کے سلسلے میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اور بعد کے ناقدین غالب نے انہی خصوصیات کو بالصراحت اپنے تنقیدی مقالوں میں پیش کیا ہے ۔ غالب کے فکر و فن پر مشتمل کتب اور مضامین کے مجموعی مطالعہ کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے ۔ کہ فکر و فن غالب پر شائع ہونے والی تحریروں میں تفصیلاً جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اقبال کی نظم میں مجملاً بیان ہو گیا ہے ۔ نیز یہ کہ اقبال کی اس نظم سے ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے ۔ حالی کا ذوق ، مشرقی شعری روایات کا مرہون منت ہے ۔ ان کے ہاں تنقیدی اصول انگریزی انتقادیات سے بالواسطہ اخذ کئے ہیں ۔ اب اقبال کی خلقی استعداد اور اخاذ قوت ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرنے ضروری نہیں رہے کیونکہ یہ معلوم واقعہ ہے کہ اقبال نے انگریزی زبان و ادب کا مطالعہ درجہ بہ درجہ ، ماہر اور قابل اساتذہ کی راہنمائی میں مکمل کیا تھا ۔ نصاب سے باہر اپنے فطری ذوق کی تسکین کے لیے انہوں نے جو ذاتی مطالعہ کیا وہ اس پر مستزاد ہے ۔ اس کے نتیجہ میں شاعری کے مختلف عناصر ترکیبی کی اہمیت ان پر واضح ہوئی ۔ غالب پر ان کی نظم دیکھ کر پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر علامہ اپنی تمام تر توجہ شاعری پر مرکوز نہ کر دیتے تو وہ شعر و ادب کے ایک بالغ نظر نقاد ہوتے ۔ اقبال نے مرزا غالب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کلام غالب کی جن معنوی

خوبیوں اور فنی محاسن پر روشنی ڈالی ہے ۔ انہیں ذیل میں مختلف عنوانات کے تحت اقبال کی نظم کے شعروں اور مصرعوں کے حوالے سے کسی تبصرہ کے بغیر مرتب کیا جا رہا ہے ۔ تاہم نظم کے متن میں نظر ثانی کی بنا پر جہاں کہیں فرق واقع ہوا ہے ۔ وہاں مخزن اور بانگ درا کے تقابلی متن درج کر دئے گئے ہیں ۔ اب اقبال کی نظم کی روشنی میں غالب کے کلام کی خصوصیات ملاحظہ کیجیے ۔

۱۔ تخیل کی بلند پروازی

فکر انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تصور کی رسائی تا کجا

(مخزن ستمبر ۱۹۰۱)

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

(بانگ درا)

۲۔ وحدت الوجود کا نظریہ

دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
صورت روح رواں[1] ہر شے میں جو مستور ہے

(مخزن ستمبر ۱۹۰۱ء ص ۳۹)

اصلاح اور ترمیم کے بعد بانگ درا میں دوسرا مصرعہ یوں ہے :

بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

۱۔ سرود رفتہ مرتبہ غلام رسول مہر و صادق علی دلاوری میں یہ مصرعہ یوں چھپا ہے ۔

صورت روح و رواں ہر شے میں جو مستور ہے

(سرود رفتہ ص ۹۵)

۳- فلسفیانہ پہلو

تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

(بانگ درا)

۴- نفسیاتی پہلو

معجز کلک تصور ہے و یا دیواں ہے یہ
یا کوئی تفسیر رمز فطرت انساں ہے یہ

(مخزن)

۵- ندرت بیان/منفرد اسلوب

شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر

(مخزن اور بانگ درا)

۶- فصاحت و بلاغت

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر

(مخزن اور بانگ درا)

۷- ژرف نگاہی

آہ ! اے نظارہ آموزِ نگاہ نکتہ بیں

(مخزن اور بانگ درا)

۸- معنی آفرینی : مخزن میں شائع شدہ جو بند حذف کر دیا گیا تھا ۔ اس کے درج ذیل ایک مصرعہ میں دیوان غالب کی زیر نظر خصوصیت بیان ہوئی ہے -

نور معنی سے دل افروز سخن داناں ہے یہ

۹- مضمون آفرینی

تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار

(بانگ درا)

۱۰- زندگی کی ترجمانی

نقش فریادی ہے تیری شوخئی تحریر کا (مخزن)
زندگی مضمر ہے تیری شوخئی تحریر میں (بانگ درا)

۱۰- اظہار پر قدرت

"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا" (مخزن)

تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں (بانگ درا)

۱۲- فکر و تخیل میں ہم آہنگی

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

مخزن میں اس شعر کا دوسرا مصرعہ یوں چھپا تھا:

ہو تصور کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

۱۳- نغمگی یا موسیقیت: مخزن میں طبع ہونے والی نظم میں اس خصوصیت کا حامل کوئی شعر یا مصرعہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ خصوصیت نظر ثانی کے وقت اقبال کے لیے جاذب توجہ بنی - خصوصاً درج ذیل شعر میں تشبیہ نے معنویت میں زیادہ زور پیدا کر دیا ہے۔

محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار

۱۴- حافظ و سعدی سے مقابلہ

خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر
(مخزن - بانگ درا)

۱۵- گوئٹے اور غالب کا معنوی اشتراک

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

۱۶- غالب کی عظمت

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے ؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے ؟

اس بند کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ کی مخزن میں اشاعت کے وقت شکل یہ تھی :

تیرے ہر ذرہ میں خوابیدہ ہیں شمس و قمر

(۶)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اپنے مضمون ''غالب اور اقبال'' میں زیر نظر نظم کے چار اشعار (۱ ۔ فکر انساں پر .... ۲۔ تیرے فردوس تخیل سے .... ۳۔ نطق کو سو ناز ہیں .... ۴۔ لطف گویائی میں تیری ہم سری ....) کے حوالے سے لکھا ہے :

''ان اشعار میں غالب کے کمال سخن کے عناصر اربعہ پر زور دیا گیا ہے یعنی تخیل ، فکر ، نطق اور رفعت پرواز . . . ایک ابتدائی نظم کی محدود بساط میں اقبال نے غالب کے نمایاں شعری کردار کا جس جامعیت اور ایجاز کے ساتھ احاطہ کیا ہے وہ خود اقبال کے ذہنی عمل کی غمازی کرتا ہے''[1]

مزید برآں اس نظم سے اقبال کے نظریۂ شعر کے ابتدائی نقوش سامنے آتے ہیں ۔ نظم کے مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اقبال ادب کے ایک ایسے سنجیدہ ، زیرک اور ذہین طالب علم تھے جو مطالعہ کے نتیجہ میں اپنی رائے مرتب کرتا ہے گویا اقبال کے نظریہ شعر کی اساس ۱۹۰۱ء میں متعین ہو چکی تھی ۔ مختصر یہ کہ یہ نظم محض رسمی خراج تحسین ہے نہ اس کی نوعیت صرف تاثراتی ہے ۔ بلکہ اس میں علمی اور تنقیدی اصولوں کی روشنی میں خصوصیات کلام غالب کا بیان ہوا ہے ۔ کیا تنقید کے لیے نثر کو ذریعہ بنانا ضروری ہے ؟ یہ ایک الگ سوال ہے آپ اس پر غور کر سکتے ہیں ۔

۱۔ نقش غالب ، اسلوب احمد انصاری ، غالب اکیڈمی نئی دہلی اشاعت اول اکتوبر ۱۹۷۰ء ، ص ۵۷ یا نقش اقبال ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ص ۱۴۹ ، ۱۵۰

اقبال اور حیدر آباد

تالیف

نظر حیدر آبادی

اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ اقبال کے بعض پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی جا چکی ہے، مگر ایسے پہلو بھی ہیں جو ابھی لکھنے والوں کی توجہ کا مرکز نہیں بن پائے ہیں۔ نظر حیدر آبادی کی تالیف ''اقبال اور حیدر آباد'' ایک ایسے ہی پہلو سے تعلق رکھتی ہے۔

حیدر آباد دکن عام شہروں کی طرح ایک شہر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا ثقافتی مرکز تھا جو نہ صرف دکن کے بسنے والوں کے لیے بلکہ جملہ مسلمانانِ ہند و پاک کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ حیدر آباد سے اقبال کے تعلق کو اُجاگر کر کے جناب نظر حیدر آبادی نے ایک اہم ادبی اور تاریخی خدمت انجام دی ہے اور اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

صفحات : ۲۳۲ | قیمت : ۲۱ روپے

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ، لاہور

اقبال اور عبدالمجید قرشی

افضل حق قرشی

عبدالمجید قرشی بٹی (ضلع امرتسر) کے رہنے والے تھے - والد کا نام عبدالعزیز تھا - ان کی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات میسر ہیں - چنانچہ ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کہ وہ کب پیدا ہوئے اور کہاں تعلیم پائی کچھ معلوم نہیں - میسر معلومات کے مطابق ان کی عملی زندگی کا آغاز ڈاکٹر سیف الدین کچلو (۱۸۸۸ — ۱۹۶۳) کی قائم کردہ جماعت ''تنظیم'' سے ہوتا ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۵ء میں پنڈت مالویہ (۱۸۶۱-۱۹۰۶) کی ''ہندو سنگٹھن'' کے جواب میں شروع کیا تھا - قرشی ''تنظیم'' کے اسسٹنٹ سیکرٹری تھے - انہوں نے کچھ عرصہ ہفتہ وار ''تنظیم'' امرتسر کی ادارت کے فرائض بھی سر انجام دئے - ۱۹۲۹ء میں انہوں نے ''سیرت کمیٹی'' کی بنیاد رکھی - سیرت کمیٹی کا پروگرام یہ تھا:

تبلیغ قرآن

اشاعت سیرت

ارکان اسلام کی بنیاد پر مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی تنظیم

اس غرض کے لیے سیرت کمیٹی نے چھ عملی وسائل مہیا کئے -

۱- ہر شہر میں سیرت کمیٹی - ہر مقام پر ایک کمیٹی بنائی جائے جس کی ساری کوششیں قیام شریعت کے لیے ہوں اور وہ تمام کام محض دینی بنیادوں پر کرے -

۲- ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے لئے مطالعہ ''ایمان'' - ہر سیرت کمیٹی اپنے شہر میں یہ انتظام کرے کہ وہاں جتنے بھی تعلیم یافتہ مسلمان ہیں ، وہ سب کے سب ہر دسویں دن دو پیسے دے کر اخبار ''ایمان'' پڑھیں تاکہ وہ سب اپنے وقتی حالات و خطرات سے آگاہ ہوں اور انہیں اپنے جماعتی

پروگرام کی رفتار معلوم ہوتی رہے - تعلیم یافتہ جماعت ایک خیال کی پابند ہو کر ایک راستے پر چلنا شروع کر دے -

۳- ہر گھر میں درس قرآن ، تا کہ عورتوں اور بچوں تک بھی اصلاح کی آواز پہنچے -

۴- ہر مسجد میں ایک خطبہ جمعہ - سیرت کمیٹی پٹی سے سال کے ۵۲ جمعوں کے لیے وقت کے مطابق اردو وعظ صرف آٹھ آنے میں بھیجے جاتے ہیں - انہیں تاریخ وار جامع مسجدوں میں سنانا چاہیے - اس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان بھی ہماری تحریک میں شامل ہو جائیں -

۵- ہر شہر میں بیت المال - ہر مقام پر تنظیم صدقات و زکوۃ سے غربت اور بیکاری کا علاج -

۶- ہر مسلمان کے لیے لازمی ورزش اور پریڈ ، تاکہ ہر مسلمان اپنی حفاظت کے قابل بن سکے[1] -

قرشی کی زندگی کا مشن اسوۂ حسنہ کی اشاعت تھی - ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے بقول :

"اس صدی کی چوتھائی دہائی کے آغاز میں وہ سیرت رسول ص کی اشاعت کے لیے میدان میں نکلے - پہلے پٹی (ضلع قصور) سے ایک پندرہ روزہ اخبار "ایمان" جاری کیا - سفید کاغذ ، اعلیٰ درجے کی کتابت ، عمدہ طباعت اور مواد کے لحاظ سے بڑے بڑے دینی رسائل پر بھاری - پھر سیرت کمیٹی قائم کی - اور پانسال کے اندر اندر کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ سیرت نبوی کا تئیس زبانوں میں ترجمہ شائع کرکے بیس لاکھ کتابچے مفت تقسیم کرا دیئے - ملک کے اندر اور باہر یوم النبی ص کے جلسوں کا نظام قائم کر دیا - سات ملکوں میں اشاعت سیرت کے مبلغ بھیجے - امیر شکیب ارسلان کی کتاب "اسباب زوال امت" اور علامہ رشید رضا مصری کی "حقیقت دین" کی ہزار ہا کاپیاں چھاپ کر مفت تقسیم کر دیں - اصلاح امت کے لیے پانسو مضامین کئی زبانوں میں منتقل کرکے اُن کی آٹھ ہزار کاپیاں دنیا بھر کے اسلامی اخبارات کو بھیج دیں - پینتیس ہزار

۱- ایمان - ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ - ص ۷۹ ، ۸۰

پوسٹر ، ستر ہزار ہینڈ بل اور پندرہ ہزار متفرق رسائل شائع کئے - سات ہزار مساجد میں اٹھہتر ہزار خطبات جمعہ و عیدین تقسیم کرائے - سیرت کمیٹی کی سوا دو سو شاخیں تھیں جن کے ساتھ سوا دو ہزار جامع مسجدیں ملحق تھیں - ان سب میں ہر نماز جمعہ کے موقع پر سیرت کمیٹی کے مرتبہ خطبات پڑھے جاتے تھے -

عبدالمجید قرشی کا طریق کار یہ تھا کہ چندہ نہیں مانگتے تھے - اپنی گرہ سے پیسے خرچ کرکے سیرت نبوی پر ایک کتابچہ چھاپتے - اور لوگوں سے کہتے کہ وہ اسے بڑی تعداد میں خرید کر مفت تقسیم کریں یا کرائیں - اس سے جو آمدنی ہوتی ، اس سے ایک اور کتابچہ چھاپ لیتے - اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا - ''ایمان'' کا سالانہ چندہ تین روپے تھا - غربا سے صرف دو روپے لیے جاتے تھے - اور اخبار کی آمدنی اخبار ہی پر صرف ہوتی تھی - پھر یہ بات بھی ہے کہ قوم سے چندہ مانگنے کی جگہ سیرت کمیٹی نے اپنے سرمائے سے آٹھ ہزار روپے قوم کے لیے وقف کیے اور تین ہزار روپے مفتی اعظم فلسطین کو بھیجے''[1] -

علامہ اقبال کو قرشی کی تحریک سے دلچسپی تھی - چنانچہ انہوں نے متعدد بار سیرت کمیٹیوں کے قیام ، یوم النبی ص منانے اور سیرت کمیٹی کی طرف سے اسوۂ حسنہ کی اشاعت کے سلسلے میں تعاون کی اپیلیں کیں - مرکزی سیرت کمیٹی کے نام ایک پیغام میں اقبال لکھتے ہیں :

''تحریک اتحاد نہایت مبارک ہے اور حضور رسالت مآب کی سیرت پاک کی اشاعت اس تحریک کو عملی صورت دینے کا بہترین ذریعہ ہے - مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ انتشار و تشتت کی حالت میں یہ تحریک نہایت مؤثر ہو گی -

فرد از حق ، ملت از وے ، زندہ است
از شعاع مہر او تا بندہ است[2]

۱- عبدالسلام خورشید - وے صورتیں الہی (لاہور : قومی کتب خانہ ، ۱۹۷۶) ۳۱۴ - ۳۱۵

۲- ایمان - ۴ مئی ۱۹۳۵ء - بحوالہ منظور الحق صدیقی - ''اخبار ایمان میں علامہ اقبال کا ذکر'' اقبال ریویو ۲۰ : ۲ (جولائی ۱۹۷۹ء) ص ۶۸

بھی نہیں ، علامہ اقبال سیرت کمیٹی کے منعقد کردہ جلسوں اور جلوسوں میں شرکت بھی فرماتے ۔ پندرہ روزہ ''ایمان'' سے یہ خبر ملاحظہ کیجیے :

علامہ اقبال سیرت کمیٹی کے جلوس میں

ڈاکٹر اقبال جالندھر کے جلسے اور جلوس میں شریک تھے ۔ آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

''چند سال ہوئے میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ خدا تعالیٰ مولود شریف کے ذریعے سے اس امت کو متحد کرے گا ۔ مجھے ایک عرصہ تک حیرت رہی کہ یہ واقعہ کس طرح رونما ہو گا ۔ اب تحریک یوم النبی نے اس خواب کی تعبیر کو حقیقی طور پر نمایاں کر دیا''[۱] ۔

۱۹۲۹ء میں اقبال کے مشورے سے ''چھپن فی صد کمیٹی'' کا قیام عمل میں لایا گیا تو قرشی اس کے سیکرٹری مقرر کئے گئے ۔ کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فی صد ہے ، اس لیے انہیں تمام جمہوری اداروں میں چھپن فی صد نیابت دلائی جائے ۔ اقبال گو اس میں براہ راست شریک نہیں تھے لیکن پس پردہ رہنمائی کرتے رہے ۔

اقبال کو افغانستان کے حالات سے زندگی بھر دلچسپی رہی ۔ ۱۹۲۹ء کے اوائل میں جب وہاں خانہ جنگی شروع ہوئی اور امان اللہ خان کی جگہ بچہ سقہ نے حکومت پر قبضہ کیا تو جنرل نادر خان نے بچہ سقہ کی حکومت کے خلاف لشکر کشی کی ۔ مسلمانان ہند نے ان کو مالی امداد پہنچانے کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا ۔ زخمی سپاہیوں ، بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی امداد و اعانت کے لیے ''نادر خان ہلال احمر سوسائٹی''[۲]

۱۔ ایمان ۔ ۴ مئی ۱۹۳۵ء ۔ بحوالہ منظور الحق صدیقی ۔ ''اخبار ایمان میں علامہ اقبال کا ذکر'' اقبال ریویو ۲۰ : ۲ (جولائی ۱۹۷۸ء) ص ۶۷

2. Statement of Newspapers and Periodicals published in the Punjab during the year 1933.

کے مطابق اس کا نام افغانستان ہلال احمر سوسائٹی تھا ۔ اس میں تحریر ہے :

He is the Secretary of the Afghanistan Hilal Ahmar Society (Afghanistan Red Crescent Society) of which Sir Muhammad Iqbal is the President (p. 99.)

قائم کی گئی ۔ علامہ اقبال اس کے صدر چنے گئے اور عبدالمجید قرشی سیکرٹری ۔ علامہ اقبال نے امدادی فنڈ جمع کرنے کے لیے لوگوں سے اپیل کی[۱] ۔ قرشی نے ''تنظیم'' کے زمانہ میں دس ہزار روپیہ جمع کیا تھا۔ وہ ان کے نام سے نصفا نصفی مسلم بنک امرتسر اور دی سنٹرل کو آپریٹو بنک امرتسر میں جمع تھا ۔ قرشی کے مطابق :

''مسلم بنک کا روپیہ ایک ایک معطی کی منظوری کے بعد ڈاکٹر اقبال مرحوم نے غازی نادر شاہ مرحوم کی امداد کے لیے افغانستان بھیج دیا''[۲] ۔

قرشی ایک مخلص اور درد مند مسلمان تھے ۔ شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں ان کے سامنے اٹھیں اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف چلائی گئی ان تحریکوں کے خلاف مقدور بھر جدو جہد کی ۔ حتیٰ کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانان ہند کے مسئلے کا حل تقسیم بر عظیم میں مضمر ہے ۔ چنانچہ انہوں نے ۳۱ اگست ۱۹۲۸ء کو روز نامہ انقلاب لاہور میں ایک مضمون لکھا جو ان کے بقول تقسیم ہند کی پہلی آواز تھی ۔ وہ تحریر کرتے ہیں ۔

''ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی از سر نو تقسیم ہو جائے اور ہر ایک قوم کی زیادہ سے زیادہ آبادی کو علیحدہ علیحدہ حلقوں میں جمع کر دیا جائے ۔ مثلاً سندھ ، صوبہ سرحد وغیرہ مسلم حلقہ اثر ہوں ۔ لدھیانہ اور اس کے بعض ملحقات سکھ حلقہ اثر قرار دئے جائیں اور پھر ہر قوم کو اپنی اکثریت کا حلقہ دے دیا جائے تا کہ وہ اپنے آپ پر خود حکومت کرے ۔ ۔ ۔ اگر حلقہ ہائے اثر مختلف قوموں میں بانٹ دئے جائیں تو باہمی رقابت ختم ہو جاتی ہے ۔ زبان ، تعلم معاشرت ، قربانی اور باجہ کے جھگڑے مٹ جاتے ہیں ۔ بشرطیکہ یہ حکومتیں اپنے اپنے ''حدود اثر'' میں آزاد ہوں اور مشترکہ معاملات باہمی رضا مندی سے مرکزی حکومت کو تفویض کر دیں ۔ جس طرح مالگذاری ، لگان

۱۔ انقلاب ۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء

۲۔ ایمان ۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء ۔ بحوالہ منظور الحق صدیقی ''اخبار ایمان میں علامہ اقبال کا ذکر'' اقبال ریویو ۲ : ۲ (جولائی ۱۹۷۹ء) ص ۶۷

اور ملکی ملازمتوں کی تحقیقات کے ایسے کمیشن کا تقرر منظور کیا گیا ہے اسی طرح ملک کی تقسیم جدید کے لیے بھی کمیشن مقرر ہونا چاہیے''۔[۱]

ان کے نزدیک پاکستان، اسلام کی اٹھان کا ایک گوشہ ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''آج تہذیب کا علم سرنگوں ہو چکا ہے ۔ آج سائنس کے کمالات یتیموں کی طرح کھڑے ہیں اور انسانیت کی مصیبت کا ماتم کر رہے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ اسلام ، پھر دنیا کے کسی آزاد گوشہ سے سر اٹھائے اور اہل دنیا کو عدل کی راہ دکھائے ۔ اسلام کی اٹھان کا یہ گوشہ پاکستان ہو گا ۔ آؤ پاکستان سے انسانیت کی تعمیر نو کا علم بلند کریں ۔

آؤ ! حصول پاکستان کے لیے اپنی تمام قوتیں وقف کر دیں ۔ آؤ خون کے آخری قطروں سے پاکستان کے لیے لڑیں''[۲] ۔

قریشی تحریک پاکستان کے ایک مخلص کارکن تھے ۔ ان کا پندرہ روزہ اخبار ''ایمان'' تحریک کا داعی تھا ۔ لیکن اسے حالات کی ستم ظریفی جانئے کہ قیام پاکستان کے بعد عبدالمجید قریشی نہایت بے رحمانہ طور پر قتل کر دئے گئے ۔ ۳ اپریل ۱۹۶۹ء کو اچانک خبر ملی کہ وہ اپنے مکان میں مردہ پائے گئے ۔ ان کا مکان کئی روز سے بند تھا اور وہ خود لاپتہ تھے ۔ ان کے بھائی کو کچھ شک ہوا ، چنانچہ جب پولیس کی نگرانی میں مکان کھلوایا گیا تو باورچی خانے میں قریشی کی نعش ایسی حالت میں پائی گئی کہ غالباً ان کو قتل کئے ہوئے پندرہ روز سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا ۔ ان کے قاتلوں کا سراغ نہ مل سکا ۔

ہفتہ وار ''تنظیم'' اور پندرہ روزہ ''ایمان'' کی ادارت کے علاوہ ان کی یادگار مندرجہ ذیل کتابیں ہیں ۔

۱۔ درس قرآن ۔ پارۂ اول ۔ لاہور : سیرت بک ڈپو (س ۔ ن)

۲۔ درس قرآن ۔ پارۂ دوم ۔ لاہور : سیرت بک ڈپو (س ۔ ن)

۳۔ پیغام قرآن ۔ لاہور : سیرت بک ڈپو (س ۔ ن)

۱۔ عبدالمجید قریشی ۔ مطالعہ پاکستان (لاہور : سیرت بک ڈپو ، [س ۔ ن]) ۹ ؛ ۱۱۹-۱۲۰

۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۰

۴۔ اسلامی خطبات ۔ لاہور : گوشۂ ادب (س ۔ ن)
۵۔ اسوۂ ابراہیم ۔ لاہور : سیرت بک ڈپو (س ۔ ن)
۶۔ اسلام زندہ باد ۔ لاہور : سیرت بک ڈپو (س ۔ ن)[1]
۷۔ انسانیت موت کے دروازہ پر ۔ لاہور : گوشۂ ادب (س ۔ ن)
۸۔ شہید کربلا ۔
۹۔ مطالعۂ پاکستان ۔ لاہور : سیرت بک ڈپو (س ۔ ن)

ایک بار علامہ اقبال نے قرشی صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ ایک کتاب لکھیں جس میں نو مسلموں سے قبول اسلام کی وجوہات معلوم کرکے جمع کی جائیں ۔ ''اس سے انقلاب حیات کی ایک بالکل نئی دنیا مبلغین اسلام کے سامنے آ جائے گی اور انہیں اشاعت اسلام کے لیے ایسے نئے دلائل یا ہتھیار مل جائیں گے کہ ان سے اسلام کا موجودہ کتب خانہ خالی ہے'' علامہ اقبال نے خود اس کتاب کے لیے قبول اسلام کے چار واقعات بیان کئے ۔ قرشی نے اقبال کی تجویز پر وہ کتاب ''اسلام زندہ باد'' کے نام سے تالیف کی اور اقبال کی زبانی وہ چار واقعات اس کتاب میں تحریر کئے ۔ قرشی کی تمہید کے ساتھ انہیں ملاحظہ کیجیے :

''ڈاکٹر محمد اقبال ایک پختہ دماغ عارف تھے ۔ اور حکیم آپ جب بھی کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے تھے ، اُس کے تعلق میں کلیات و تخیلات کا اور اُن کے ساتھ ہی مثالوں اور حوالوں کا ایک مواج دریا آپ کے دماغ سے اُترتا تھا اور زبان سے بہ جاتا تھا ۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو راقم الحروف موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا ، آپ آرام کرسی پر تشریف فرما تھے ، حقہ سامنے رکھا تھا ، رسمی مزاج پرسی ہوئی اور اس کے بعد تبلیغ اسلام کے عنوان پر گفتگو شروع ہو گئی ۔

''آپ ایک کتاب لکھیے'' ۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ۔

''کیسی کتاب'' ؟ میں نے پوچھا

۱۔ عبدالمجید قرشی ۔ اسلام زندہ باد (لاہور : سیرت بک ڈپو ، [س ۔ ن]) ۵ ۔ ۲۲

''تحقیقات کرنے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ ہندوستان کے قصبات اور دیہات میں ہزار ہا غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان از خود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور ان سے قبول اسلام کی وجوہات دریافت کرکے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اس سے تبلیغ اسلام کے مقصد کو بے حد تقویت حاصل ہو گی''۔

''کیا صداقت اسلام کے متعلق پہلے دلائل ناکافی ہیں'' ؟ میں نے پوچھا

بہت کافی ہیں ، مگر ایسا کرنے سے کئی ایسے عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دل اور دماغ کے کام کرنے کے طریقوں میں بہت فرق ہے۔ دماغ اکثر اوقات ہزارہا مضبوط سے مضبوط دلائل کو مسترد کر دیتا ہے اور ان کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا لیکن دل اس کے برخلاف ، بعض اوقات کمزور سے کمزور چیزوں سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ قبول اسلام کا جس قدر تعلق دل سے ہے ، دماغ سے نہیں۔ اصل بات جو مبلغ کو معلوم ہونی چاہئے ، یہ ہے کہ وہ کون کون سے نشتر ہیں جن سے دل متاثر ہوا کرتے ہیں؟ کفار اور مشرکین کے انقلاب حیات کی ہزارہا مثالیں تاریخ اسلام کے پاس موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے حالات کے ماتحت ، ایک خیال یا ایک مذہب پر چٹان کی طرح قائم ہوتا ہے۔ ناگہاں غیب سے اس کے دل پر نشتر چلتا ہے اور چشم زدن میں اُس کی زندگی کی تمام گذشتہ تاریخ بدل جاتی ہے۔ صداقت اسلام کے عقلی دلائل تو آپ کے پاس بہت ہیں ، مگر قلبی دلائل کم ہیں۔ اگر آپ نو مسلموں کے پاس جائیں تو وہ بتائیں گے کہ اسلام کی وہ کون بے ساختہ ادا تھی جو اُن کے دل کو بھا گئی ؟ اگر اُن کے بیانات ایک کتاب میں جمع کر دیئے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ انقلاب حیات کی ایک بالکل نئی دنیا ، مبلغین اسلام کے سامنے آ جائے گی اور انہیں اشاعت اسلام کے لیے ایسے نئے دلائل یا جدید ہتھیار مل جائیں گے کہ اُن سے اسلام کا موجودہ کتب خانہ خالی ہے۔

''ڈاکٹر صاحب ! آپ کو بھی کوئی واقعہ یاد ہے'' ؟ میں نے پوچھا

ڈاکٹر اقبال تھوڑی دیر چپ رہے ، اس کے بعد فرمایا ''میں آپ کی کتاب کے لیے چار نہایت ہی دلچسپ مثالیں پیش کر سکتا ہوں''۔

"آپ کو تکلیف تو ضرور ہو گی مگر اسلام کی خدمت ہو جائے گی ، آپ تکلیف کرکے ضرور ارشاد فرمائیے" میں نے التماس کی

ڈاکٹر صاحب نے بیان کرنا شروع کیا :

(۱)

مشہور انگریز نو مسلم مسٹر داؤد آپسن مرحوم (ایڈیٹر مسلم آوٹ لک لاہور) ایک نہایت زندہ دل آدمی تھے ۔ آپ کی عالمانہ زندگی کی عجیب و غریب خصوصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ آپ کو پلاؤ سے نہایت ہی غیر معمولی محبت تھی ۔ اگر کوئی شخص آپ کو پلاؤ بھیجتا تھا تو آپ برابر کئی کئی ہفتے اس کا شکریہ ادا کرتے رہتے تھے ۔ میں نے ایک دن مرحوم سے سوال کیا ، آپ کے مشرف با سلام ہونے کے اسباب کیا ہیں ؟

مرحوم نے فرمایا ، "میرے مسلمان ہونے کا قصہ نہایت ہی عجیب ہے ۔ اگر میں عرض کروں تو آپ حیران رہ جائیں گے ۔ میرا اسلام کے متعلق کوئی مطالعہ نہیں تھا ، نہ مجھے کسی عالم و فاضل مسلمان کی صحبت میسر آئی تھی کہ مجھ پر اسلام کی خوبیاں منکشف ہوتیں ۔ میں انگلستان سے آیا اور بمبئی میں رہنے لگا ۔ ہندوستان میں میرے سب سے پہلے دوست وہ لوگ تھے جو سیاسی تحریکات میں حصہ لیتے تھے ، بمبئی کے مذہبی حلقوں سے نہ میرا تعارف تھا اور نہ تعلق ۔ جب میں نے ہندوستان کی سیاسی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا تو بعض مقامی مسلمانوں سے بھی میری ملاقات ہوئی اور میں ان کے ہاں آنے جانے لگا ۔ ایک مرتبہ ایک معزز مسلمان نے مجھے کھانے پر بلایا ۔ اسلامی طریق کے مطابق دستر خوان بچھایا گیا ، اس وقت جو چیزیں میرے سامنے لائی گئیں ، ان میں ایک پلاؤ بھی تھا ۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میری زبان اس بہشتی نعمت سے لذت اندوز ہوئی ۔ میں پلاؤ کھا رہا تھا ، مزے لے رہا تھا ، مسحور ہو رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ غور کر رہا تھا" ۔

"آپ کیا غور کر رہے تھے ؟" ڈاکٹر اقبال نے پوچھا ۔

"میں نہیں کہہ سکتا ، میرا غور کیا تھا ، ڈاکٹر صاحب ! میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں ، میں پلاؤ کھا رہا تھا ، مزے لے رہا تھا اور کچھ غور کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ میرے خیالات میں نہایت

سی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو رہی تھی - یکایک مجھے ایک خیال سوجھا ، اس طرح کہ تمام جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی - میں نے محسوس کیا کہ غیب سے ایک نشتر چلا ہے اور میری کایا پلٹ گئی ہے - میں نے خیال کیا کہ جس قوم کا مذاق کھانے کے معاملے میں اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے ، ذہن اور روحانیت کے معاملے میں اس کا معیار کتنا کچھ لطیف اور پاکیزہ ہوگا ؟ یہ کہہ کر مسٹر آپسن نے قہقہہ لگایا اور کہا ، ڈاکٹر صاحب ! مجھے نہ تو آپ کے کسی ملا نے مسلمان کیا ہے اور نہ صوفی نے - میں تو حضرت پلاؤ کے ہاتھ مشرف بہ اسلام ہوا ہوں -

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ، دو چار قہقہوں کے بعد مسٹر داؤد آپسن پھر سنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے ، "میں نے پلاؤ کی رکابی کے سامنے بیٹھ کر مسلمانوں کی خوش مذاقی اور اسلام کی لطافت کا جو اندازہ کیا تھا ، بعد کے مطالعہ اسلام سے وہ بالکل صحیح ثابت ہوا - میں نے دیکھا کہ زندگی کے ہر ایک میدان میں اسلام صرف بلندی اور برتری کا علم بردار ہے ، اسلام کی سلطنت میں کہیں بھی بد مذاقی اور پستی نہیں ہے ، جس قدر اسلام کی عبادت بلند ہے ، اس قدر اسلام کی تہذیب بھی بلند ہے - جس قدر اسلام کے طعام و لباس بلند ہیں ، اسی قدر اسلام کے اعمال و اخلاق کی روایات بھی بلند ہیں - میرے نزدیک کسی شخص کے قبول اسلام کے معنی یہ ہیں کہ وہ ساری دنیا سے اونچا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی زندگی میں جس قدر بھی اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ بھی دنیا بھر کے عملوں سے اونچے ہوتے ہیں -"

اس کے بعد مسٹر داؤد آپسن پھر ہنسے اور پلاؤ کی تعریفیں کرنے لگے ، ہماری گفتگو کا ماحصل یہ تھا :

"پلاؤ زندہ باد" ، ڈاکٹر اقبال نے کہا — "اسلام زندہ باد" ، مسٹر داؤد آپسن نے جواب دیا -

(۲)

ڈاکٹر صاحب ! آپ کا دوسرا واقعہ کیا ہے ؟ میں نے پوچھا -

ڈاکٹر اقبال نے بیان کرنا شروع کیا :

مسٹر داؤد آپسن کے قبول اسلام سے زیادہ عجیب لیڈی ہارنس کا

قبول اسلام ہے ۔ آپ ایک تو مسلم فوجی انگریز کی بیوی تھیں ۔ چند سال کا ذکر ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی ایک مقدمے میں مبتلا ہو گئے اور اسی سلسلے میں میرے پاس آئے ۔ چونکہ الزامات نا درست تھے اس لیے تھوڑی پریشانی کے بعد عدالت نے ان دونوں کو عزت کے ساتھ بری کر دیا ۔ اس کے چند روز بعد لیڈی بارنس میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے لاہور تشریف لائیں ۔ اس وقت میں نے سوال کیا ، لیڈی صاحبہ ! آپ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے اسباب کیا ہیں ؟

''مسلمانوں کے ایمان کی پختگی ، ڈاکٹر صاحب ۔'' لیڈی بارنس نے جواب دیا ۔

''لیڈی صاحبہ ! میں نہیں سمجھا ، اس سے آپ کی کیا مراد ہے ؟'' ڈاکٹر اقبال نے پوچھا ۔

''ڈاکٹر صاحب ! میں نے دیکھا ہے کہ دنیا بھر میں کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جس کا مسلمانوں کی طرح ایمان پختہ ہو ۔ بس ، اسی چیز نے مجھے اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا ہے ۔'' لیڈی بارنس نے اپنا نظریہ پیش کر کے تھوڑا سا تامل فرمایا اور کہا ، ''ڈاکٹر صاحب ! میں ایک ہوٹل کی مالکہ تھی ۔ جہاں ایک دفعہ میجر صاحب کھانے کے لیے آئے تھے ۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں ، تھوڑا عرصہ ہماری گفتگوئیں جاری رہیں اور اس کے بعد میری ان سے شادی ہو گئی ۔

میرے ہوٹل میں ایک ستر سالہ بڈھا مسلمان ملازم تھا ۔ اس بڈھے کا فرزند نہایت ہی خوبصورت نوجوان تھا ۔ پچھلی بیماری میں جب یہ لڑکا چل بسا تو مجھے بے حد صدمہ ہوا ۔ میں بڈھے کے پاس تعزیت کے لیے گئی ، اسے تسلی دی اور دلی رنج و غم کا اظہار کیا ۔ بڈھا نہایت غیر متاثر حالت میں میرے الفاظ سنتا رہا اور جب میں غم کی باتیں ختم کر چکی تو اس نے نہایت شاکرانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا :

میم صاحب ! یہ خدا کی تقدیر ہے ۔ خدا کی امانت تھی ، خدا لے گیا ۔ اس میں غمزدہ ہونے کی کیا بات ہے ؟ تو ہر حال میں خدائے غفور کا شکر ادا کرنا واجب ہے ۔''

لیڈی بارنس اتنا کہہ کر رک گئی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نے کوئی نہایت ہی عجیب معجزہ بیان کیا ہے اور اب وہ زبان حال سے مجھ سے یہ مطالبہ کر رہی تھی کہ میں بھی اس کے ساتھ مل کر حیرت کا اظہار کروں ۔ میں نے کہا ، لیڈی صاحبہ ! پھر ؟

لیڈی نے پھر اپنا قصہ شروع کیا اور کہا ، ڈاکٹر صاحب ! بڈھے کا آسمان کی طرف انگلی اٹھانا ہمیشہ کے لیے میرے دل میں پیوست ہو گیا ۔ میں بار بار اس کے الفاظ پر غور کرتی تھی اور حیران تھی کہ الٰہی ، اس دنیا میں اس قسم کے صابر ، شاکر اور مطمئن دل بھی موجود ہیں ۔ مجھے بڑی کاوش یہ تھی کہ بڈھے نے ایسا پر استقامت دل کیسے پایا ؟ اسی غرض سے میں نے پوچھا ، کیا مرحوم کے اہل و عیال بھی تھے ؟ وہ کہنے لگا "ایک چھوٹا بچہ ہے اور ایک بیوی ہے ۔" بڈھے کے اس جواب نے میری حیرت کو کم کر دیا ۔

میں نے بڈھے کے اطمینان قلب کی یہ تاویل کی کہ چونکہ پوتا موجود ہے ، اس واسطے وہ اس کی زندگی اور محبت کا سہارا ہو گا ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ! میں نے اس تاویل سے اگرچہ اپنے دماغ کو پرچا لیا مگر میرے دل کو اطمینان نہ ہوا اور میں برابر اس پڑتال میں لگی رہی کہ کسی طرح اپنے بڈھے ملازم کے دل کی صحیح کیفیت سمجھوں ۔

واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد یتیم بچے کی ماں بھی چل بسی ۔ اس سے میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی ، بڈھے کی بہو کا غم میری عقل پر چھا گیا ، مگر ٹھیک اسی وقت میری وہ قدیم تڑپ بھی جاگ اٹھی اور میں نے خیال کیا کہ بڈھے کے امتحان کا اصل وقت یہی ہے ۔ میرے دل پر اس کی طویل خدمت گذاریوں کا اثر تھا ۔ اس کے نوجوان فرزند کے انتقال کے بعد اب اس کی بہو کی موت اور اس کے پوتے کی یتیمی نے اس اثر کو اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا ۔ لیکن فطری اور رسمی ہمدردی اور دلسوزی کے علاوہ اصل چیز جو میری دلچسپیوں کا حقیقی مرکز تھی ، یہ تھی کہ میں بڈھے کی کیفیت قلب کا صحیح اندازہ کروں ؟ میں دوسرے دن بڈھے کے گاؤں کو ، جو بالکل قریب ہی تھا ، روانہ ہوئی ۔ اس وقت جذبات و تخیلات کی ایک بے تاب کائنات میرے ہمرکاب تھی ۔ میں ہر ایک قدم پر یہ خیال کرتی تھی کہ اس تازہ مصیبت نے بڈھے کے دل کی حالت کو بدل دیا ہو گا ۔ وہ کبھی اپنی ضعیفی اور زار حال پر غور کرتا ہو گا ، پھر

کبھی اپنے یتیم پوتے کی کم سنی کو دیکھتا ہو گا اور غم میں ڈوب جاتا ہو گا مگر دوسرے ہی قدم پر یہ سوچنے لگتی تھی ، جب اس کا معصوم ، کمسن اور لاوارث پوتا ماں اور باپ کے فراق میں بلبلاتا ہو گا تو وہ کس طریقے سے اس کے اور اپنے دل کا اطمینان کرے گا ؟ وہ اس کے والدین کی قبروں کو کہاں چھپائے گا ؟ وہ اس کے آنسوؤں کی جوابدہی سے کیونکر عہدہ برا ہو گا ؟ وہ اپنی ضعیفی اور اپنے پوتے کے تاریک مستقبل پر کیا پردہ ڈالے گا ؟ ان تمام سوالات نے میرے دل اور دماغ کے لیے جو قطعی فیصلہ مہیا کیا ، یہ تھا کہ بڈھے کا وہ پہلا صبر اور استقامت ختم ہو چکی ہوگی ۔ میں اسی فیصلے کو لے کر بڈھے کے گھر میں داخل ہوئی اور اس کی تازہ مصیبت پر افسوس کا اظہار کیا اور اسے اپنی ہمدردی کا یقین دلایا ۔ بڈھا نہایت ہی امن و سکون سے میری دردمندانہ باتیں سنتا رہا لیکن جب اس کے جواب کی نوبت آئی تو اس نے پھر انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی اور کہا "میم صاحب ! خدا کی تقدیر میں کوئی بشر دم نہیں مار سکتا ۔ اُسی نے دیا تھا اور وہی لے گیا ، ہمیں ہر حال میں اس کا شکر ادا کرنا واجب ہے ۔"

لیڈی بارانس بڈھے کے الفاظ نقل کرنے کے بعد پھر رکی ، گویا کہ وہ مجھ سے ان الفاظ کی داد طلب کر رہی تھی ۔ اس نے تھوڑا تامل کیا ، ایسا تامل جس میں ایک قسم کی محویت ملی ہوئی تھی ۔ لیڈی بانس نے اپنے سلسلہ کلام کو پھر شروع کر دیا اور کہا ، "ڈاکٹر صاحب ! میں جب تک بڈھے کے پاس بیٹھی رہی ، نہ اس کے سینے سے آہ نکلی ، نہ آنکھ سے آنسو گرا اور نہ زبان پر افسوس کا لفظ آیا ۔ وہ اس طرح اطمینان کی باتیں کرتا تھا کہ گویا اس نے اکلوتے بیٹے اور بہو کو زمین میں دفن نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی کا کوئی بڑا فرض ادا کیا ہے ۔ تھوڑا عرصہ بعد میں وہاں سے واپس لوٹی ۔ میں بڈھے کی پختگی ایمان پر بالکل حیرت زدہ تھی ۔ میں باربار غور کرتی تھی اور تھک جاتی تھی مگر مجھ پر یہ معمہ حل نہیں ہوتا تھا کہ اس درجہ مصیبت میں کسی انسان کو یہ استقامت حال کیسے نصیب ہو سکتی ہے ؟

چند روز کے بعد اس کا معصوم پوتا بھی گزر گیا ۔ اس اطلاع کے بعد میں نے اپنی اندازہ شناسی کی تمام قابلیتوں کو نئے سرے سے اپنے دماغ میں جمع کیا تا کہ اس کے حال کا اندازہ کروں ۔ میں بڑی

بے قراری کے عالم میں اس کے پاس گاؤں پہنچی ، مجھے یقین تھا کہ اب لاوارث بڈھا اپنی تمام دنیا کو ختم کر چکا ہو گا - اس کے حواس ، ہوش و حواس سے بیگانہ ہوں گے ، اس کا دل و دماغ مقفل ہو گا اور یاس اس کی امید کے تمام رشتے منقطع کر چکی ہو گی - انہی احساسات کو ساتھ لے کر میں بڈھے کے مکان میں داخل ہوئی اور نہایت ہی دل سوزی سے اس کے مصائب پر غم کا اظہار کیا - لیکن مجھے یہ معلوم کر کے ازبسکہ حیرت ہوئی کہ میرے اظہار افسوس کا اس بڈھے کے دل پر کچھ بھی اثر نہ تھا - وہ بڑی بے تکلفی سے بیٹھا تھا اور نہایت ہی غیر متاثر حالت میں میری گفتگو کو سن رہا تھا - جب میری گفتگو ختم ہو گئی تو بڈھے نے زبان کھولی اور اس نے پہلے کی طرح پھر آسمان کی طرف اپنی انگلی اٹھا دی ، اور کہا میم صاحب ! یہ خدا کی حکمت کے کھیل ہیں ، جو کچھ اس نے دیا تھا ، واپس لے لیا ، اس میں ہمارا کیا تھا ، جس پر ہم اپنے دل کو برا کریں ؟ بندے کو ہر حال میں اپنے پروردگار کا شکر ادا کرنا واجب ہے - ہم مسلمانوں کو یہی حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر صبر کریں"-

اب لیڈی بارنس درد دل کی کیفیتوں سے لبریز تھی ، اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور روتی ہوئی آواز میں کہا ، "ڈاکٹر صاحب ! بڈھے کا یہ جواب میرے لیے قتل کا پیغام تھا ، اس کی انگلی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور نشتر غم بن کر میرے دل کو کرید رہی تھی - اب میں نے اس مرد ضعیف کی پختگی ایمان کے سامنے ہمیشہ کے لیے اپنا سر جھکا دیا اور مجھے یقین حاصل ہو گیا کہ بڈھے کا یہ اطمینان قلب ، مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی ہے - اب میں نے کہا ، اے میرے بوڑھے باپ ! اب تم اکیلے اس گاؤں میں رہ کر کیا کرو گے ؟ میرے ساتھ ہوٹل میں چلو اور آرام سے زندگی بسر کرو - بڈھے نے میری اس دعوت کا شکریہ ادا کیا اور بے تکلف میرے ساتھ ہوٹل میں چلا آیا - یہاں وہ دن بھر ہوٹل کی خدمت کرتا اور رات کو خدا کی یاد میں مصروف ہو جاتا تھا -"

کچھ عرصہ کے بعد اس نے کہا کہ میں آج قبرستان کو جاؤں گا - میرے دل میں پھر وہی امتحان لینے کی لٹک پیدا ہوئی ، دل نے کہا ، یہ دیکھنا چاہیے کہ وہاں اس کے صبر و تحمل پر کیا گزرتی ہے ؟ بڈھا ہوٹل سے نکل کر اس خاموش اور ویران مقام کی طرف آیا جہاں اس کے تینوں

عزیز مدفون تھے - میں ایک طرف کھڑی ہو گئی اور وہ قبرستان پہنچتے ہی پریشان حال قبروں کو درست کرنے میں مصروف ہو گیا - وہ مٹی کھود کھود کر لاتا تھا اور قبروں کو درست کرتا تھا - اس کے بعد وہ پانی لے آیا اور قبروں پر چھڑکاؤ کرنے لگا جب قبریں درست ہو گئیں تو بڈھے نے وضو کیا ، ہاتھ اٹھائے اور اہل قبرستان کے حق میں دعا کی اور واپس چل دیا - میں نے اس تمام عرصے میں نہایت ہی احتیاط سے اس کی تمام حرکات کو دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کے ہر کام میں اطمینان کا نور اور ایمان کی پختگی جلوہ گر ہے - اب میرے دل پر ایک غیبی نشتر چلا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ بڈھے کی خوبی نہیں بلکہ یہ اس دین حق کی خوبی ہے جس کا یہ بڈھا پیرو ہے - میں نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ہوٹل میں پہنچ کر بڈھے سے کہا کہ وہ کوئی ایسی عورت بلا لائے جو مجھے اسلام کی تعلیم دے - بڈھا فی الفور اٹھا اور اپنے ملا کی لڑکی کو بلا لایا - اس نے مجھے خدا اور اس کے رسول پر ایمان لانے کی ترغیب دی اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا سبق سکھایا -

ڈاکٹر صاحب ! اب میں خدا کے فضل و رحمت سے مسلمان ہوں اور وہی عظیم الشان قوت ایمان ، جس سے کہ بڈھے کا دل سیراب تھا ، اپنے سینے میں موجود پاتی ہوں - اب مجھے اپنے خدا پر اس قدر پختہ ایمان ہے کہ خواہ کس قدر بھی مصیبت آئے میرے قدموں کو کبھی لغزش نہیں ہو سکتی -

(۳)

۲۹ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو میں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا - آپ آرام کرسی پر تشریف فرما تھے ، حقہ چل رہا تھا - کل کی ملاقات میں آپ دو نو مسلموں کے واقعات سنا چکے تھے ، آج باقی دو واقعات سنانے کی فرمائش کی گئی تو آپ نے پہلے ایک تمہیدی تقریر ارشاد فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے :

قبول اسلام میں اصل چیز ''دل'' ہے - جب دل ایک تبدیلی پر رضامند ہو جاتا ہے اور کسی بات پر قرار پکڑ لیتا ہے تو پھر باقی تمام جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ اس تبدیلی کی تائید کے لیے وقف ہو جائے -

ہمیں اسلام کے قدیم اور جدید مبلغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے ، قدیم مبلغوں کا وار ، غیر مسلموں کے دلوں پر ہوتا تھا ، وہ اپنی للّہیت ، بے نفسی ، خوش خلقی اور اس احسان و مروت کی جادو اثر اداؤں سے دلوں کو گرویدہ کرتے تھے اور اس طرح ہزار ہا لوگ از خود بغیر کسی بحث و تکرار کے ان کے رنگ میں رنگ جاتے تھے ۔ مگر جدید مبلغوں کا سارا زور ، دماغ کی تبدیلی پر صرف ہوتا ہے ، وہ صداقت اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں ، مقابلے میں دوسری حجت غیر مسلم پیش کر دیتے ہیں ، اس پر بحث و تکرار شروع ہو جاتی ہے ، مسلمان اپنی بات پر اڑ جاتا ہے ، غیر مسلم اپنے قول پر تن جاتا ہے ۔ اس سے ضد پیدا ہوتی ہے اور ہدایت ختم ہو جاتی ہے ۔

مبلغین اسلام کو دلوں کے متاثر کرنے کے لیے نکلنا چاہیے یا دماغوں کے ؟ اس کے فیصلے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم فطرت کی روش کی پیروی کریں ۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ فطرت ، اپنی فتوحات حاصل کرنے کے لیے اپنا تعلق ہمیشہ دلوں سے جوڑتی ہے ۔ فطرت کھانے میں لذت پیدا کرتی ہے اور آپ اسے بے اختیار کھا جاتے ہیں ، اس وقت ایک بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا ، کیا یہ کھانا طبی لحاظ سے مفید ہو گا ؟ آپ ایک ضروری کام پر جا رہے ہوتے ہیں کہ ناگہاں پھولوں کی ایک خوشنما زمین اور لب جو کا ایک حسین نظارہ سامنے آ جاتا ہے ، آپ وہاں بے اختیار بیٹھ جاتے ہیں ، وہیں ٹھنڈی ہوا کا ایک دلنواز جھونکا آتا ہے اور آپ کو میٹھی نیند سلا دیتا ہے ۔ اس وقت کوئی شخص بھی دماغ سے یہ نہیں پوچھتا ، مجھے سونا چاہیے یا نہیں ؟ مختصر یہ کہ فطرت ہر کام میں اسی طرح دلوں کو گرویدہ کر کے اپنا مطلب نکالتی ہے ، وہ دماغوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتی ۔ اسلام چونکہ سر بسر نور بصیرت ہے اس واسطے مبلغین اسلام کو چاہیے کہ اخلاق و محبت کی گہرائیوں سے دلوں کو اس طرح شکار کریں کہ ان میں سرکشی اور انکار کی سکت ہی باقی نہ رہے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ مبلغ اسلام ، اسلامی کیریکٹر کی عظمت کے مالک ہوں تاکہ سرکش سے سرکش آدمی بھی ان کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں ۔ باقی رہے دماغی مباحث اور عقلی تکرار تو اس سے نہ تو دل مطمئن ہو سکتے ہیں نہ منقلب ہو سکتے ہیں اور نہ فطرت رام ہو سکتی ہے ۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ، اب یہ دیکھیئے کہ دل کی دنیا میں کیسی دلیلوں پر عمل کیا جاتا ہے ؟ یہ چند ہی سال کا ذکر ہے کہ یہاں ایک ہندو جج کا انتقال ہو گیا ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یکایک یہ خبر مشہور ہوئی کہ ان کی بیوہ مشرف بہ اسلام ہو رہی ہے ۔ یہاں کے ہندوؤں کو قدرتی طور پر اس واقعہ سے تکلیف ہوئی ۔ عورت کے عزیز و اقارب جمع ہو گئے اور اسے سمجھانے لگے ۔ سب نے مل کر زور ڈالا کہ وہ مسلمان ہونے کے خیال سے دستبردار ہو جائے ۔ لیکن اس تمام دباؤ کے باوجود عورت کے ارادے میں ذرا بھی تزلزل نہ آیا ۔

عزیزوں کی ناکامی کے بعد دوسرا قدم جو اٹھایا گیا ، یہ تھا کہ ہندو دھرم کے مذہبی پنڈت اور پیشوا بلائے گئے ۔ انہوں نے کتھائیں سنائیں ، تاریخی حوالے دئے ، مذہبی احکام بتائے ، ہندو دھرم کی سچائی کی دلیلیں پیش کیں ۔ تعلم و تعلیم کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا مگر عورت پر ذرا بھی اثر نہ ہوا ، اس نے تمام مذہبی احکام سن لیے اور آخر میں صرف یہ کہہ دیا کہ میں ضرور مسلمان ہوں گی ۔

اب آریہ سماج کے مبلغ بلائے گئے ، انہوں نے مخالفت کا دفتر کھولا ، مسلمانوں کے مظالم پیش کیے ، اسلامی احکام کی تردید کی ، مسلمانوں سے نفرت دلائی ، اورنگ زیب اور محمود غزنوی کا ذکر چھیڑا ، گئو کے نام پر اپیل کی ، یہ سلسلہ بھی کئی دن تک جاری رہا مگر عورت اب بھی اپنے ارادے پر محکم تھی ۔

تیسرا قدم یہ تھا کہ عورت کو ڈرایا ، زد و کوب اور قتل کی دھمکی دی گئی ، خوف کے ساتھ طمع کے مناظر بھی سامنے لائے گئے ۔ مگر عورت اب بھی متاثر نہ ہوئی ۔

اب سوال و جواب شروع ہوئے ، عورت سے پوچھا گیا ، ”تم کیوں مسلمان ہونا چاہتی ہو ؟ کیا تمہیں مال و دولت کی خواہش ہے ؟

عورت نے کہا ، تم دیکھ رہے ہو ، میرے گھر میں کسی بھی چیز کی کمی ہے ؟

پھر پوچھا گیا ، ”تمہیں کیا کوئی نفسانی خواہش ہے ؟“

”تم میری عمر کو دیکھ رہے ہو ، میں تو اب چند دن کی مہمان ہوں ۔“ عورت نے جواب دیا ۔

پھر پوچھا گیا ، کیا کسی مسلمان مولوی یا مبلغ نے تمہیں بہکایا ہے ؟''

''میں زندگی بھر کسی مسلمان مولوی سے نہیں ملی ۔'' عورت نے جواب دیا ۔

''پھر کوئی اسلامی کتاب پڑھی ہو گی ۔'' رشتہ داروں نے پوچھا ۔

''میں نے کوئی اسلامی کتاب دیکھی بھی نہیں ۔'' عورت نے کہا ۔

اب لوگ متعجب ہوئے اور انہوں نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا ، تو پھر تم کیوں مسلمان ہوتی ہو ؟''

عورت نے کہا ''میرے پتی سالہا سال تک سب جج رہے ، وہ بیسیوں شہروں میں گئے اور میں بھی ان کے ساتھ تھی ، جس جگہ میں گئی ، ہمیشہ اعلی خاندان کی ہندو عورتوں کے ساتھ ہمارا تعلق رہا ۔ مسلمان عورتیں بھی کبھی ہمارے گھر میں آتی تھیں مگر یہ سب خدمتگار ہوتی تھیں ۔ کبھی اصطبل کے بہشتی کی بیوی ہمارے ہاں آ جاتی ، کبھی دھوبن کی لڑکیاں آ جاتیں ، کبھی کسی مسلمان پسنہاری کو ہم خود بلا لیتے تھے ۔ بس ، اس سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ہے ۔''

سامعین میں ذرا امید پیدا ہوئی اور انہوں نے کہا ، ''پھر تو کوئی وجہ نہیں کہ تم مسلمان ہو جاؤ'' ۔ عورت نے بیان کیا ، بے شک جن مسلمان عورتوں سے میں ملی ، وہ اکثر غریب محتاج اور میلی تھیں ۔ متمول گھرانے کی مسلمان عورتوں سے ملنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا مگر ہندو عورتیں جن کے ساتھ رات اور دن میری نشست برخواست تھی ، سب امیر ، متمول اور روشن خیال تھیں ۔ اس تفاوت کے باوجود میں نے ہر جگہ ہندو اور مسلمان عورتوں میں ایک واضع فرق دیکھا ہے ۔''

اس آخری جملے پر تمام سننے والوں کے دل دھڑکنے لگے ، سب کی نگاہیں بے اختیار عورت کی طرف جھک گئیں ۔ ہر شخص حیرت و اضطراب کی تصویر بن گیا اور دوسرے جملے کا انتظار کرنے لگا ۔ عورت نے اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا ، ''فرق یہ کہ میں جس قدر بھی ہندو عورتوں سے ملی ہوں ، ان کے جسموں سے مجھے ایک قسم کی

و ضرور آئی ، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی میں نے ہر جگہ دیکھا کہ غریب سے غریب مسلمان عورتوں کے جسم میں بھی یہ بو موجود نہ تھی ۔ میں اپنے پتی کی زندگی سے لے کر اب تک اس تفاوت پر غور کرتی رہی ہوں ، لیکن سبب معلوم نہیں کر سکی ۔ اب چند روز ہوئے ، میں نے اس راز کو معلوم کر لیا ہے ۔ میں نے معلوم کر لیا ہے کہ مسلمان چونکہ خدا پرست اور ایماندار ہیں اور ان کی روح پاک ہے، اس واسطے ان کے جسموں سے بُو نہیں آتی ۔ وہ صاف کپڑے پہنیں یا نا صاف ، ان کے جسم ضرور بو سے پاک ہوتے ہیں ۔ لیکن اس کے برخلاف ہندو چونکہ مشرک ہیں اور ان روح پاک نہیں ہے اس واسطے خواہ وہ کس قدر بھی صاف اور پُر تکلف لباس پہنیں ، ان کے جسم بُو سے پاک نہیں ہوتے ۔ اس اعلان کے بعد عورت کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ، اس کے چہرے پر جوش ایمان کی سرخیاں دوڑنے لگیں اور اس نے بھرائی آواز میں اپنے رشتہ داروں کو متنبہ کیا ، ''مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو ، میں اسلامی توحید کے نور سے اپنی روح کو پاک کرنا چاہتی ہوں اس واسطے میں ضرور مسلمان ہوں گی ۔'' اسی وقت عورت نے اپنے غضبناک رشتہ داروں کے سامنے کلمہ پڑھا ۔ وہ عورت کے بیان پر بہت سٹپٹائے مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے ۔ عورت اپنے اصرار پر قائم رہی اور بالآخر مسلمان ہو گئی ۔

(۴)

''ڈاکٹر صاحب ! اب چوتھی کہانی ؟'' میں نے کہا

پہلے تمہید سن لیجیے ۔'' ڈاکٹر اقبال نے فرمایا

شاید بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب تبلیغ دین نہیں فرماتے ، ایسا سمجھنا مذہب عشق میں داخل خطا کاری ہے ۔ رسول اللہ کی کوئی قوت ایسی نہ تھی جسے وقتی یا زمانی سمجھا جائے ۔ حضورؐ قیامت تک کے لیے پیشوائے انسانیت ہیں ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کی ہر قوت قیامت تک کار فرما رہے گی ۔ حضورؐ کا جلال بھی قیامت تک کار فرمائی کرے گا اور جمال بھی ۔ آپ قیامت تک کے مجاہد ہیں ، قیامت تک کے مبلغ ہیں ، قیامت تک کے مصلح ہیں اور قیامت تک کے رحمۃ للعالمین ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بہت دور تک

حضور ؐ کی شخصیت مبارک موجود ہو نہ ہو ، حضور ؐ کا روحانی فیض آپ کے وجود باجود ہی کی طرح زندگی کے ہر میدان میں کار فرما رہتا ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری روحانیت اس قدر لطیف نہیں ہے کہ اپنے زندہ رسول کے زندگی بخش فیوض کے عمل و دخل کو محسوس کر سکیں ۔ اگر کوئی اندھا سورج کو محسوس نہیں کرتا تو اس سے سورج کی عدم موجودگی ثابت نہیں ہو سکتی ۔

سوال صرف روحانی مناسبت کا ہے ۔ جہاں کوئی روح مناسب قابلیت حاصل کر لیتی ہے ، اس پر اسی وقت بلا تاخیر رسول ؐ اللہ کے روحانی فیض کا آفتاب طلوع ہو جاتا ہے اور اس وقت وہ محسوس کر لیتا ہے کہ رسول ؐ اللہ زندہ ہیں ۔ سرکار دو عالم ؐ بنفس نفیس جہاد کر رہے ہیں ، تبلیغ بھی فرما رہے ہیں، اور بھولے ہوؤں کو راستے بھی بتا رہے ہیں اور گرتے ہوئے گنہ گاروں کو تھام بھی رہے ہیں ۔

اب آپ رسول ؐ اللہ کے فیض روحانی کی کار فرمائی کو واقعاتی رنگ میں دیکھیں ۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ، کچھ عرصہ ہوا ، ایک دولت مند ، تعلیم یافتہ ، روشن خیال اور کاروباری ہندو ، مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے پاس آیا ۔ اس نے مولانا سے درخواست کی ، ''آپ ایک الگ کمرے میں آ جائیں'' ۔ مولانا اس کی درخواست کے مطابق تنہا کمرے میں چلے آئے اور فرمایا ، ''کیا ارشاد ہے ؟'' نو وارد نے کہا ، ''مولانا ! مجھے مسلمان بنائیے'' ۔ مولانا نے اسلام کی تلقین کی ۔ خدا کی وحدت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار لیا اور پوچھا کہ آپ اس طرح تنہائی میں کیوں داخل اسلام ہوتے ہیں ؟

نو وارد نے بیان کیا ، میں نے کوئی اسلامی کتاب نہیں پڑھی ، کسی مسلمان عالم سے اسلام کو نہیں سمجھا لیکن خوش قسمتی سے کئی مرتبہ مجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی ہے ، اب میں حضور ؐ کی محبت میں بے تاب ہوں اور اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوں ۔

مولانا نے پوچھا ، پھر آپ فیروز پور سے چل کر لاہور کیوں آئے اور کھلے بندوں کیوں اسلام قبول نہ کیا ؟ نو وارد نے اس سوال کے جواب میں اپنی تعلیم ، ملازمت ، کاروبار اور جائیداد وغیرہ کے حالات مولانا کے

سامنے بیان کیے اور کہا، ''ان حالات کی بنا پر میں اعلان کرنے سے مجبور ہوں لیکن میں آپ کو اپنے اسلام پر گواہ بنانے آیا ہوں۔ میں اللہ کی وحدت اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتا ہوں۔ آپ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں میرے ایمان کی شہادت دیجئے۔ میری یہ عرصے سے آرزو تھی کہ میں اس دنیا میں کسی نیک مسلمان کو اپنے ایمان کا گواہ بنا لوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج میری یہ آرزو پوری ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، ان چار واقعات سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خداوند پاک کیسے کیسے نامعلوم دروازوں سے خلق خدا کو اسلام کی طرف کھینچ رہا ہے۔ یہ چند واقعات مجھے معلوم تھے۔ ملک کے ہر حصے میں اسی قسم کے صدہا واقعات روز مرہ پیش آرہے ہیں۔ ایسے تمام واقعات کو ایک کتاب میں جمع کر دیا جائے تو اس سے اشاعت اسلام کے کام کو بے حد تقویت حاصل ہو سکتی ہے۔

چہار رسائل شیخ الاشراق

(اردو ترجمہ)

مترجمہ

کمال محمد حبیب و ارشاد احمد

پیش نظر کتاب شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول کے چار فارسی رسائل کے ترجموں پر مشتمل ہے - یہ فارسی رسائل اس وجہ سے اہم ہیں کہ اردو میں ان پر ابھی تک کام نہیں ہوا ہے - شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول (شیخ الاشراق) نے تمثیلی انداز میں جا بجا تصوف کی اہمیت کی جانب اشارے کیے ہیں اور اس امر کی بھی بالصراحت نشان دہی کی ہے کہ تصوف ہر ایک کے بس کا روگ نہیں -

ترجمے میں کوشش کی گئی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے تجزیے کی روشنی میں اُن کے فلسفہ کے خد و خال واضح کیے جائیں -

صفحات : ۱۲۹ قیمت : ۲۵ روپے

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ ، لاہور

تبصرۂ کتب

کتاب : پروفیسر مولوی حاکم علی (مرحوم)
سابق پرنسپل ، اسلامیہ کالج ، لاہور ۔
مؤلف : محمد صدیق
صفحات : ۱۷۲ ، قیمت : بیس روپے
مبصر : مختار جاوید
ملنے کا پتہ : مکتبۂ رضویہ، ۴۲/۲ سوڈھیوال کالونی ملتان روڈ ، لاہور - ۲۵

پروفیسر مولوی حاکم علی (متوفی ۱۹۲۵ء) کا شمار اُس دور کے جید ترین علماء و فضلاء میں ہوتا تھا ۔ وہ علوم قدیمہ ہی کے نہیں ، علوم جدیدہ — بالخصوص ریاضی ، شماریات ، سائنس اور منطق کے مایۂ ناز عالم تھے

مولوی حاکم علی ، علامہ اقبالؒ کے ہم عصر اور ہم مشرب ہی نہیں ، اکثر ملی معاملات میں دم‌ساز و رفیق کار رہے ہیں ۔ دونوں ایک محلے میں رہے ، دونوں اسلامیہ کالج سے متعلق رہے ۔ کچھ عرصے تک رفیق تدریس بھی رہے ۔ دونوں انجمن حمایت اسلام کے رکن بھی رہے ۔ ان کے درمیان راہ و رسم کے معتبر ترین راوی علامہ کے گھریلو ملازم علی بخش مرحوم ہیں جو علامہ سے پہلے مولوی حاکم علی کے ہاں ملازم تھے ۔ اندرون بھاٹی دروازہ ، بازار حکیماں کی علامہ اقبال کی رہائش گاہ ، ایک طویل عرصے تک مولوی حاکم علی کا مسکن رہی ۔

محمد صدیق صاحب (شعبۂ آردو ، اسلامیہ کالج ، سول لائنز ، نے زیر نظر کتاب مرتب کرکے اس شخصیت کو نئی نسل سے روشناس کرانے کا فریضہ انجام دیا ۔

یہ کتاب پروفیسر مولوی حاکم علی کی ذات کو ہی نہیں ، اس پورے عہد کو قاری کے سامنے لاتی ہے جو تحریک آزادی کا پر آشوب اور کٹھن دور تھا ۔ مؤرخین ، محققین اور خاص طور سے اقبالیات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک مآخذ کا کام دے گی ۔

کتاب : اقبال—فن اور فکر IQBAL : MIND AND ART
مبصر : حسن اختر

زیرِ تبصرہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور اس کا ترجمہ ڈاکٹر معروف نے کیا ہے شروع میں ڈاکٹر معروف کا دیباچہ ہے ۔ دیباچے کے بعد اقبال پر چھ مضامین شامل کتاب ہیں جن کے نام ذیل میں دیئے جاتے ہیں :

۱۔ اقبال کی تاریخ پیدائش ۔
۲۔ اقبال کی شاعری کا ہندوستانی پس منظر ۔
۳۔ اقبال کی شاعری اور فلسفہ ۔
۴۔ اقبال ، شوپن ہاور اور قرآن ۔
۵۔ اقبال ، شاعر اور سیاست دان ۔
۶۔ اقبال ، اسلام اور زمانۂ جدید ۔

اس کے بعد کتاب میں چار ضمیمے ہیں ۔ پہلے ضمیمے میں فرمودات اقبال ہیں ۔ دوسرے میں ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر کے نام جگن ناتھ آزاد کے تین خط ہیں ۔ تیسرے ضمیمے میں اقبال سنگھ اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی اقبال کے بارے میں کتابوں پر تبصرے ہیں اور چوتھے ضمیمے میں آنند نرائن ملا کے لالۂ طور کے انگریزی ترجمہ کا تعارف ہے ۔

جگن ناتھ آزاد نے ان مضامین میں اقبال کو بہ حیثیت شاعر ، بہ حیثیت فلسفی اور بہ حیثیت سیاستدان کے تنقید کے ترازو میں تولا ہے مگر انہوں نے ان سب میں سے ان کی شاعری کو زیادہ اہمیت دی ہے کیونکہ اکثر لوگوں نے ان کے اس پہلو کو خاص توجہ کا مرکز نہیں بنایا ۔ انہوں نے اس سلسلے میں اقبال کی شاعری پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دیا ہے ۔

اس کتاب میں جگن ناتھ آزاد کا ایک مضمون علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش سے بھی بحث کرتا ہے ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے نہایت قابلیت سے مختلف نظریوں کا جائزہ لیا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علامہ اقبال ۹ ۔ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے تھے ۔

اقبال—فن اور فکر ، علامہ اقبال کے بارے میں انگریزی زبان میں بے حد مفید کتاب ہے اور ہمیں علامہ کے بارے میں غور و فکر پر مجبور کرتی ہے ۔ اس کے مطالعہ سے ہم علامہ اقبال کو پہلے سے بہتر انداز میں سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں ۔

کتاب : نقش اقبال

مصنف : پروفیسر اسلوب احمد انصاری

ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، نئی دہلی (بھارت)

ضخامت : ۱۹۲ صفحات

قیمت : ۲۱ روپے

مبصر : رفیع الدین ہاشمی

''نقش اقبال'' پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے گیارہ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے ، انہیں سپرد قلم کرنے کا محرک یہ جذبہ تھا کہ اقبال کے کلام کی ایک معروضی ، متوازن اور منصفانہ تعبیر و تفسیر حق شناسوں کے سامنے پیش کرنے کی سعی کی جائے'' ۔ کچھ شبہ نہیں کہ اس سعی میں وہ کامیاب رہے ہیں ۔ ان کے نزدیک اقبال فہمی ، حق شناسی ہی کا دوسرا روپ ہے ۔

''اقبال کا تصور فقر'' ، ''اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر'' ، ''غالب اور اقبال'' ، ''مسجد قرطبہ'' اور ''ذوق و شوق'' کے تجزیاتی مطالعے اور ''کلام اقبال میں سیاسی شعور'' تنقید اقبال کے پرانے موضوعات ہیں ، تاہم مصنف نے روایتی باتوں سے گریز کیا ہے ۔

اسلوب احمد انصاری انگریزی ادبیات کے استاد ہیں ، ان کا اسلوب نقد اردو کی مروجہ تنقید سے خاصا مختلف ، بلکہ منفرد ہے ۔ بعض تصررات لفظیات کی تشریح مزید کے لیے ان کے ہاں انگریزی مترادفات کا خصوصی اہتمام ملتا ہے ۔ بلا شبہ اس سے توضیح مفہوم میں مدد ملتی ہے ، لیکن کئی بار یہ بلا ضرورت محسوس ہوتے ہیں اور کہیں ان کی کثرت کھٹکتی ہے — بہر حال اہم بات تو یہ ہے کہ مغربی ادب کے شناور ہونے کے باوجود ، اقبال کے بعض دیگر ناقدوں کے برعکس انہوں نے اقبال کو سمجھنے میں بڑی بصیرت اور توازن کا ثبوت دیا ہے ۔

''نقش اقبال'' کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں کہ مطالعۂ اقبال کی دوسری صدی کا آغاز حوصلہ افزا کیا ہے ۔

کتاب : اقبال آشنائی

مصنف : ڈاکٹر حاتم رام پوری

ناشر : امجدی پبلی کیشن معرفت ڈاکٹر حاتم رام پوری
اسلام پور ، قلم باغ روڈ ، مظفر پور ، بہار (بھارت)

ضخامت : ۲۰۸ + ۲ صفحات

قیمت : ۳۰ روپے

مبصر : رفیع الدین ہاشمی

زیر نظر کتاب ڈاکٹر حاتم (لیکچرر شعبۂ اُردو ، بہار یونیورسٹی ، مظفر پور) کے سات تنقیدی و تجزیاتی مقالات کا مجموعہ ہے۔

''اقبال اور گوئٹے'' اور ''نطشے کا فوق البشر اور اقبال کا مرد مومن'' اس مجموعے کے اہم مضامین ہیں ۔ ڈاکٹر حاتم کے مطابق فاؤسٹ کا کردار اپنے عہد کے ضمیر کی تجسیم ہے یعنی وہ حقیقی زندگی کا مظہر ہے ، اس کے برعکس مرد مومن ایک جہان تازہ کے نئے امکانات اور حیات کی تمام امکانی گزر گاہوں کا مسافر ہے ، اس اعتبار سے مرد مومن کی زندگی کا آغاز فاؤسٹ کے سفر کے اختتام سے ہوتا ہے—اسی طرح نطشے سے فوق البشر کے کمالات کی جو آخری حد ہے ، وہی مرد مومن کا نکتۂ آغاز ہے ۔

بحیثیت مجموعی ڈاکٹر حاتم رام پوری کا یہ مجموعہ خاصے کی چیز ہے ہندوستان کے علمی و ادبی مراکز سے ہٹ کر مظفر پور جیسے دور افتادہ علاقے میں ہوتے ہوئے مطالعۂ اقبال کی یہ پر خلوص کوشش لائق داد ہے ۔ ''اقبال آشنائی'' میں مصنف نے اقبال کے بعض اہم تصورات کی تفہیم و تعبیر میں خاص دقت نظر کے ساتھ کاوش کی ہے ۔ یہ کتاب مصنف کی راست فکری اور ساتھ ہی اقبال سے ان کی جذباتی دلچسپی کی دلیل ہے ۔